مصوّر

باغ و بہار

از

میر امن

مرتبہ

سلیم اختر

اعجاز پبلشنگ ہاؤس

۲۰۶۰۔ کوچہ چیلان، دریاگنج، نئی دھلی ۱۱۰۰۰۲

College of Fort William

فورٹ ولیم کالج کی مہر

تقسیم کار

ایجوکیشنل بک ہاؤس

مسلم یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

باغ و بہار

مُصَوَّر

از

میر امن

مقدمہ

سلیم اختر

اعجاز پبلشنگ ہاؤس
۲۰۶۰۔ ناہر خاں اسٹریٹ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بار اوّل _____ ۱۹۹۲ء

تعداد _____ ۵۰۰

مطبوعہ _____

قیمت _____ 30 روپے

ISBN : 81 - 85949 - 71 - 9

ناشر

اعجاز پبلشنگ ہاؤس

۲۰۶۰۔ کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دھلی ۱۱۰۰۰۲

ترتیب

پیش لفظ

مقدمہ

اُردو نثر کا ظہور ۔ ایک تہذیبی وقوعہ ۔ فورٹ ولیم کالج کا قیام ۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ
حالات میر امن دلّی والے کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

باغ و بہار۔ تحقیق کی روشنی میں

باغ و بہار کی تحقیقات کا پس منظر ۔ باغ و بہار اور امیر خسرو۔ نوطرزِ مرصّع
ایک اور نو طرزِ مرصّع ۔ ۔ ۔ باغ و بہار کے ماخذات ۔ ۔ ۔
باغ و بہار کی مقبولیت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ باغ و بہار کا سنہ اشاعت
ڈنکن فوربس اور باغ و بہار۔

باغ و بہار۔ تنقید کے آئینہ میں

باغ و بہار کا تکنیکی مطالعہ۔ باغ و بہار کے وردلیش ۔ باغ و بہار کی
شہزادیاں ۔ باغ و بہار اور لطفِ زبان ۔

باغ و بہار

	صفحہ نمبر
عرضی میرامن دلّی والے کی	٦٥
سبب تالیفِ کتاب	٦٧
شروع قصّے کا	٧٥
سیر پہلے درویش کی	٨٣
سیر دوسرے درویش کی	١١٣
سیر تیسرے درویش کی	١٨٩
سیر چوتھے درویش کی	٢٠٥
قصّے کے اختتام میں	٢١٩
خاتمہ کتاب میں	٢٢٥
فرہنگ	٢٣٠
کتابیات	٢٢٧
ضمیمہ ا	٢٣٦

پیش لفظ

باغ و بہار، مقبول ترین باغ و بہار!

میر امن نے اُردو نثر کو ایک نیا آہنگ دیا، دِلّی کے ٹھیٹھ محاورے میں اپنی جدّتِ طبع اور خوش مذاقی سے جو گُل بُوٹے کھلائے ان کی مہک برقرار ہے، اسی لئے اپنے وقت کی نزاعی داستان آج کی کلاسیک ہے!

اس کی مقبولیت کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ اُردو کے علاوہ یورپ میں بھی اس کی طباعت ہوتی رہی۔ یہی نہیں بلکہ طویل عرصہ سے محققین اور ناقدین محدب شیشہ میں سے اس کا مطالعہ کر رہے ہیں، خود پاکستان میں، تصحیحِ متن کے علاوہ معروف ناقدین نے اس پر فاضلانہ مقالات سپردِ قلم کئے ہیں۔ کیا اس سے یہ نکتہ روشن نہیں ہوتا کہ آج بھی جدید ذہن کا قاری چار درویشوں کی سیر سے لطف اندوزی کی صلاحیت رکھتا ہے۔

باغ و بہار کا زیرِ نظر ایڈیشن کسی طرح کے دعویٰ یا تعلّی کے بغیر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں صرف یہی گذارش ہے کہ تمام قابلِ حصول تحقیقی مواد سے استفادہ کرتے ہوئے مقدمہ میں باغ و بہار کے تحقیقی مباحث اپ ٹو ڈیٹ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ بطور ایک ماخذ، نوطرزِ مرصّع کی اہمیت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے سو اس کے بارے میں بعض نئی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

ڈنکن فوربس لندن سے بطورِ خاص باغ و بہار کی اشاعت کا اہتمام کرتا رہا۔ اس کے کام کی اہمیت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُردو میں بیشتر مطبوعہ نسخے اسی کے مرتبہ نسخوں پر استوار ہیں لندن سے چوتھی اشاعت (۱۸۴۹ء) باغ و بہار کی تاریخ میں ایک خاص مقام رکھتی ہے کہ اس کے دیباچہ سے بعض اہم معلومات سامنے آتی ہیں۔ مثلاً مخربُ الاخلاق سمجھتے ہوئے اس کے بعض حصّے حذف کر دیئے گئے تھے۔ چنانچہ تحقیقی اہمیت کے پیشِ نظر اس کا انگریزی دیباچہ معہ اُردو ترجمہ شاملِ کتاب ہے۔

باغ و بہار کا زیرِ نظر نسخہ ڈنکن فوربس کے مرتبہ اسی نسخہ پر مبنی ہے لیکن جیسا کہ دیباچہ سے عیاں ہے کچھ حصوں کو مخربُ الاخلاق سمجھتے ہوئے حذف کر دیا گیا تھا۔ ان حذف شدہ عبارات کی تکمیل کے لئے باغ و بہار کے اس نسخہ سے جو بطورِ خاص ہماری لئے جو مرزا امداد علی بیگ سپرنٹنڈنٹ

"لیتھو گرافک اخبار آفس" میں طبع ہوا۔ اس کے سرورق پر یہ تحریر ہے!

"منقول از نسخہ جو کپتان وڈ صاحب کے چھاپہ خانہ میں چھپا تھا۔"

اس کی تاریخ اشاعت ۲ نومبر ۱۸۳۸ء (۱۰ شعبان المعظم ۱۲۵۴ ہجری) ہے۔ اس نسخہ میں املا اور کتابت کا قدیم انداز روا رکھا گیا ہے مثلاً گ کو ک، ٹ کو ت سے لکھتے ہیں۔ آ نہیں ہے چنانچہ آغاز کو اغاز لکھا ہے اسی طرح جاؤں کو جاأوں اور دکھی کو دوکھی لکھا گیا ہے۔

ان چند مثالوں سے اس نسخہ کی عبارت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ زیر نظر نسخہ میں املا کا جدید انداز اپنایا گیا ہے۔ اس ضمن میں جن مقامات پر اشتباہ ہوا وہاں مولوی عبدالحق کے مرتبہ "باغ و بہار" سے بھی امداد لی گئی ہے۔

باغ و بہار پر تنقید کی عمر خاصی طویل ہے۔ اُردو کے بیشتر معروف اہلِ قلم نے اس کی چھان پھٹک کی ہے۔ اس ضمن میں کیونکہ مقبول ناقدین کی آرا پر انحصار کا رجحان قوی تر رہا ہے۔ اس لئے بعض اوقات تکرار و توارد کا احساس ہوتا ہے۔ ادب کے مطالعہ اور فن پاروں کی پرکھ کے لئے میرا اپنا ایک مخصوص اندازِ نظر ہے اس لئے بزرگ ناقدین کے خوبصورت اقتباسات جمع کرنے کے برعکس باغ و بہار کی تنقید میں اپنی سوجھ سے کام لیا ہے۔ میرے نتائج سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن اتنا یقینی ہے کہ زاویۂ نگاہ کی تبدیلی کے باعث باغ و بہار کی کردارنگاری کے ضمن میں بالخصوص اور تکنیک اور اسلوب کے ضمن میں بالعموم کچھ نئی باتیں کہنے کی بھی گنجائش نکل آتی۔

کتاب کے آخر میں ادب کے طلبا کی سہولت کے لئے مولوی عبدالحق کی مرتبہ فرہنگ دی گئی ہے۔ اسی طرح باغ و بہار پر مزید کام کرنے والوں کی سہولت کے لئے باغ و بہار کے معروف ایڈیشنوں کے علاوہ منتخب کتابیات بھی شامل ہے۔

سلیم اختر

سلیم اختر

مقدمہ

دنیا کی اکثر زبانوں کی مانند اُردو میں بھی ادب کا آغاز شاعری سے ہوتا ہے مگر دیگر زبانوں کی مانند شاعری کا یہ آغاز کچھ "خودرد" قسم کا نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بادشاہوں کے لحاظ سے تو ہندوستان خود مختار رہا لیکن حکمرانوں کی زبان چونکہ فارسی تھی اس لئے ادب، ثقافت اور علوم کے لحاظ سے ہندوستان ایران کے زیر سایہ پروان چڑھتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب منازلِ ارتقاء طے کرتے ہوئے اُردو بولی کے درجہ سے بلند ہوکر زبان کے منصب پر فائز ہوئی تو فارسی دبان میں اعلیٰ ادب پاروں کی صورت میں ہندی شعرأ کے سامنے ایک بیش بہا ذخیرہ موجود تھا۔ گو اس وقت اُردو ہر نوع کے مضامین، بلند تخیلات اور نازک تصورات کی بطریق احسن ادائیگی پر قادر نہ تھی لیکن اس سے کچھ فرق نہ پڑا، اس لئے کہ اُردو شعرأ کے سامنے اظہار کے لئے فارسی سانچے موجود تھے۔ سوچ اپنی تھی، زبان بھی اپنی ہی تھی لیکن تشبیہات، استعارات اور تلمیحات وغیرہ کی صورت میں مقامی شعرأ نے فارسی اسلوب اپنا لیا۔ دکھنی شعرأ کے ہاں تو پھر بھی کسی حد تک اپنی دھرتی کی بو باس مل جاتی ہے لیکن بعد کے شعرأ تو ہندوستان کے جغرافیہ سے ہی ناآشنا نظر آتے ہیں۔

یہ نکتہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اُردو نثر بھی فارسی کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی۔ شعری اور نثری ادب کے تقاضے جداگانہ تو ہوتے ہیں لیکن متناقض نہیں! بلکہ آغاز میں تو دونوں کے دھارے پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں چنانچہ مقفیٰ اور مسجع نثر کی صورت میں تو نثر شعر کے رنگ و روپ سے سنورتی نظر آتی ہے ادھر اُردو شعر کیونکہ فارسی اظہار کے سانچے میں ڈھل کر نکلتا تھا اس لئے نثر نے بھی وہی آہنگ اختیار کر لیا اور یوں اُردو نثر عرصہ تک فارسی اسلوب کے رنگ میں رنگی رہی، اُردو غزل۔ میر۔ درد اور سودا کی صورت میں نقطۂ عروج کو پہنچ گئی لیکن نثر ابھی تک اپنے میر امن کی منتظر تھی۔ جسمانی طور پر تو میر من بھی موجود تھا لیکن ابھی "باغ و بہار" کے لئے فضا سازگار نہ تھی۔

اُردو نثر کا ظہور۔ ایک تہذیبی وقوعہ

ہندوستان میں اُردو نثر کا ظہور ایک تہذیبی وقوعہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا اسی تناظر میں

مطالعہ سود مند بھی ثابت ہوگا۔ جیسا کہ سطور بالا میں لکھا گیا ہندوستان زبان اور ادب میں بالخصوص اور ثقافت کے بعض امور میں بالعموم ایران کا خوشہ چیں تھا۔ گو مغل سلطنت، اس مردِ بیمار کی مانند تھی جس کی نبضیں ڈوبتی جا رہی ہوں لیکن یہ مردِ بیمار ہندوستان میں ایک خاص تہذیب اور تمدن کی علامت بھی تھا۔ سلطنت کی حدود دن بدن سکڑتی جا رہی تھیں لیکن وہ مخصوص تہذیب اور ثقافت اپنی جگہ قائم تھی۔ چمک دمک اس تہذیب کی روح تھی تو خارجی آرائش اس ثقافت کا ملبوس، ان کا اظہار، لباس، آدابِ محفل اور طرزِ بود و ماند ہی سے نہ ہو رہا تھا بلکہ زبان اور ادب بھی اس کے دائرہ سے باہر نہ تھے۔ دہلی تو اجڑی پڑی تھی اس لئے لکھنو کے دربار، تمدن، طوائف کے کوٹھوں، امرا کے محلّوں اور مشاعروں کی صورت میں وہ تمام چمک دمک اور آرائش نظر آجاتی ہے جس کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا ہے۔ ادب کیونکہ دانستہ یا نادانستہ طور پر عصری حالات کی عکاسی بھی کر جاتا ہے اس لئے یہ سب کچھ اس عہد کے اہلِ قلم کے ہاں بھی مل جاتا ہے اس لئے تو انہوں نے خیال کی جگہ اسلوب کو ترجیح دے کر جذبہ کو لفظ کا پابند ہی نہ کیا بلکہ بعض صورتوں میں تو لفظ ہی مقصود بالذات قرار پایا۔ الغرض! ادب بھی اس اندازِ زیست کا پیدا کردہ اور شعارِ حیات کا پروردہ تھا۔ یہ حقیقت اس وقت پوری شدت سے اپنا وجود منواتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ میر امن کی سادہ نگارش کے خلاف اہم ترین صدائے احتجاج لکھنو کے مرزا رجب علی بیگ سرور نے بلند کی۔ جب سرور نے فسانۂ عجائب مکمل کی تو سب سے بڑا محرک یہی جذبہ تھا کہ یہ سادہ نگارش اپنے عہد کی تصویر نہیں۔ ہندوستان میں سیاسی حالات جس تیزی سے بد سے بدتر ہو رہے تھے تہذیب و تمدن میں اس رفتار سے تغیرات نہ آ رہے تھے بلکہ سرے سے کسی طرح کے بھی تغیرات نہ تھے۔ جامد کلچر وہ کنواں ثابت ہو سکتا ہے جس میں افراد کا ذہن مینڈک بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ حالت جس ذہنی کیفیت کو جنم دیتی ہے اسے اصطلاحاً دومی نرگسیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ احساس اس کج نگاہی کا موجب بنتا ہے جس کی بنا پر غیر سے خوف زدہ ہو کر اپنی کسی کوتاہی کا احساس نہیں ہوتا۔

ہندوستان میں انگریزوں کی "تجارت" سیاسی لحاظ سے کیسی ہی مکارانہ اور ان کا کردار کیسا ہی گھناؤنا کیوں نہ ہو لیکن ان کی آمد برصغیر کی تاریخ کا ایک اہم تہذیبی وقوعہ بھی ہے اور اس کی اہمیت کو کسی طور سے بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انگریزوں کے مقابلہ میں اہلِ ہند کا حال زمین میں اپنی جڑیں پیوست کئے اس شجر ایسا تھا۔ درخت کتنا ہی تناور کیوں نہ ہو لیکن وہ اپنی جگہ

سے ہلنے کی سکت نہیں رکھتا۔ مسلمان تو پھر بھی حج کے بہانے گھر سے نکل سکتے تھے لیکن ہندوؤں کا تو کوئی مکہ بھی نہ تھا اس کے برعکس انگریز بادل صفت تھا۔ گو وہ پھیری لگانے والوں کی طرح اشیائے تجارت لئے پھرتا تھا لیکن گاہک کی تلاش میں وہ پاتال تک بھی جانے کا حوصلہ رکھتا تھا۔

اہل ہند ایک طرح سے آئینہ خانہ میں تھے اس لئے ان کا حال "آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز" ایسا تھا اسی لئے تو آج تک انہیں سلیس نثر کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوئی۔ دل کے ولولے نکالنے کو غزل، مثنوی، رباعی اور دیگر اصناف تھیں تو تحریر کے لئے فارسی البتہ انگریز اور ان کی زبان ترقی کی منازل طے کر کے سلاست کے درجہ تک پہنچ چکی تھی۔ مزید برآں ہندوستان میں انہیں تجارت اور حکومت دونوں کو فروغ دینا تھا اس لئے ان کے لئے زبان کی سب سے بڑی خصوصیت آرائشِ الفاظ یا اس کا مقفیٰ اور مسجع ہونا نہیں بلکہ اس کا کارآمد آلہ ہونا تھا۔ زبان کے رسیا چند مستشرقین سے قطع نظر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اربابِ بست وکشاد اپنے اہل کاروں کے لئے اس بنا پر تحصیل اردو ضروری سمجھتے تھے کہ مقامی آبادی سے رابطہ کا یہی ایک واحد اور مؤثر ذریعہ بن سکتی تھی

یہ دو تہذیبوں کا ٹکراؤ تھا مغربی تہذیب میں ہزاروں کیڑے نکالے جا سکتے ہیں لیکن اس کے فعال اور متحرک ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا اسی طرح ہم مشرقی تہذیب کی ہزاروں خوبیاں گنوا سکتے ہیں لیکن اس کے جامد ہونے سے انکار ممکن نہیں۔ جیسے جیسے ہندوستان پر انگریزوں کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر اور یقینی ہوتی گئی ویسے ویسے ہی ان سے روابط ہیل جول اور سب سے بڑھ کر ملازمتوں کی صورت میں ایک ایسا طبقہ بھی نمایاں ہوتا گیا جس کا طرزِ فکر اور طرزِ احساس بدلے حالات کے مظہر تھے۔ مغربی اثرات نے تمام ہندوستان کو کئی جہات پر متاثر ہی نہ کیا بلکہ بعض امور میں تو جھنجھوڑا بھی۔ ان میں سے بعض پر لے دے ہوئی تو بعض کی مخالفت جب کہ بعض امور میں ردِ عمل شدید اور تلخ بھی ثابت ہوا۔ مغربی اثرات کے نفوذ کا مطالعہ تہذیب کی تغیر پذیری کا مطالعہ ہے اور یہ ایک جداگانہ داستان ہے لیکن ادب کے نقطۂ نظر سے اس امر پر یقیناً زور دیا جا سکتا ہے کہ مغربی اثرات کا اولیں ثمر سلیس اردو کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے کیونکہ اس وقت تک ایک کتاب بھی ایسی نہ تھی جسے آج کی تو کیا اس عہد کی اصطلاح ہی میں سلیس قرار دیا جا سکے۔

فورٹ ولیم کالج کا قیام

فورٹ ولیم کالج کا قیام کسی نزاع کا باعث نہ تھا اور نہ ہی اس کے مقاصد سے کسی کو اختلاف تھا بلکہ ان مقاصد کے حصول میں کالج سے وابستہ تمام حضرات پوری تندہی سے مصروف رہتے تھے اسی طرح مقامی اہل قلم کو بھی کبھی یہ احساس نہ ہوا ہوگا کہ وہ ایک عہد ساز ادارہ کے لئے کام کر رہے ہیں اور اپنی عہد آفریں تصانیف کی صورت میں اُردو نثر کو ایک نئے آہنگ سے روشناس کرا رہے ہیں لیکن بعد میں فورٹ ولیم کالج ادبی نزاع کا موجب بن گیا۔ کچھ اصحاب کے بموجب یہ سرکاری مقاصد کے حصول کے لئے بنایا گیا تھا اس لئے اس کے زیر اثر جنم لینے والی سلیس اُردو بطورِ خاص انگریزوں کا عطیہ نہیں اس لئے ہمیں ان کا شکر گزار ہونے کی کوئی ضرورت نہیں انہوں نے تو اپنے ملازمین کی تعلیم کے لئے ایک درس گاہ قائم کی تھی اس لئے بعد میں اس کے جو دور رس اثرات ظاہر ہوئے وہ خود انگریزی منصوبہ کا حصہ نہ تھے۔

ان کے برعکس انداز نظر یہ ہے کہ اس کالج کی صورت میں انگریزوں نے بہر حال ایک اہم خدمت سرانجام دی۔ مقاصد خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن اس حقیقت کو کسی طرح سے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو میں سلاست کی تحریک کا باعث فورٹ ولیم کالج ہی بنا۔

اس بحث سے قطع نظر ادبی لحاظ سے جائزہ لینے پر یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ گو زبان انگریزوں ہی نے سیکھی لیکن اس کے مجموعی فوائد تو اُردو ہی کو حاصل ہوئے۔ اب تک تعلیم و تدریس فارسی میں تھی اس لئے عام بول چال کی زبان ہونے کے باوجود بھی اُردو کاروباری مقاصد کے لئے ناکافی سمجھی جاتی تھی بلکہ ادب میں بھی صرف شاعری تک محدود تھی۔ عام زندگی میں اُردو شعر اور اُردو نثر میں فارسی تعلیم و تعلم کی بنا پر جو بُعد پیدا ہو چکا تھا اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُردو کلیات یا دواوین کے دیباچے اور تقریظیں فارسی میں ہوتی تھیں۔ شاعر اُردو کے لکھنے والا بھی اُردو کا شاعر، لیکن تذکرہ قلم بند فارسی میں ہوتا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کی مساعی سے پہلی مرتبہ یہ "حقیقت" منکشف ہوئی کہ اُردو میں نثر بھی ہو سکتی ہے۔

ادبی حیثیت سے قطع نظر کر کے دیکھیں تو فورٹ ولیم کالج کے قیام کے کچھ سرکاری مقاصد بھی تھے اور یہ وہ ہیں جو اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے بہت اہم تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس اہم حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ انگریز ہندوستان میں

آئے تو تجارت کے لئے تھے لیکن یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ ہندوستان میں یہ عہد انحطاط تھا صدیوں کی مغل سلطنت حکمرانوں کی نااہلی اور سپاہ کی قوتِ بازو میں کمی کی بنا پر انتشار کی دلدل میں دھنستی جا رہی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اپنی چالبازیوں، ریشہ دوانیوں اور بعض صورتوں میں بندربانٹ کی بنا پر تاجر پہلے حکومتوں میں دخیل ہوئے اور پھر تو حکمران ہی بن بیٹھے۔ جیسے جیسے انگریزوں کا دائرۂ اقتدار وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا مقامی آبادی سے تعلقات کی نوعیت متنوع ہوتی گئی۔ انگریزوں اور مقامی آبادی کے درمیان زبان ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی چنانچہ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے کمپنی اپنے ملازمین کو "ہندوستانی" (یہ اردو کا نام تھا) سیکھنے کی ترغیب کے طور پر سپیشل الاؤنس بھی دیتی تھی کچھ لوگ ہندوستان آنے سے پہلے ہی انگلستان میں فارسی اور اردو سیکھنے کی کوشش کرتے تو کچھ ہندوستان پہنچ کر اس دقت کو رفع کرنے کے لیے ڈاکٹر گل کرسٹ نے سرکاری اعانت سے "اورینٹل سیمنری" (ORIENTAL SEMINARY) کے نام سے ایک درس گاہ جنوری ۱۷۹۹ء میں قائم کی تاکہ تحصیل زبان کے لئے ایک مرکز مہیا ہو سکے۔

اگر لارڈ ویلزلی گورنر جنرل بن کر نہ آتا تو شاید تحصیل اردو کی یہ مساعی انفرادی نوعیت ہی کی رہتی لیکن ویلزلی کی دوررس نگاہوں نے آتے ہی زبان کی اہمیت کو بہت شدت سے محسوس کیا وہ کمپنی کے آئندہ عزائم اور توسیع پسندی کے منصوبوں کی تکمیل کے لئے مقامی آبادی اور انگریزوں کے وسیع تر تعلقات کی استواری میں تحصیل زبان کو بنیادی اہمیت دیتا تھا وہ ہندوستان میں انگریزی تسلط کے لئے زبان کو کتنی اہمیت دیتا تھا اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک وقت ایسا آیا جب کمپنی کے ڈائرکٹروں میں فورٹ ولیم کالج کی مخالفت بہت بڑھ گئی اور وہ اسے ختم کرنے کے درپے ہو گئے تو لارڈ ویلزلی نے ان کی مخالفت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ لارڈ ویلزلی نے اس کے حق میں جو یادداشت کمپنی کو لکھی اس میں یہ منہ بولتی سطریں قابلِ توجہ ہیں:

"اس معاملہ میں کورٹ کے حکم کی تعمیل کی جاتی تو اس وقت جو نتائج برپا ہوتے وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کالج کو قائم رہنا ہو گا ورنہ سلطنت ختم ہو جائے گی۔" [1]

لارڈ ویلزلی کا ۱۷۹۸ء میں بطور گورنر جنرل تقرر ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی جن امور کو بڑی اہمیت

---

[1] محمد عتیق صدیقی "گل کرسٹ اور اس کا عہد" ص: ۱۴۲

سمجھا ان میں "ہندوستانی" کی تدریس کے لئے ایک جامع منصوبہ بھی تھا۔ ڈاکٹر گل کرسٹ سے اس کے اچھے مراسم تھے اور غالباً اسی نے ویلزلی کو کالج کے قیام سے وابستہ اہم امور اور جزئیات سمجھائی ہوں گی چنانچہ ویلزلی نے کمپنی کو کالج کے قیام کے لئے ایک طویل یادداشت لکھی اس سے جہاں اور بہت سی باتوں پر روشنی پڑتی ہے وہاں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ کمپنی کے اہل کاروں کے لئے کیا کچھ چاہتا تھا۔

"کمپنی کے ملازمین کی تعلیم سائنس اور ادب سے متعلق عام معلومات پر مبنی ہونی چاہیئے جو عموماً یورپ میں اس قسم کے عہدوں کے لئے ضروری ہے لیکن اس بنیاد کے علاوہ بھی یہ لوگ ہندوستان کی تاریخ، زبانوں، رسم و رواج اور اخلاق و عادات سے بھی واقف ہوں۔" [1]

ویلزلی نے اس کالج کی تاریخی اہمیت کو کس شدت سے محسوس کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کا قیام کلکتہ کے فورٹ ولیم میں کیا گیا۔ اس قلعہ کی ایک جداگانہ داستان ہے یہاں صرف اتنا ہی کافی ہوگا کہ انگریز اہم قیدیوں کو بھی یہاں رکھا کرتے تھے چنانچہ واجد علی شاہ یہاں نظر بند رہے تھے اس پر مستزاد یہ کہ کالج کے اصل قیام کی تاریخ سے ہٹ کر اس پر سقوطِ میسور کی تاریخ ڈالی گئی تاکہ اس کالج کا قیام ایک ایسی تاریخ کی یادگار رہے جو ہند میں مسلمانوں کی اہم ترین ہزیمت کا دن تھا اور انگریزوں کی دانست میں ان کے سب سے خطرناک اور اہم ترین دشمن سلطان ٹیپو کی شہادت کی صورت میں ایک شاندار فتح کا دن بھی تھا۔

کالج کی باضابطہ داغ بیل ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء کو ڈالتے ہوئے اس تاریخ کو گورنر جنرل کی کونسل نے کالج کے آئین، قواعد، ضوابط اور شرائطِ ملازمت کے مسودہ کی منظوری دی۔ اس دستاویز کی پیشانی کی عبارت میں یہ تحریر بھی ہے:۔

"ہز لارڈ شپ (ویلزلی) کے حکمِ خاص سے اس (دستاویز) پر ۴ مئی ۱۸۰۰ء کی تاریخ ڈالی گئی جو میسور کے دار السلطنت سرنگاپٹم میں برطانوی افواج کی شاندار اور فیصلہ کن فتح کی پہلی تاریخ تھی۔" [2]

---

[1] محمد عتیق صدیقی: "گل کرسٹ اور اس کا عہد"، ص: ۱۳۵

[2] ایضاً ——— ص: ۱۳۷

کالج کے باضابطہ افتتاح کے بعد جب تمام انتظامی امور طے پا گئے تو طلبا کے داخلہ کے بعد ۶ فروری ۱۸۰۱ء سے باقاعدہ تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا گیا اور ٹھیک ایک سال بعد اسی تاریخ کو فارغ التحصیل ہونے والے طلبا کے لئے پہلا جلسہ تقسیم انعامات منعقد ہوا اس کی صدارت سر جارج بارلو نے کی تھی۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ اس وقت چاہے رسمی محسوس ہوتے ہوں لیکن آج ان کی تاریخی اہمیت مسلّم۔ کیونکہ ان سے بالواسطہ طور سے کالج کے مقاصد پر بھی روشنی پڑتی ہے:۔

"فورٹ ولیم کالج کے قیام سے مشرقی زبان و ادب کی تحصیل کا شوق عام طور پر بہت بڑھ گیا ہے اور آنریبل کمپنی کے ہر انتظامیہ شعبہ میں اس کا بے حد مفید اور قابلِ تعریف اثر پڑے گا۔ ان بے شمار اور اہم فوائد کا صحیح اندازہ کالج کے قیام کی اس مختصر مدّت میں نہیں کیا جا سکتا لیکن آئندہ بھی ان فوائد کی رفتارِ ترقی اسی طرح جاری رہی جس کا کہ مظاہرہ کیا گیا ہے تو یہ ادارہ ان تمام امیدوں کو پورا کرنے میں کامیاب ہوگا جو اس کی کامیابی کے لئے قائم کی گئی ہیں۔ یہ ادارہ ان لوگوں کے لئے جو ہندوستان میں برطانوی حکومت کے اعلیٰ عہدوں کے خواستگار ہیں بہترین مواقع پیش کر رہا ہے"۔ [۱]

دوسرا جلسہ تقسیم انعامات ۳ مارچ ۱۸۰۲ء کو ہوا۔ [۲]

فورٹ ولیم کالج میں السنہ شرقیہ کے ساتھ ساتھ اُردو کی تحصیل پر بطورِ خاص زور دیا گیا تھا چنانچہ اُردو کے علاوہ عربی، فارسی، ہندی اور بنگلہ کی تدریس کے لئے باقاعدہ شعبے قائم کئے گئے تھے۔ ان کے سربراہ انگریز پروفیسر کے عہدے پر فائز تھے جب کہ مقامی زبانوں کے اساتذہ مسلمان ہونے کی صورت میں "منشی" اور ہندو ہونے کی صورت میں "پنڈت" کہلاتے تھے۔ جب ہم ان سب کی تنخواہوں پر نظر کرتے ہیں تو آج کے لحاظ سے وہ بہت اچھی ہیں مثلاً ہندوستانی شعبہ کے سربراہ ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی تنخواہ ڈیڑھ ہزار تھی تو عربی کا پروفیسر سولہ سو روپے لیتا تھا۔ میر بہادر علی حسینی شعبہ ہندی کے "میر منشی" تھے اور دو سو روپے ماہوار پر مامور تھے۔ یہی حال اُردو، فارسی شعبے کے پہلے "میر منشی" ترنی چند رمترا کا تھا

---

[۱]، [۲] جمیل نقوی:۔ فورٹ ولیم کالج کا پہلا جلسہ (مشرب) کراچی۔ تاریخ ادب نمبر)

منشیوں اور پنڈتوں کی تنخواہ گو چالیس روپے تھی لیکن تراجم کے گراں قدر انعامات بھی ملتے تھے۔ چنانچہ میر امن کو "باغ و بہار" پر پانچ صد روپے ملے تھے۔ ۱؎

ڈاکٹر گِل کرسٹ نے کالج کے لئے اتنا کام کیا اور اُردو کے ضمن میں اس کی خدمات اتنی شاندار تھیں کہ مدتوں تک ہمارے ادبی مورخین اسی کو کالج کا پرنسپل سمجھتے رہے لیکن محمد عتیق صدیقی کی تحقیقات نے اب اسے غلط ثابت کر دیا ہے۔ ان کے بقول قواعد کی رو سے پرنسپل کے لئے پادری ہونا ضروری تھا چنانچہ پہلا پرنسپل پادری ریورنڈ ڈیوڈ براؤن تھا۔

ڈاکٹر جان گل کرسٹ

کیونکہ گل کرسٹ کا کالج کے قیام و مقاصد کے علاوہ اُردو تراجم سے بھی گہرا تعلق رہا ہے اس لئے اس موقعہ پر اس کے حالات کا مجمل تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے اس کا پورا نام جان بانھوک گل کرسٹ (JOHN BOTHWICH GIL CHRIST) تھا۔ ایڈنبرا (سکاٹ لینڈ) میں ۱۷۵۹ء میں پیدا ہوا اور پیرس میں ۹ جنوری ۱۸۴۱ء کو انتقال ہوا۔ اس وقت تمام انگلستان کی نگاہیں ہندوستان ہی طرف لگی تھیں اور ہر شخص قسمت آزمائی کے لئے ادھر ہی کا رخ کرتا تھا۔ چنانچہ ۱۷۸۰ء میں گل کرسٹ بھی اس ارادہ سے بمبئی میں وارد ہوا۔ یہاں اُسے کمپنی میں ملازمت مل گئی اور وہ کلکتہ آ گیا۔

اجنبی دیس میں اس نے بعض انگریزوں کی مانند خود پر صاحبیت" نہ طاری کی۔ اُسے زبانوں سے بھی دلچسپی تھی چنانچہ اسی شوق کی تکمیل کے لئے اس نے ہر ممکن طریقہ سے اُردو سیکھنے

۱؎ عام طور پر میر امن "منشی" مشہور ہیں لیکن سرکاری ریکارڈ میں انہیں "ماتحت منشی" (SUBORDINATE MOONSHEE) لکھا گیا ہے۔

۲۹ اپریل ۱۸۰۱ء کو ان کا تقرر فورٹ ولیم کالج میں ہوا۔

"باغ و بہار" کو انعام دینے کا فیصلہ کالج کونسل نے ۳۱ اگست ۱۸۰۲ء کو کیا۔

"فاضل دلیسی میر امن جو کالج سے وابستہ ہیں، ان کو چہار درویش کے ہندوستانی ترجمے کے لئے جسے ہندوستانی پروفیسر ڈاکٹر گل کرسٹ نے آج ہی پیش کیا ہے۔ پانچ سو روپے بطور انعام دیئے جائیں۔"

("گل کرسٹ اور اس کا عہد")

کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے اس نے دہلی اور لکھنؤ کے سفر ہی نہ کیے بلکہ کہا جاتا ہے کہ اُردو کو اہلِ زبان کے لہجے اور روزمرّہ میں بولنے کے لیے اس نے کوٹ پتلون اُتاری اور ہندوستانی لباس اور وضع اختیار کر کے سات برس تک فیض آباد اور غازی پور میں رہائش پذیر بھی رہا۔ اُردو شعرا میں سودا سے اسے خاص شغف تھا بلکہ اس کے بقول اُس نے اُردو کلیاتِ سودا سے ہی سیکھی تھی۔

کالج کے قیام سے قبل ہی وہ انگریزوں کے لیے اُردو کی اہمیت کا قائل تھا۔ وہ اپنے طور سے اُردو کی تدریس میں بھی مشغول رہا اس لیے کالج کے قیام اور اس کے لائحہ عمل کی تشکیل میں گل کرسٹ نے اہم ترین کردار ادا کیا۔ گو وہ کالج سے صرف چار سال تک ہی وابستہ رہا لیکن اس مختصر سی مدت میں اس نے نہ صرف یہ کہ قابل اور موزوں ترین اہلِ قلم اور اساتذہ ہی نہ جمع کر لیے بلکہ اتنا کام کر دکھایا کہ اس کے بعد وہ بات ہی نہ رہی۔

چار سال کی ملازمت کے بعد خرابیٔ صحت کی بنا پر وہ واپس انگلستان چلا گیا یہاں کمپنی کی ملازمت برقرار رہی لیکن پانچ سال بعد یعنی ۱۸۰۹ء میں کمپنی کی ملازمت سے ریٹائرڈ ہو گیا جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے ملازمین کو اُردو سکھانے کے لیے لندن میں اورنٹیل انسٹیٹیوٹ (ORIENTAL INSTITUTE) کی تشکیل کی تو کمپنی نے بحیثیت پروفیسر اس کا تقرر کر دیا۔ گل کرسٹ نے یہاں بھی بہت کچھ کیا لیکن بعد میں اختلافات کی بنا پر ۱۸۶۲ء میں مستعفی ہو گیا۔ اس نے استعفیٰ ملازمت سے دیا تھا اُردو سے نہیں چنانچہ پیرس میں اپنے انتقال تک خرابیٔ صحت کے باوجود بھی اُردو کو یورپ میں مقبول بنانے کے لیے وہ اپنے طور سے سعی کناں رہا۔ گل کرسٹ اُردو میں کئی کتابوں کا مؤلف ہے جن میں سے اس کی انگریزی ہندوستانی لغت اور ہندوستانی گرامر بہت مشہور ہیں۔ یہ اوّلیں کتب تھیں اس لیے بعد کے مولفین اور محققین نے ان سے خاصہ استفادہ کیا۔

فورٹ ولیم کالج کو ایک بامقصد اور فعال ادارہ بنانے کے لیے ایک ایسے نصاب کی ضرورت تھی جس سے ہندوستان میں وارد ہونے والے کمپنی کے اہل کار اُردو سے کماحقہٗ واقفیت بہم پہنچا سکیں۔ یہ ذمہ داری بھی گل کرسٹ کو سونپی گئی۔ گل کرسٹ کے سامنے دو راستے تھے اوّل تو پہلے سے موجود اُردو ادب سے کام لیا جائے کیونکہ نثر نہ ہونے کے برابر تھی۔ بالفاظِ دیگر عبارت سے نصاب مرتب ہو لیکن یہ گل کرسٹ کے لیے ناقابلِ قبول تھا۔ اس ضمن میں گل کرسٹ کا یہ بیان قابلِ توجہ ہے:

"ابھی ہندوستانی نثر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو قدر و قیمت یا صحت کے اعتبار سے اس قابل ہو کہ میں اپنے شاگردوں کو پڑھنے کے لئے دے سکوں، کسی ایسی جگہ سے شہد نکالنا میرے بس کی بات نہیں جہاں مکھیوں کا چھتہ ہی نہ ہو اور یہ بات مجھے اور کونسل دونوں کو خوب معلوم ہے کہ ہندوستانی شاعروں سے صرف وہی طلبا مستفید ہو سکتے ہیں جن کو زبان پر کلی عبور حاصل ہو۔ ایک دو سال بعد جب وہ استعداد پیدا ہو جائے گی جس کی مجھے توقع ہے تو ہندوستانی شاعروں کی طرف بھی ہم توجہ کریں گے فی الحال ان کا خیال کرنا انتہائی بے معنی بات ہوگی۔"[1]

چنانچہ اب دوسرا راستہ اختیار کرنا ضروری ہو گیا یعنی نصابی کتب کو خود تیار کرانا۔ گل کرسٹ نے اس مقصد کے لئے مقبول داستانوں کے تراجم سلیس اردو میں کروانے پر زور دیا۔ اس میں بعض فوائد یہ بھی اس کی نگاہ ہو گی یعنی داستانوں کا وسیع کینوس پوری معاشرت پر محیط ہوتا ہے اس لئے مناظر کی تفصیلات اور مواقع کی جزئیات کی صورت میں طالب علم کے ذخیرۂ الفاظ اور استعدادِ آموزش میں اضافے کے ساتھ ساتھ وہ ہندوستانی معاشرت کی کئی صورتوں سے واقفیت بھی حاصل کر سکتا تھا اور کہانی کی دلچسپی ان پر مستزاد! بلکہ میں تو یہاں تک جانے کو تیار ہوں کہ داستانوں میں ضیافتوں یا محافل وغیرہ کے مواقع پر کھانوں، برتنوں اور ملبوسات وغیرہ کی فہرستیں بھی طالب علم کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہی کے لئے مرتب کی جاتی تھیں۔ ان کے ادبی پہلوؤں سے انکار ممکن نہیں لیکن یہ حقیقت کبھی بھی فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ بنیادی طور پر یہ سب نصابی کتب تھیں۔

گل کرسٹ نے فورٹ ولیم کالج کے نصاب کی تیاری کے لئے جس طریق کار کو اپنایا اس کے جانے کے بعد بھی وہ برقرار رہا چنانچہ کالج کی چون سالہ زندگی میں ۱۹ اہلِ قلم نے کوئی ساٹھ کے قریب کتابیں تیار کیں۔ فورٹ ولیم کالج سے وابستہ اہل قلم میں سید حیدر بخش حیدری، میر بہادری علی حسینی، میر شیر علی افسوس، مرزا کاظم علی جوان اور خلیل علی خاں اشک وغیرہ نمایاں حیثیت کے حامل ہیں لیکن میر امن اور ان کی "باغ و بہار" نے جو شہرت اور مقبولیت حاصل کی وہ تاریخ ادب اردو کا اہم واقعہ ہے۔ اگر یہ سب اہل قلم نثر کے آسمان پر ستارے بن کر چمکے تو میر امن بلا مبالغہ ان کے مقابلے میں چاند ثابت ہوئے۔

---

[1] "گل کرسٹ اور اس کا عہد"، ص: ۱۴۸

حالات میر امن دلّی والے کے ۔۔۔۔

"پہلے اپنا احوال یہ عاصی گناہ گار، میر امن دلّی والا بیان کرتا ہے کہ میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں پشت بہ پشت جانفشانی بجا لاتے رہے اور وہ بھی پرورش کی نظر سے، قدر دانی جتنی چاہیے فرماتے رہے۔ جاگیر و منصب اور خدمات کی عنایات سے سرفراز کر کر، مالا مال اور نہال کر دیا اور خانہ زاد موروثی اور منصب دار قدیمی زبانِ مبارک سے فرمایا، چنانچہ یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا۔ جب ایسے گھر کی (کہ سارے گھر اس گھر سے آباد تھے) یہ نوبت پہنچی، ظاہر ہے (عیاں راچہ بیاں) تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا اور احمد شاہ درانی نے گھر بار تاراج کیا۔ ایسی ایسی تباہی کھا کر ویسے شہر سے (کہ وطن اور جنم بھومی میرا ہے اور آنول نال وہیں گڑا ہے) جلا وطن ہوا اور ایسا جہاز کہ جس کا ناخدا بادشاہ تھا، غارت ہوا۔ میں بے کسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہے۔ کتنے برس بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا۔ کچھ بنی کچھ بگڑی، آخر وہاں سے بھی پاؤں اکھڑے۔ روزگار نے موافقت نہ کی۔ عیال و اطفال کو چھوڑ کر تن تنہا کشتی پر سوار ہوا، اشرف البلاد کلکتے میں آب و دانہ کے زور سے آپہنچا۔ چندے بے کاری گزری۔ اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے واسطے مقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہنا ہوا لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا۔ تب منشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے حضور تک جان گل گرسٹ صاحب بہادر (دام اقبالہ) کے رسائی ہوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جواں مرد کا دامن ہاتھ لگا ہے، چاہیے کہ دن کچھ بھلے آویں نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بڑے پرورش پا کر دعا اس قدر دان کو کرتے ہیں خدا قبول کرے۔"

یہ حالات میر امن نے "باغ و بہار" کے دیباچہ میں قلم بند کئے اور آج کے مؤرخ کو صرف ان ہی پر اکتفا کرنی پڑتی ہے کیونکہ میر امن کے ذکر سے ہم عصر تذکرے بالکل خالی ہیں [illegible] کی وجہ

یہ ہے کہ تذکرے صرف شعرائے کے لئے مخصوص تھے۔ نثر کی عدم موجودگی کی بنا پر ادب شعر کے مترادف تھا۔ گو میر امن شاعر بھی تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یا تو اس نے خود ہی شاعری کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور شعر گوئی کا بطورِ خاص التزام نہ کیا اور یا پھر یہ کہ وہ کبھی اتنا اچھا شاعر نہ بن سکا کہ ہم عصر شعرا میں اسے بھی کوئی امتیازی حیثیت حاصل ہوتی اور تذکرے اس کے ذکر کے بغیر نامکمل سمجھے جا سکتے ویسے ایک بات واضح ہے! میر امن نے باغ و بہار کی نثر میں جن فن کارانہ اختراعات اور اسلوب میں جن جدتوں سے کام لیا ان کی بنا پر یہ باور کرنا محض مفروضہ نہ ہوگا کہ اگر میر امن نے بطورِ خاص شاعری کی ہوتی تو شاید اس میں بھی صاحبِ طرز ثابت ہوتے۔ ویسے میر امن نے اپنے دوسرے ترجمے "گنج خوبی" کے دیباچہ میں اپنی شاعری کے ضمن میں یہ لکھا:

"اگرچہ فکر، سخن کہنے کی ساری عمر نہیں کی، ہاں اگر خود بخود جو کوئی مضمون دل میں آیا تو اسے باندھ ڈالا، نہ کسو کا استاد نہ کسو کا شاگرد بیت:

نہ شاعر ہوں اور نہ شاعر کا بھائی
فقط میں نے کی اپنی طبع آزمائی"

بعض محققین نے امن کے ساتھ ساتھ ان کا ایک اور تخلص لطف بھی بیان کیا جسے اب تک مشکوک سمجھا جاتا رہا تھا لیکن دھلی سے "گنج خوبی" کی اشاعت سے اس کی توثیق ہو جاتی ہے کیونکہ کتاب کے خاتمہ پر "میر امن لطف" لکھا ہے ویسے میر امن کا مطالعہ بحیثیت نثر نگار ہی ہوتا ہے پہلے ان کے ایک زائد تخلص کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ یہ بحث اتنی اہم نہیں کہ اس پر بطورِ خاص توجہ دی جائے میر امن نے "باغ و بہار" کے دیباچہ میں جو مختصر حالات قلم بند کئے ہیں ان میں بعض ایسے اشارے ملتے ہیں کہ تاریخی حالات کے آئینہ میں ان کی امداد سے وہ تناظر پیش کیا جا سکتا جس میں میر امن کی زندگی تغیرات سے آشنا ہوئی اس ضمن میں ممتاز حسین نے اپنے مرتبہ "باغ و بہار" میں خاص کھوج لگائی ہے سو ان کے بقول:۔

"میر امن کا خاندان ہمایوں کے عہد سے لے کر شاہ عالم گیر ثانی کے عہد تک منصبِ قدیمی اور خانہ زاد موروثی میں شمار کیا جاتا اور یہ لقب ان کے خاندان کا بادشاہی دفتر میں درج تھا۔ اس افتخار خاندان کے اظہار کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "جب ایسے گھر کی کہ سارے گھر اس گھر کے سبب آباد تھے یہ نوبت پہنچی کہ ظاہر ہے عیاں را چہ بیان (یہ اشارہ صاف اس زمانے کے مغل بادشاہ کی

طرف ہے کیونکہ سارے گھر اسی ایک گھر کے سبب آباد تھے) جب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کیا اور احمد شاہ درانی نے (مراد ابدالی سے ہے۔ میرؔ نے بھی "ذکرِ میر" میں احمد شاہ ابدالی کو درانی ہی لکھا ہے) گھر بار تاراج کیا۔ ایسی ایسی تباہی کھا کر (جاگیر کے ضبط ہونے اور گھر بار تاراج ہونے کے بعد) دلی شہر سے کہ جنم بھومی میرا ہے اور آنول نال وہیں گڑا ہے جلاوطن ہوا (صیغہ واحد متکلم ہے) اور ایسا جہاز کہ ناخدا پادشاہ تھا غارت ہوا (یہ اشارہ مغلیہ عہد کے خاتمہ کی طرف ہے۔ شاہ عالمگیر ثانی کی موت کے بعد دلی کا تخت مغلیہ تاج کی جلوہ افگنی سے تقریباً بارہ سال تک محروم رہا) میں بے کسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ کتنے برس بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا۔" اب ان جملوں کے ساتھ دیباچے کے اختتام سے بھی چند جملے ملاحظہ کیجئے: "جب احمد شاہ ابدالی کابل سے آیا اور شہر کو لٹوایا شاہ عالم پورب کی طرف تھے کوئی وارث اور مالک ملک کا نہ رہا۔ شہر بے سر ہو گیا۔ سچ ہے پادشاہت کے اقبال سے شہر کی رونق تھی ایکبارگی تباہی پڑی رئیس وہاں کے، میں کہیں تم کہیں ہو کر جہاں جس کے سینگ سمائے وہیں نکل گئے۔"

جہاں تک دلی سے ان کے جلاوطن ہونے کا تعلق ہے یہ دونوں عبارتیں صاف اس چیز کی طرف اشارہ کر رہی ہیں کہ وہ ۱۷۶۱ء میں جلاوطن ہوئے جب کہ احمد شاہ ابدالی نے دلی کو ایسا لوٹا کہ لوگ نادر شاہ درانی کی غارت گری کو بھی بھول گئے۔ [illegible] شاہ عالم ثانی پورب میں تھا اور دلی کا تخت پادشاہت سے خالی تھا کیونکہ عالمگیر ثانی کو ۱۷۵۹ء میں قتل کیا جا چکا تھا اور عماد الملک کا نامزد کیا ہوا پادشاہ شاہ جہان ثانی صرف سال بھر یعنی ۳۰ نومبر ۱۷۵۹ء سے لے کر ۱۰ اکتوبر ۱۷۶۰ء تک بادشاہ رہا۔ اس کے بعد یہ تخت تقریباً بارہ سال کے لئے اس وقت تک خالی رہا جب تک شاہ عالم ثانی پورب سے بلائے نہیں گئے اور انہیں تخت پر بٹھایا نہیں گیا۔

جہاں تک سورج مل جاٹ کے جاگیر ضبط کرنے کا تعلق ہے وہ واقعہ بھی ۱۷۶۱ء سے کچھ پہلے تک کا ہے سورج مل جاٹ نے ۱۲ جون ۱۷۶۱ء کو اکبرآباد پر قبضہ کیا لیکن اس تاریخ کے کچھ دن پہلے ہی اس نے اکبرآباد کے محلات پر قبضہ کر لیا تھا[1]

---

[1] باغ و بہار، مرتبہ ممتاز حسین، مقدمہ، ص: ۲۳-۲۵

ڈاکٹر وحید قریشی نے بعض اور ماخذات کی روشنی میں اس ضمن میں یہ صراحت پیش کی ہے:

"سورج مل جاٹ نے اوّل دہلی کے محلّہ سید داؤد وغیرہ کو (۱۱۶۶ھ) ۱۷۵۳ء میں برباد کیا دوسری بار اس نے (۱۱۷۶ھ) ۱۷۶۱ء میں دلّی پر حملہ کیا۔ ۲۵ر دسمبر ۱۷۶۳ء کو سورج مل کا انتقال ہوا اس کے بعد جواہر کے حملے سے جاٹ گردی ہوئی جو (۱۱۷۸ھ) ۱۸ر نومبر ۱۷۶۴ء کا واقعہ ہے۔

احمد شاہ درانی (ابدالی) نے دلّی پر پہلا حملہ (۱۷۵۷-۱۱۷۰ھ) ۱۷۵۷ء میں کیا، دلّی میں خوف و ہراس پھیلا، ظلم و ستم اور غارت گری کا دور چلا۔ دوسرا حملہ ۱۱۷۳ھ میں ہوا۔ اس کے بعد ۱۱۷۴ھ میں ابدالی قندھار لوٹ گیا۔

میر امن کے بیان کے مطابق پہلے سورج مل جاٹ نے جاگیر ضبط کی، پھر احمد شاہ ابدالی نے گھر بار تاراج کیا تب" سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا اور احمد شاہ درانی نے گھر بار تاراج کیا"۔ اس لحاظ سے یہ واقعات (۱۱۶۶ھ) ۱۷۵۳ء اور پھر (۱۱۷۰ھ) ۱۷۵۷ء کے ہو سکتے ہیں۔ گو اس مدت کو بآسانی (۱۱۷۰ھ) ۱۷۵۷ء اور (۱۱۷۶ھ) (وفات سورج مل جاٹ) کے مابین محصور کیا جا سکتا ہے۔" [1]

ان تمام تاریخی حالات کے تجزیہ کے بعد بقول ممتاز حسین "یہ ساری شہادتیں اس بات کو کلی طور سے ثابت کرتی ہیں کہ میر امن ۱۷۶۱ء میں، دلّی سے جلاوطن ہوئے۔" [2]

یہ صرف ایک دلّی سے جلاوطن ہونے کی تاریخ کا تعین ہے میر امن کی تو تمام زندگی ہی اسرار کے پردوں میں نہاں ہے۔ نہ تاریخ پیدائش کا علم اور نہ وفات کا! تاریخ پیدائش کا تعین تو ناممکنات میں سے ہے کیونکہ نہ تو میر امن کے اپنے قلم سے اس پر روشنی پڑتی ہے اور نہ ہی کسی معاصر تحریر سے، اس لئے الجھے ہوئے قیاسات سے تاریخ پیدائش کا تعین بے ثمر سعی ہے اسی طرح میر امن کی تاریخ وفات بھی نزاعی ہے۔ حالانکہ اس وقت تک وہ ایک اچھے ادارہ کے لئے اچھا کام کر چکے تھے۔ ممتاز حسین کے بقول میر امن کا انتقال ۱۸۰۶ء میں ہوا ہے۔ ان کے بقول:۔

---

[1] ڈاکٹر وحید قریشی: باغ و بہار: ایک تجزیہ ص: ۱۹ - ۱۸۔

[2] مقدمہ۔ ص: ۲۵

"نصر اللہ خاں قمر خورجوی اپنے تذکرے "ہمیشہ بہار" میں احسن شاعر کے ذکر میں یوں لکھتے ہیں:"

"احسن میر احسن نام دارد پسر میر امن، از خوش فکران مرشد آباد است جوانِ دلچسپ و با اکثر خوبی موصوف از مدتے در عظیم آباد می باشد و از فیض صحبت فقیہ، صاحب درد مند، شاگرد مرزا مظہر جان جاناں، انشا خوب می نویسد در تاریخ دانی دست گاہ درست دارد، پدرش روز پنج شنبہ وقت صبح سال ۱۲۱۶ھ آدر و باو بہ فنا شد، بعد وفات پدر نامدار، نواب الدولہ کہ از امرائے آن دیار انماوراء بسلک مصاحبت خود منسلک کردند!"

نصر اللہ خاں قمر خورجوی کے اس بیان کی تصدیق مولوی مجتبیٰ علی خاں جو فاموی کے اس اندراج سے بھی ہوتی ہے جسے انہوں نے میر امن کا اپنی کتاب "مواقیت الفواتح" میں کیا ہے:-

"میر حسن صاحب گلشن خوبی در سال دواز دہ دوہم و ہفت ہجری نبوی فوت شدند" [1]

اس کے علاوہ ایک دلیل یہ بھی ہے:-

"فورٹ ولیم کالج کی خدمات کے سلسلہ میں ان کا (یعنی میر امن کا) ذکر ۱۸۰۶ء کے بعد وہاں کی رپورٹ میں نہیں آتا" [2]

یہ دلائل بظاہر ناقابل تردید نظر آتے ہیں لیکن ڈاکٹر وحید قریشی نے ان کی تردیدیوں کی ہے:

"نصر اللہ خورجوی کے تذکرہ "ہمیشہ بہار" کا معاصر مطبوعہ نسخہ ترقی اردو بورڈ کراچی کے کتب خانے میں ہے اور حال ہی میں اسے ڈاکٹر اسلم فرخی نے انجمن ترقی اردو کراچی کی طرف سے شائع بھی کر دیا ہے۔ یہ تذکرہ میر امن اور اس کے بیٹے احسن کے ذکر سے خالی ہے۔ "مواقیت الفواتح" کا حوالہ "ارمغان یادر" (مفتی انتظام اللہ شہابی) کے واسطے سے دیا گیا ہے۔ یہ ہمیں معلوم ہے کہ مفتی صاحب کے بعض حوالے جعلی ہوتے ہیں (جہانگیر سمنانی کی کتاب نیز "کربل کتھا" کے سلسلہ کی مطبوعہ بحثوں سے یہ بات ثابت ہے) ان حالات میں ان دونوں شہادتوں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ فورٹ ولیم کالج کی رودادوں کے سلسلہ میں مزید مواد "ہماری زبان" میں ملتا ہے۔ جہاں ممتاز حسین اور عتیق صدیقی کے درمیان بحث چلی تھی۔ متعلقہ اقتباس یہ ہے!

---

[1] [2] مقدمہ باغ و بہار، ص: ۲۸، ۲۷

"۴ر جون ۱۸۰۶ء کو فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبہ کے پروفیسر کی شکایت پر کہ میر امن نے ایک طالب علم کو پڑھانے سے انکار کیا ہے، کالج کونسل کے سامنے پیش کئے گئے، الزام کو تسلیم کرتے ہوئے پیرانہ سالی اور جسمانی معذوری کا انہوں نے عذر پیش کیا۔ ان کا بیان سننے کے بعد کالج کونسل اس نتیجے پر پہنچی کہ میر امن کالج کی خدمات سے سبکدوش ہونے کے خواہش مند معلوم ہوتے ہیں، طے پایا کہ اس مہینے کی تنخواہ کے علاوہ اور چار مہینوں کی تنخواہ دے کر کالج کی خدمات سے ان کو سبکدوش کیا جائے۔"

(فورٹ ولیم کالج کی کارروائیاں جلد دوم ۱۰۶)

اس تاریخ کے بعد ان کا نام کالج کونسل کی کارروائیوں میں نہیں ملتا اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کالج سے نکلنے کے بعد کہاں گئے اور کب تک زندہ رہے۔[۱]

اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ میر امن کا انتقال ۱۸۰۶ء کے بعد ہوا۔ اس بحث سے زیادہ سے زیادہ یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ میر امن ۱۸۰۶ء تک بقید حیات تھے البتہ بلاشبہ بدیہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس سن میں یا اس کے قریب قریب ان کا انتقال ہو گیا ہو کیونکہ اگر وہ زندہ ہوتے تو گھر بیٹھ کر تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھ سکتے تھے۔ کالج میں تدریس کے قابل نہ تھے تو گھر بیٹھ کر کالج کے لئے ترجمہ کے اہل تو تھے اور نہیں تو کسی انگریز ہی کو پڑھا سکتے تھے لیکن ان کے بارے میں جو یک لخت ہر طرح سے خاموشی ملتی ہے تو اس سے یہی باور کیا جا سکتا ہے کہ کالج سے سبکدوشی کے بعد وہ زیادہ عرصہ نہ جئے! بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہ زیادہ عرصہ جئے یا کم، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میر امن "باغ و بہار" سے زندہ ہے اس لئے تاریخ ادب کے لحاظ سے باغ و بہار کی تکمیل کے بعد میر امن نے اپنی بقا کا سامان کر لیا تھا۔ بحیثیت مصنف (یا مترجم) میر امن کی موت اس امر میں مضمر ہے کہ پھر وہ "باغ و بہار" کے پایہ کا کوئی اور کارنامہ انجام نہ دے سکا۔ اس لئے "باغ و بہار" کے بعد اس کی زندگی کے بقیہ ایام کی گنتی بے سود ہے۔

باغ و بہار — تحقیق کی روشنی میں

دار الاشاعت پنجاب نے ۱۹۳۴ء میں "باغ و بہار" طبع کی جس کا مقدمہ پروفیسر مرزا محمد سعید دہلوی

---

[۱] ڈاکٹر حمید قریشی "باغ و بہار" ایک تجزیہ: ص: ۲۳ - ۲۲

ایم۔اے کا تحریر کردہ ہے۔اس مقدمہ کی مندرجہ ذیل سطور قابلِ غور ہیں ؛

"باغ وبہار کے ماخذ کے متعلق تو اس کے مصنف کا بیان ہے کہ "چہار درویش" نامی ایک قصہ امیر خسرو دہلوی نے اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیاؒ کا دل زمانۂ علالت میں بہلانے کے لئے تصنیف کیا تھا جب سے یہ قصہ فارسی میں مروّج تھا۔ میر امن نے اس فارسی قصہ کو روزمرہ کی بولی میں ترجمہ کر دیا اس بیان کی تصدیق و تحقیق کے لئے یہ لازمی ہے کہ "باغ و بہار" کا مقابلہ اصل فارسی قصہ سے کیا جائے اور پھر اس قصہ کے مصنف کی شخصیت کے متعلق تاریخی ثبوت اور شہادتیں تلاش کی جائیں لیکن اگر کوئی فارسی قصہ اس نام کا میر امن کے زمانہ میں موجود تھا تو اب اس کا وجود عنقا ہے اور ہمارے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ میر صاحب کے اپنے بیان کو اعتقادی طور پر تسلیم کر لیں۔قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی میں کوئی قصہ اس نوع کا ضرور ہوگا لیکن یہ کہ وہ کسی زمانہ میں اور کس شخص کی قلم سے لکھا گیا محض قیاسی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔حضرت امیر خسرو کے نام سے اور بھی بہت سا رطب و یابس (حتیٰ کہ ہزلیات بھی) منسوب کر دیا گیا ہے لیکن ان نسبتوں کے تسلیم کرنے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔بظاہر تو اس قسم کے قصے کہانیوں کو ان کی اور ان کے محترم مرشد کی جانب منسوب کرنا سوءِ ادب معلوم ہوتا ہے۔" (ص : ۵)

اس اقتباس کی اہم ترین خصوصیت مقدمہ نگار کی عدم اعتمادی ہے اس کے ذہن میں بعض امور کے بارے میں شکوک ابھرتے ہیں۔بعض باتوں کی وہ مزید تصدیق کا خواہاں بھی نظر آتا ہے لیکن قیاسات اور عدم اعتماد کا سہارا لینے پر مجبور ہے۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک باغ و بہار کے بارے میں تحقیقات کا دائرہ بہت محدود تھا اور ایسی تاریخی معلومات یا دستاویزی شواہد نہ ہونے کے برابر تھے جن کی امداد سے باغ و بہار پر کسی نئے زاویہ سے روشنی ڈالنی ممکن ہو سکتی۔یوں بھی اردو میں زبان و ادب اور رجحانات و شخصیات کے بارے میں تحقیقات کی رفتار بے حد سست رہی ہے اس لئے باغ و بہار کے بارے میں بھی بطور خاص تحقیقات کی ضرورت نہ محسوس کی گئی لیکن یہ صورتحال ہمیشہ نہ قائم رہ سکتی تھی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج "باغ و بہار" پر کام کرنے والے کے لئے تحقیقی مواد کی کمی نہیں۔گذشتہ برسوں میں فورٹ ولیم کالج، میر امن اور خود باغ و بہار کے متن میں بڑھتی ہوئی اساسی تحقیقات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اسلئے آج کے کسی بھی مقدمہ نگار

کو مرزا سعید دہلوی کی مانند بے یقینی کے عالم میں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

باغ و بہار کی تحقیقات کا پس منظر

باغ و بہار پر سب سے پہلی اور قابلِ ذکر تحقیق مولوی عبدالحق کا وہ مقالہ ہے جو رسالہ "اُردو" جولائی ۱۹۳۰ء میں طبع ہوا اور بعد ازاں ۱۹۳۱ء میں باغ و بہار کے ساتھ بطورِ مقدمہ انجمن ترقی اُردو کے لئے طبع کرایا۔ اس مقدمہ کو بلاشبہ "باغ و بہار" کے بارے میں تحقیقات کا نقطۂ آغاز قرار دے سکتے ہیں ان کے بعد حافظ محمود شیرانی کا مقالہ "قصہ چہار درویش" سالنامہ "کارواں" بابت ۱۹۳۳ء میں شائع ہوتا ہے۔ یہ مقالہ جواب ان کی تالیف "مقالات شیرانی" (طبع ۱۹۴۰ء) میں شامل ہے "باغ و بہار" کے ضمن میں کلاسیکی اہمیت حاصل کر چکا ہے۔ اس حد تک کہ آنے والے محققین یا ناقدین کے لئے اس سے استفادہ کے بغیر "باغ و بہار" پر کچھ لکھنا ناممکن ہے مولوی عبدالحق کے مقدمہ اور حافظ محمود شیرانی کے مقالہ کے بعد تو تحقیقات میں اضافہ ہی ہوتا گیا چنانچہ آج بیشتر مباحث کے بارے میں قطعی بات کہی جا سکتی ہے۔

باغ و بہار کی ابتدا میں میر امن نے ایک دیباچہ بھی پیش کیا ہے۔ یہ دیباچہ اپنی نوعیت کی غالباً واحد تحریر ہے کیونکہ اس نے جہاں بعض امور پر روشنی ڈالی وہیں بعض نزاعی مباحث کا باعث بھی بنا مثلاً جیسا کہ ابتدائی سطور میں لکھا گیا۔ میر امن کے جو تھوڑے بہت حالاتِ زندگی ملتے ہیں ان کا ماخذ یہ دیباچہ ہے اس طرح میر امن نے اُردو کے آغاز کے بارے میں ایک نظریہ بھی پیش کیا ہے یعنی شہنشاہ اکبر کے زمانے میں اُردو کے بنیادی نقوش صورت پذیر ہوتے ہیں (ہمیں اپنے موضوع کی رعایت سے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں لیکن ماہرین لسانیات نے اس نظریہ کے حسن و قبح کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے) یہ تو تھے اس دیباچہ کے مثبت پہلو اور اب دیکھیے منفی! اس ضمن میں سب سے اہم تحقیقی بحث نے امیر خسرو سے اس قصہ چہار درویش کو منسوب کرنے کی بنا پر جنم لیا اور اس کے ساتھ ساتھ میر امن نے دیباچہ میں اس امر کا اظہار نہ کیا کہ اس کا ماخذ "نوطرز مرصع" ہے۔ گو اس سلسلہ میں میر امن کو اصولاً الزام نہیں دیا جا سکتا کہ باغ و بہار کی اوّلیں اشاعت کے

---

[1] "میر امن ہندیوں میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے اُردو زبان کے بننے اور اس کے نشو و نما کا حال لکھا ہے"

(مولوی عبدالحق : مقدمہ)

سرورق پر یہ اعتراف ان الفاظ میں کیا گیا تھا :۔

" باغ و بہار تالیف کیا ہوا میر امن دلی والے کا، ماخذ اس کا نوطرز مرصع کہ وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین کا ہے، فارسی قصہ چہار درویش سے "

لیکن ہوا یہ کہ بعد کی اشاعتوں میں سرورق کی اس عبارت کو نقل نہ کیا گیا حتّٰی کہ انگریز مستشرق پروفیسر ڈنکن فاربس کے مرتبہ اور مطبوعہ نسخے جنہیں اب سب سے زیادہ مستند قرار دیا جاتا ہے بھی اس عبارت کے بغیر چھپے۔

اس نوع کی معلومات کیونکہ سرورق کی بجائے کتاب کے اندر دیباچہ میں درج کی جاتی ہیں اس لئے بعد کے نسخے دیکھ کر مولوی عبدالحق ایسے محقق بھی اس سلسلہ میں دھوکہ کھا گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ " نوطرز مرصع "، پر تحقیق بھی ایک لحاظ سے " باغ و بہار "، کی تحقیق کی ایک شاخ بن گئی۔ ان کے ساتھ ساتھ جب " باغ و بہار "، کے ماخذات کا تفحص بھی شامل کر لیا جائے تو " باغ و بہار "، پر تحقیقات کی دشواریوں کا اندازہ لگانا دشوار نہیں رہتا اس پر مستزاد یہ کہ گذشتہ چند برسوں میں بعض نئی معلومات کی روشنی میں خود باغ و بہار کا سنہ اشاعت بھی اب تحقیق کا موضوع قرار پایا ہے۔۔۔ یہ شاید اس کے نام کی ہی برکت ہو کہ اس پر تحقیقات کے گلشن میں بھی ہمیشہ " باغ و بہار "، ہی رہتی ہے۔

بہر حال یہ ہے وہ تحقیقی پس منظر جسے ذہن میں رکھ کر " باغ و بہار "، کا جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں جائزہ لینا سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔

باغ و بہار اور امیر خسرو

جیسا کہ سطورِ بالا میں لکھا گیا امیر خسرو کی روایت میر امن ہی کی بیان کردہ ہے ان کے بقول :

" یہ قصہ چہار درویش کا ابتدا میں امیر خسرو دہلوی، اس تقریب سے کیا کہ حضرت نظام الدین اولیا زری زربخش جو اُن کے پیر تھے اور درگاہ ان کی دلّی میں قلعے سے تین کوس لال دروازے کے باہر ٹٹیا دروازے سے آگے، لال بنگلے کے پاس ہے۔ ان کی طبیعت مندی ہوئی، تب مرشد کا دل بہلانے کے واسطے امیر خسرو یہ قصہ بیٹھے کہتے اور تیمارداری میں حاضر رہتے۔ اللہ نے چند روز میں شفا دی۔ تب انہوں نے غسل صحت کے دن یہ دعا دی کہ جو کوئی اس قصے کو سُنے گا، خدا کے فضل

سے تندرست رہے گا۔ جب سے یہ قصہ فارسی میں مروّج ہوا۔"

اس روایت پر کسی ناقد کو شک و شبہ کی ضرورت نہ محسوس ہوئی اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں ایک تو تحقیقی مواد کی کمی اور دوسرے امیر خسرو کی عقیدت اور احترام! امیر خسرو عہد آفریں شخصیت تھے۔ انہوں نے بہت اچھا کچھ لکھا لیکن ان سے منسوب کتابوں میں قصہ چہار درویش کا نام نہیں ملتا۔ وجوہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں حقیقت یہ ہے کہ مولوی عبدالحق سے قبل کسی نے اس بیان کی پرکھ کی ضرورت نہ محسوس کی۔ ان کے بعد حافظ محمود شیرانی کا نام آتا ہے۔

امیر خسرو کو اس قصہ کا مصنف نہ ماننے کے ضمن میں حافظ محمود شیرانی نے بعض تاریخی اور لسانی شواہد ہی نہ بہم پہنچائے بلکہ خود "باغ و بہار" سے ایسی داخلی شہادتیں بھی پیش کیں جن کی بنا پر میرامن کا یہ دعویٰ بالکل غلط ثابت ہوتا ہے کہ امیر خسرو اس کے مصنف تھے! حافظ محمود شیرانی نے باغ و بہار سے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ مختصراً یوں ہیں کہ فارسی قصہ میں بعض ایسے الفاظ ملتے ہیں جو امیر خسرو کے عہد میں مروّج نہ تھے۔ مثلاً تومان، اشرفی، توڑچیاں، کشک چیاں، کشک خانہ، اشک آقایان، وکیل السلطنت، خزانہ دار اور امیر آخور۔۔۔ حافظ اور نظیری کے اشعار ملتے ہیں حالانکہ یہ خسرو کے بعد کے شاعر ہیں۔ مغربی اقوام کے بارے میں بعض معلومات ہی نہیں ملتیں بلکہ دو رہبین کا تو ذکر بھی کیا گیا ہے حالانکہ یہ سب امیر خسرو کے زمانہ میں نہ تھیں ان کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس امر پر بھی زور دیا کہ اس قصہ کے تمام فارسی نسخوں میں نہ تو خسرو کے اپنے اسلوب نگارش کی جھلک ملتی ہے اور نہ ہی اس زبان کو ان کے عہد کی زبان قرار دیا جا سکتا ہے۔ مزید برآں کسی بھی قدیم تصنیف میں نہ تو اس قصہ کا حوالہ ملتا ہے اور نہ ہی حضرت نظام الدین اولیاؒ کے احوال و ملفوظات میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ اس امر پر بھی زور دیتے ہیں کہ فارسی میں اس قصہ کا قدیم ترین نسخہ بارھویں صدی ہجری سے آگے نہیں جاتا۔ شیرانی نے مذہبی لحاظ سے بھی قصہ کا تجزیہ کر کے ثابت کیا کہ قصہ کا مصنف شیعہ معلوم ہوتا ہے جب کہ خسرو سُنّی تھے۔

ان تمام دلائل و براہین کی بنا پر حافظ محمود شیرانی نے یہ نتیجہ اخذ کیا:

"یہ بعض امور ہیں جو اس کتاب کے سرسری مطالعے کے وقت ہماری نظر سے گزرے ہیں ان میں اکثر و بیشتر ایسا مواد ہے جو کتاب کو امیر خسرو کے ساتھ وابستہ کرنے کے بجائے اس کے جدید العہد ہونے کی شہادت پیش کر رہا ہے۔"[1]

---

[1] حافظ محمود شیرانی: "مقالات شیرانی"، ص: ۴۰

امیر خسرو والی روایت کے ضمن میں خود گل کرسٹ کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ ویسے اس کا قوی امکان ہے کہ وہ خود اس سے ناآشنا ہو اور میر امن کی پیروی میں اس نے بھی اسے امیر خسرو سے منسوب کر دیا ہو۔

مولوی عبدالحق نے محولہ بالا مقدمہ میں جدید ترین شواہد کی روشنی میں باغ و بہار کی چھان پھٹک کرتے ہوئے، امیر خسرو والی روایت کو جھٹلاتے ہوئے اس امر پر زور دیا:

"لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فارسی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے۔ قصہ وہی ہے مگر اس کا ماخذ بجائے فارسی کے اُردو کی کتاب "نو طرز مرصع" ہے۔ اس کے مؤلف میر محمد حسین عطا خاں تخلص بہ تحسین اٹاوے کے رہنے والے تھے۔ ان کو فارسی اُردو نظم و نثر دونوں پر قدرت تھی۔ وہ بہت اچھے خوش نویس بھی تھے اور اسی بنا پر ان کا خطاب "مرصع رقم" تھا۔ علاوہ اس کتاب کے وہ "انشائے تحسین"، "ضوابط انگریزی اور" "تواریخ فارسی" وغیرہ کے مؤلف ہیں یہ سب کتابیں فارسی زبان میں ہیں۔ "نو طرز مرصع" کی تالیف کا سبب انہوں نے یوں بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ نواب مبارز الملک افتخار الدولہ جنرل سمتھ بہادر صولت جنگ سالار فوج انگریزی کے ہمراہی میں بجرے پر کلکتے کا سفر درپیش آیا۔ خالی بیٹھے بیٹھے دل گھبرانے لگا تو ایک عزیز نے جو ہمراہ تھا یہ قصہ سنانا شروع کیا۔ بہت پسند آیا اور اسی وقت سے زبانِ ہندی میں لکھنے کی دھن لگ گئی کیونکہ سلف میں کوئی شخص موجد اس ایجاد تازہ کا نہ ہوا چنانچہ اسی خیال سے لکھنا شروع کیا۔

جنرل سمتھ چلتے وقت انہیں صوبہ عظیم آباد کی بعض خدمات پر متعین کر گئے وہاں فرصت نہ ملی۔ پھر انقلابات ایسے واقع ہوئے کہ وہاں سے دستبردار ہونا پڑا اور وزیر الممالک نواب برہان الملک شجاع الدولہ ابو المنصور خاں صفدر جنگ (نواب اودھ) کی سرکار میں پہنچا اور ان کے سایہ عاطفت میں اس قصہ کو پورا کیا، لکھتے ہیں کہ "ایک روز تقریباً دو چار فقرے اس داستان کے کہ اول الذکر اُن کا بیان کر گیا ہوں، بیچ سمع مبارک حضرت ولی نعمت کے پہنچے، ز بسکہ شاہد رعنا اس حکایت دلفریب کا جلوہ گری کے عالم میں شوخ و شنگ ہے توجہ دل سے مقصد الخاطر منظور نظر اشرف کے کر کے فرمایا کہ از سرتا پا از محبوب پسند بردہ دلہا

کے تئیں زیورِ عبارت سے آراستہ کر، اس قلیل البضاعت نے حسب الحکم جلیل القدر کے درخورِ حوصلہ اپنے اس داستان کی معشوق کو جلی بندز یب و زینت کاکر کے چاہتا تھا کہ اس نازنین کے تئیں نظر مبارک سے گزرانوں کہ اس عرصہ میں زمانے نے اور ہی رنگ دکھایا "

غرض نواب شجاع الدولہ کی وفات پر انہوں نے یہ کتاب نواب آصف الدولہ کے نام معنون کی نواب آصف الدولہ کی تخت نشینی ۱۷۷۵ء میں ہوئی۔ اس وقت یہ کتاب ختم ہو چکی تھی یعنی اس کی تالیف "باغ و بہار" سے تخمیناً ۲۹-۳۰ برس پہلے ہوئی۔

فارسی اور "نوطرزِ مرصع" کے مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ "باغ و بہار" فارسی زبان کا ترجمہ نہیں بلکہ اس کا ماخذ نوطرزِ مرصع ہے تعجب اس کا ہے کہ میر امن نے فارسی کتاب اور اس کے ترجمے کا ذکر کیا مگر نوطرزِ مرصع کا ذکر صاف اڑا گئے۔۔۔ اصل یہ ہے کہ ترجمہ ان دو میں سے کوئی بھی نہیں فارسی قصے کو اپنی اپنی زبان میں بیان کر دیا ہے لیکن جہاں کہیں "نوطرزِ مرصع" اور فارسی کتاب میں اختلاف ہے "باغ و بہار" نے "نوطرزِ مرصع" کا اتباع کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "باغ و بہار" جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے فارسی قصے کا ترجمہ نہیں بلکہ اس کا ماخذ نوطرزِ مرصع ہے۔ بعض مقامات پر تو الفاظ اور جملے کے جملے وہی لکھ دیئے ہیں جو "نوطرزِ مرصع" میں ہیں "

یہ اقتباس قدرے طویل تو ہے لیکن بعض بنیادی مباحث پر روشنی ڈالتا ہے۔ اب دیکھیے، تحقیق کی تحقیق کیسے ہوتی ہے۔ مولوی عبدالحق نے جہاں بہت سی نئی باتیں کہیں وہاں میر امن پر یہ الزام بھی لگا گئے:

"مگر "نوطرزِ مرصع" کا ذکر صاف اڑا گئے"

اس کا جواب حافظ محمود شیرانی کے مقالہ سے ملتا ہے۔ حافظ محمود شیرانی کے پاس فارسی اور اردو مخطوطات کا جو نادر ذخیرہ تھا اس کی بنا پر انہوں نے اردو زبان و ادب کی تحقیقات کو جو بلند معیار عطا کیا بعد کے محققین کے لئے اس معیار کی برقراری اگر ناممکن نہ بھی ہوئی تو مشکل یقیناً ہوئی چنانچہ انہوں نے اپنے مسلکوکہ نسخے کی بنا پر مولوی عبدالحق کے لگائے گئے الزام کو غلط

ثابت کر دیا ۔ ان کے بقول :

" حقیقت میں میر امن پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا ۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ میر امن نے اپنے دیباچہ میں " نو طرزِ مرصع " کا بحیثیت ماخذ کوئی ذکر نہیں کیا مگر اپنی تالیف کے سرورق پر صاف صاف الفاظ میں اس کا اظہار کیا ہے :

" باغ و بہار تالیف کیا ہوا میر امن دلی والے کا،
ماخذ اس کا " نو طرزِ مرصع "،
کہ وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خاں کا ہے،
فارسی قصہ چہار درویش سے "

یہ عبارت " باغ و بہار " کی اشاعت اوّل پر درج تھی جو کلکتہ میں چھاپی گئی ۔ [1]

اس کے ساتھ جب ڈاکٹر گل کرسٹ کی اس تحریر کو بھی پیش نظر رکھیں جس میں " باغ و بہار " کا تعارف کرایا گیا ہے تو معاملہ بالکل واضح ہو جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریر بھی (جسے آئندہ صفحات پر ڈنکن فوربس کے پیش لفظ کے ساتھ دیا جا رہا ہے) باغ و بہار کے بیشتر نسخوں میں نہ ہوگی ورنہ اس کی موجودگی میں میر امن پر سرقہ کا الزام نہ لگتا بلکہ میر امن نے جو بطورِ خاص اپنے دیباچہ میں نو طرزِ مرصع کا ذکر نہ کیا تو اس کی وجہ بھی یہی ہوگی کہ خود گل کرسٹ نے اس کا حوالہ دے دیا تھا ۔

نو طرزِ مرصع

" نو طرزِ مرصع " کیونکہ " باغ و بہار " کی تحریر میں کلیدی حیثیت رکھتی ہے اس لئے اس موقع پر اس کا تفصیلی تذکرہ بے محل نہ ہوگا ۔ اس ضمن میں سید سجاد (اب ڈاکٹر) کا ایک انگریزی مقالہ بعنوان " AN EARLY WRITER OF MODERN URDU " (مطبوعہ اسلامک کلچر، حیدر آباد دکن، جلد ۱۳، نمبر ۱، شمارہ جنوری ۱۹۳۹ء) بہت تحقیقی مواد فراہم کرتا ہے ۔ سید سجاد نو طرزِ مرصع کو دبستان لکھنؤ کی نثر کا اوّلیں کارنامہ قرار دیتے ہوئے کتاب اور اس کے مصنف کے بارے میں کار آمد معلومات بہم پہنچاتے ہیں ۔ ان کے بقول آزاد کی " آب حیات " میں پہلی مرتبہ تحسین کا نام ملتا ہے اور نو طرزِ مرصع کی تاریخ ۱۷۹۸ء بھی آزاد ہی کی متعین کی ہوئی ہے ۔

---

[1] حافظ محمود شیرانی : " مقالاتِ شیرانی " ص : ۲۰

لیکن معلوم ہوتا ہے آزاد نے اصل کتاب نہ دیکھی تھی لیکن آبِ حیات کی شہرت کچھ ایسی تھی کہ آنے والے مؤرخین آنکھیں بند کر کے ان کا تتبع کرتے گئے۔

تحسین کے بارے میں ہم عصر تذکروں میں کوئی زیادہ مواد نہیں ملتا بلکہ معاصرین کی معلومات کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۸۰۱ء میں سرورؔ نے "تذکرہ سرور" میں تحسین کے نام کو دو حصّوں میں تقسیم کر کے دو جداگانہ اشخاص قرار دے دیا۔ ایک منشی حسین عطا خاں ساکن اٹاوہ ہے اور دوسرا امیر محمد حسین خاں مرصع رقم لکھنو میں رہائش پذیر ہے حالانکہ یہ ایک ہی شخص ہے پورا نام یوں ہے: میر محمد حسین عطا خاں تحسینؔ ولد محمد باقر خاں شوقؔ۔

تحسین نے وجہ تالیف دیباچہ میں بیان کی ہے جس کا ذکر اس سے قبل مولوی عبد الحق کے اقتباس میں ہو چکا ہے اس لئے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں البتہ جنرل سمتھ کے سلسلہ میں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ سید سجاد کے بموجب اس وقت ہندوستان میں دو سمتھ ملتے ہیں۔ ایک جنرل جوزف سمتھ (متوفی یکم ستمبر ۱۷۹۰ء) تھا اور دوسرا جنرل رچرڈ سمتھ تھا سید سجاد کی تحقیق کی رد سے یہ مؤخر الذکر رچرڈ سمتھ تھا جس کی معیت میں تحسین نے سفر کیا۔ یہ جنرل تھا اور اس کے اپنے ایک مراسلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زیر کمان پیادے کے ۳۴ دستے ہوتے تھے۔ ۲۰ نومبر ۱۷۶۸ء کو اسے جنرل بنایا گیا تھا جس سفر کا تحسین نے ذکر کیا ہے وہ غالباً الہ آباد سے کلکتہ تک کا تھا اور جنوری تا ستمبر ۱۷۶۸ء جاری رہا۔ جنرل سمتھ غالباً ۱۷۶۹ء کے اواخر میں ملازمت سے ریٹائرڈ ہو کر ہندوستان سے رخصت ہو گئے۔

اس کا قوی امکان ہے کہ تحسین نے ۱۷۶۸ء کے اوائل میں دریائے گنگا میں کشتی پر جنرل سمتھ کی معیت میں سفر کے دوران ہی نوطرز مرصع لکھنی شروع کر کے ۱۷۶۹ء میں جبکہ جنرل سمتھ نے ہندوستان کو خیرباد کہا، اسے ختم کر لیا ہو بلکہ سید سجاد تو اس امر پر بھی زور دیتے ہیں کہ اس کے ابتدائی حصّے ۱۹ ستمبر ۱۷۶۸ء تک ضبطِ تحریر میں لائے جا چکے تھے یہ اختتام سفر کی تاریخ ہے۔

تحسین انگریزوں کے قابلِ اعتماد ملازم تھے۔ غلام علی خاں نے فارسی میں "عماد السادات" (۱۸۰۸ء) شاہانِ اودھ کے حالات قلم بند کئے ہیں۔ اس کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تحسین اس وقت (۱۷۶۰ء) غالباً کیپٹن ہارپر (HARPER) کے ساتھ تھے۔ اس کیپٹن نے شجاع الدولہ کا ایک مکتوب بنام شیخ حیدر نایک پکڑا تو اس کا مضمون سمجھنے کے لئے تحسین سے رجوع کیا گیا تھا اسی طرح جب جنرل سمتھ نے ہندوستان کو خیرباد کہا تو تحسین کو پٹنہ میں وکیل نظامت لگوا گیا لیکن اس

عہدہ سے معزولی کے بعد وہ فیض آباد میں شجاع الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ بہت اچھے شاعر، مرثیہ گو، خطیب اور خوش نویس تھے (گارساں دتاسی کے بقول سودا سے بہت متاثر تھے) اس لئے جلد ہی شجاع الدولہ کے معتمد ہو گئے۔ کسی محفل میں شجاع الدولہ کو قصہ سنایا جسے سن کر شجاع الدولہ بہت محظوظ ہوا۔ اس کی خواہش پر اس قصہ کو لکھنا شروع کیا۔ کچھ کام تو جنرل اسمتھ کے وقت ہی میں ہو چکا تھا باقی اب کر لیا لیکن داستان مکمل ہوئی تو ۱۷۷۵ء میں شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد آصف الدولہ نے بھی تحسین کی قدر دانی کی چنانچہ اسی داستان کے دیباچہ میں آصف الدولہ کی تعریف میں چند جملوں اور اس کی مدح میں ایک قصیدہ کے اضافہ سے ''نوطرزِ مرصع'' ۱۷۷۶ء میں بادشاہ کے حضور پیش کی گئی۔

سید سجاد کے بموجب ۱۸۴۶ء میں ایک انگریز افسر کی زیرِ نگرانی بمبئی میں ''نوطرزِ مرصع'' پہلی مرتبہ طبع ہوئی۔ اس ایڈیشن پر اس کا نام ''انشائے نوطرزِ مرصع'' درج ہے۔ اس کے نام کے ضمن میں گارساں دتاسی کو بھی اشتباہ ہوا چنانچہ اس نے اپنے ایک خطبہ میں اسے ''گلدستۂ داستان'' کہا۔ دراصل یہ تحسین نے ہی اپنے دیباچہ میں لکھا تھا لیکن اس نے اپنے رنگین اسلوب میں اسے استعارۃً گلدستۂ داستان کہا تھا۔ البتہ یہ وجہ سمجھ میں نہ آسکی کہ بعد میں اس کا نام محض نوطرزِ مرصع کیسے رہ گیا شاید اس کا باعث گل کرسٹ کی تحریر ہو کیونکہ گل کرسٹ نے ہی پہلی مرتبہ باغ و بہار میں اسے صرف ''نوطرزِ مرصع'' لکھا تھا۔ اسی طرح باغ و بہار کے سرورق پر بھی اسے نوطرزِ مرصع ہی لکھا گیا اور اب یہ اسی نام سے مشہور ہے۔

نوطرزِ مرصع کی عبارت فسانۂ عجائب کے مقابلہ میں خاصی سلیس ہے لیکن باغ و بہار کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ کیونکہ قصہ بھی طبع زاد نہیں اس لئے صرف اس کی زبان پر بات ہو سکتی ہے لیکن اس میں نہ تو فن کارانہ اپج ہے اور نہ اس کے اسلوب میں تازگی، بیان شگفتگی سے عاری ہے اور قدم قدم پر آورد اور تصنع کا احساس ہوتا ہے۔ دیباچہ کی چند سطریں بطورِ مثال پیش ہیں:

> ''مضمون داستان بہارستان کے تئیں بھی بیچ عبارتِ رنگین زبان ہندی کے لکھا چاہیئے کیونکہ سلف میں کوئی شخص موجد اس ایجاد تازہ کا نہیں ہوا ہے اور یہ کر جو کوئی حوصلہ سیکھنے زبان اردوئے معلیٰ کا رکھتا ہو مطالعہ اس گلدستۂ بہار بن کے بے ہوش و شعورِ کلام کا حاصل کرے۔ اسطے علم مح...

لسانی زبان ہندوستان کے بیچ حق آدمی بیرونِ جات کے خداوکندہ ناتراش کے تئیں ہے۔"

اسی اندازِ تحریر کی بنا پر مولوی عبدالحق کو "مقدمہ" میں یہ کہنا پڑا :

"نوطرزِ مرصّع" کی عبارت نہایت رنگین اور سرتاپا تشبیہات و استعارات سے مملو ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات پڑھتے پڑھتے جی متلانے لگتا ہے۔"

تحسین کیونکہ شعوری طور سے حسنِ بیان کی طرف توجہ دیتے ہیں اس لئے بیشتر مواقع پر OVER ہوگئے ہیں۔ تحسین محض زبان داں ہیں جب کہ میر امن خالقِ زبان ہیں اس لئے میر امن کم الفاظ میں ندرتِ ادا سے تاثر کے ساتھ ساتھ جمالیاتی حظ بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ دونوں کے تفصیلی موازنے سے بچتے ہوئے صرف ایک ہی مثال پیش کی جاتی ہے :

نوطرزِ مرصّع میں نصف شب کا منظر یوں ہے :

"جس وقت زلفِ خاتونِ شب کی کمر تک پہنچی اور چشمِ خلائق کی خمار نشۂ غنودگی سے سرمستِ خوابِ غفلت ہوئی ...."

یہی منظر میر امن کے قلم سے یوں بیان ہوا :

"جس وقت آدھی رات اِدھر اور آدھی رات اُدھر ہوئی"

اب اگر گل کرسٹ نے اسے نصاب کے لئے ناموزوں قرار دے کر میر امن سے نیا ترجمہ کرایا تو کچھ غلط کام نہ کیا۔

ایک اور "نوطرزِ مرصّع"

تحسین کے علاوہ ایک "نوطرزِ مرصّع" محمد عوض خاں زرّیں کی بھی ہے، اس کی صحیح تاریخِ اشاعت کے بارے میں ابھی تک ناکافی شواہد ہیں اس لئے اس ضمن میں قطعیت سے کوئی بات نہیں کی جا سکتی۔ وقار عظیم کے خیال میں یہ تحسین کی نوطرزِ مرصّع سے پچیس چھبیس برس بعد لکھی گئی۔ گویا باغ و بہار اور یہ دونوں ایک ہی سال میں مکمل ہوئیں، کیونکہ عوض نے بھی اس کا تاریخی نام "باغ و بہار" نکالا۔ اس کے بقول :

منا کر یہ گلدستۂ روزگار ۔۔۔ لکھی اس کی تاریخ باغ و بہار

یہ ۔۔ میر امن کہتے ہیں :

کردسیراب اس کی تم رات دن
کہ ہے نام و تاریخ "باغ و بہار"

عوض کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلے فارسی میں قلم بند کی گئی اور بعد میں "کلامِ زبانِ ہندی میں انتظام پائی" عوض کے بقول :۔

"اس خاکپائے درویشانِ حق بیں، محمد عوض خاں زریں نے قصہ چار درویش زبان فارسی میں ترتیب دیا اور عبارت شگفتہ سے گلدستہ مجالس کیا۔ راجہ صاحب سراپا علم تمکین راجا دام دین کہ اس عالی منش کے برادر بزرگ خداوند عدل ود: راجہ ستیل پرشاد اور برادر میانہ فیاض زمانہ راجہ بھوانی پرشاد ادام اللہ اقبالہم ہیں، اس نحیف کی تصنیف مطالعہ فرماتے اور حظ وافر اٹھاتے۔ ایک روز فرمایا کہ اگر کلام زبانِ ہندی میں انتظام پائے سامع کو بہ سہولت سرور آئے۔ میں نے خوشنودیٔ آقا کو بہبودی دنیا و عقبیٰ جان کر سررشتہ ادب کو ہاتھ سے نہ دیا اور زبانِ اُردو میں قلم بند کیا۔"

باغ و بہار اور طرزِ مرصع کے مقابلہ میں زریں کی کتاب خاصی مختصر ہے۔ بعض ضمنی قصے حذف کر دیئے ہیں، گو عبارت سادہ ہے لیکن یہ سادگی ادبی حسن کے جوہر سے عاری ہے۔ بات مختصر کرنے کی دھن میں اسلوب کو بے مزہ بنا دیا۔ سطورِ بالا میں تحسین اور میر امن کی عبارتوں کے موازنے کے لئے کہانی کا جو منظر منتخب کیا گیا تھا زریں سے تقابل کے لئے بھی وہی پیش کیا جاتا ہے۔ زریں نے نصف شب کی کیفیت نصف جملے میں پوری بیان کر دی:۔

"جب کہ زلفِ شب کمر تک پہنچی"

اپنے غلط نام ("نو طرزِ مرصع") تاریخی نام ("باغ و بہار") واقعات کی قطع و برید اور حسنِ ادا سے عاری اسلوب کی بنا پر محمد عوض خاں زریں کی یہ تصنیف تاریخِ ادب میں تو کوئی انفرادی مقام نہ پیدا کر سکی، البتہ ناموں کی یکسانیت کے باعث ادب کا طالب علم بعض اوقات الجھن میں ضرور پڑ جاتا ہے۔

باغ و بہار کے ماخذات

شیرانی کے محولا بالا مقالہ سے چہار درویش کے قدیم ترین فارسی نسخہ کی تلاش

بھی شروع ہوتی ہے حافظ شیرانی کے پاس حکیم محمد علی المخاطب بہ معصوم علی خاں کا تحریر کردہ فارسی مخطوطہ تھا اس میں امیر خسرو والی روایت درج نہیں بلکہ مصنف کے بقول یہ ہندی سے فارسی میں منتقل کی گئی ہے۔ حکیم محمد علی محمد شاہ (۱۷۱۹-۱۷۴۸ء) کے عہد میں تھا۔ اس نے ایک تقریب میں یہ قصہ بادشاہ کے گوش گزار کیا۔ بادشاہ نے اتنا پسند کیا کہ اسے فارسی میں لکھنے کی تلقین کی، سو حکم شاہ یہ ہندی سے فارسی میں لکھا گیا۔ یہ قصہ جو نسبتاً مختصر ہے بلاعنوان ہے البتہ خاتمہ کتاب پر کاتب نے یہ عبارت لکھی ہے:

"تمت حکایات عجیب و غریب بتاریخ ۱۴ شب شوال سنہ ۱۵[1]
محمد شاہی الراقم عبدالکریم۔

نوشتہ بماند سیہ بر سفید
نویسندرا نیست فردا امید" [2]

حافظ شیرانی نے اس قصہ کے بلاعنوان ہونے پر تعجب کرتے ہوئے اس امکان کا اظہار کیا ہے:

"کوئی تعجب نہیں اگر ابتدا میں چہار درویش کا یہی نام ہو" [2]

اس قصہ کے بارے میں ان کی تنقیدی رائے درج ذیل ہے:

"اگرچہ محمد علی کا یہ متن اس داستان کے اکثر مطالب و دیگر خدوخال تمام و کمال پیش کر رہا ہے تاہم طبع شدہ متن کے مقابلہ میں بہت مختصر ہے نہ اس کی زبان میں وہ شگفتگی و برجستگی ہے جو مطبوعہ متن میں ملاحظہ کی جاتی ہے۔ عبارت اکثر مختصر، سادہ اور عاری ہے حسنِ بیان کی بجائے بیانِ واقعات پر توجہ مصروف ہے۔ داستانی واقعات کے سلسلہ میں بعض موقعوں پر اس میں اور دوسری تالیفوں میں کسی قدر فرق ہے لیکن خواجہ سگ پرست میں یہ فرق بہت نمایاں ہو جاتا ہے" [2]

تحقیق کی دنیا بھی ثبات ایک تغیر کو ہے۔ کے اصول کی زندہ تصویر نظر آتی ہے کیونکہ کسی

---

[1] سنہ ۱۵ محمد شاہی = ۱۷۳۳ء

[2] شیرانی ص ص: ۴۳

امر میں کسی کی تحقیق کو بھی حرفِ آخر قرار دینا ناممکن ہوتا ہے۔ نئے شواہد اور نئی معلومات سے دائرہ تحقیق ہر دم پھیلتا رہتا ہے۔ اب شیرانی کے نسخے سے بھی قدیم تر نسخہ کا سراغ لگایا جاچکا ہے چنانچہ ڈاکٹر گیان چند جین اپنے تحقیقی مقالہ "اُردو کی نثری داستانیں" میں حافظ شیرانی کی تحقیق کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"یہ دعویٰ نیا نہیں ہے۔ برٹش میوزیم فارسی مخطوطات کے فہرست نگار ڈاکٹر چارلس ریو (RIEU) کے مطابق سر ولیم اوسلے نے اپنی فہرست کے ۴۱۷ میں محمد علی ہی کو چہار درویش کا مصنّف قرار دیا ہے۔ اوسلے انیسویں صدی کے مشہور مستشرق ہیں۔ ان کی فہرست دستیاب نہ ہوسکی لیکن محمد علی کا نسخہ چہار درویش کا قدیم ترین نسخہ نہیں ہے۔

"چہار درویش" کا سب سے پرانا فارسی مخطوطہ مسلم یونیورسٹی لائبریری علی گڑھ کے ذخیرہ حبیب گنج میں ہے۔ یہ ۵ رجب سنہ عہد بادشاہ جہاندار شاہ بہادر غازی میں یعنی (۱۲ء ۱۷، ۱۱۲۴ھ) میں تحریر کیا گیا۔ اس میں بادشاہ کا نام زرین کلاہ سلیمان دیا ہے۔ آذربائیجانی جوان کے واقعات خواجہ ہی کی سرگزشت میں کتاب کا نام کہیں درج نہیں۔ یہ نسخہ قصّہ کی ابتدائی یا مختصر صورت میں۔ ۳۱۰ ورق یعنی ۶۲۰ صفحات پر پھیلا ہے جس میں قصّہ پوری تفصیلات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

دوسرا قابلِ ذکر نسخہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ (فہرست، حصہ اوّل ۴۴۳) کا ہے یہ (۱۷۲۸ء، ۱۱۴۱ھ) میں لکھا گیا ہے۔۔۔ یہ نسخہ شیرانی کے نسخے سے ۵ سال قبل کا ہے۔۔۔ علی گڑھ کا مفصّل نسخہ محمد علی کے ۲۱ سال قبل کا ہے اور آکسفورڈ کا نسخہ ۵ سال قبل کا۔ ان نسخوں سے یہ قطعی طور پر طے ہو جاتا ہے کہ محمد علی معصوم قصہ چہار درویش کا مصنّف نہیں مؤلف ہے۔" [1]

غالباً اسی نسخہ کی بنیاد پر ڈاکٹر اعجاز حسین نے بھی یہ دعویٰ کیا۔

---

[1] ڈاکٹر گیان چند جین: "اردو کی نثری داستانیں" (طبع دوم) ص: ۹۹-۱۰۰

"ایسا نسخہ بھی فارسی زبان میں لکھا ہوا مل گیا ہے جو معصوم علی خاں کے نسخے سے پانچ برس پہلے کا ہے۔ معصوم علی خاں نے اپنی کتاب ۱۷۲۳ء میں تیار کی اور یہ نسخہ ۱۷۲۸ء کا ہے۔" [1]

باغ و بہار کے قدیم ترین نسخہ کی اس بحث سے ہٹ کر دیکھیں تو بعض اور اصحاب کے نام بھی زیبِ داستان کے طور پر آتے ہیں مثلاً شیرانی ہی نے مصحفی کے حوالہ سے انجب کا نام لیا ہے مصحفی نے اپنے تذکرہ "عقدِ ثریا" (۱۸۰۱ء) میں انجب کے ضمن میں لکھا کہ بدیع العصر حاجی ربیع انجب کی تصنیفات ایک اونٹ پر لادی جا سکتی تھیں یہ چوری ہو گئیں، ان میں ایک تصنیف قصہ چہار درویش بھی تھی۔ انجب اندلسی تھا بچپن اور جوانی اصفہان میں گزار کر دہلی وارد ہوا۔ مصحفی نے فارسی نثر میں یہ قصہ خود دیکھا تھا۔ کلیم نرائن رند برادر بینی نرائن جہاں نے اسے نظم اور نثر دونوں میں لکھا۔ اب یہ تینوں کتابیں ناپید ہیں۔

باغ و بہار کی مقبولیت

میر محمد علی شوق اورنگ آبادی نے ۹۹-۱۷۹۷ء میں "چہار درویش" کا دکنی زبان میں "یادگارِ زمانہ" کے نام سے منظوم ترجمہ کیا جو کافی مقبول ثابت ہوا۔ فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے اپنے تذکرہ "تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی" میں شملہ پونوی کی کتاب "باغ و بہار عرف فسانۂ سحر" کے بعض اشعار کا فرانسیسی ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ یہ معلومات بھی مہیا کیں کہ اسے نولکشور نے ۵۷-۱۸۵۶ء میں طبع کیا۔

حال ہی میں شادؔ لکھنوی پیر و مرشد میر تقی میرؔ (وفات ۱۸۱۰ء) کے منتخب کلام کا مجموعہ "دیوان" شیخ حامد حسن نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ اس میں شادؔ کی تصنیفات میں ایک "مثنوی چہار درویش" کا نام بھی درج ہے۔ اس مثنوی کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے یہ معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ "یہ منظوم ترجمہ" مثنوی چہار درویش" کے نام سے ۱۳۱۰ھ، ۱۸۹۲ء میں پہلی بار مطبع نامی کانپور سے چھپا تھا۔ اس میں ۹۰ صفحات ہیں اور ہر صفحہ پر سترہ اشعار ہیں۔ اس میں پورے واقعات

---

[1] ڈاکٹر اعجاز حسین: "ادب اور ادیب"، ص: ۱۵۶۔ ڈاکٹر اعجاز کو نام کے بارے میں مغالطہ ہوا ہے۔ شیرانی نے اس کا نام "حکیم محمد علی خاں المخاطب بہ معصوم علی خاں" لکھا ہے۔

نہیں بلکہ قصے کی تخمیص کر کے ایک خاص مقصد کے لیے منظم کیا گیا ہے جیسا کہ سببِ تالیف کے عنوان سے خود شاعر نے لکھا ہے: —

"کچھ لفظ بھے انتخاب کرنا = تصنیف تھا اک کتاب کرنا"

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے باغ و بہار کے بعض اور منظوم نسخوں کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جہاں تک نظم کا تعلق ہے غالباً سب سے پہلے محمد علی شاگرد اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی نے قصہ چہار درویش کو نظم کیا۔ اس منظوم داستان کا ایک قلمی نسخہ ادارہ ادبیات اُردو حیدر آباد دکن میں محفوظ ہے لیکن ترجمہ کی تاریخ کا پتہ نہیں چلتا چونکہ مترجم کی پیدائش کا سال ۱۱۸۱ھ ہے اس لیے ممکن ہے یہ منظوم ترجمہ ۱۲۱۴ھ سے پہلے وجود میں آگیا ہو ورنہ تاریخی اعتبار سے شوق کے منظوم ترجمے کو پہلا ترجمہ قرار دینا چاہیے۔ ۱۲۱۶ھ میں میر سرشار نے بھی قصہ چہار درویش کو اردو نظم میں لکھا۔۔ سرشار کی زبان بھی شمالی ہند کی اُردو کی طرح سادہ دپرکار ہے۔۔۔ ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ سے قصہ چہار درویش کا ایک اور منظوم ترجمہ سمالہ (SAMALAH) کے نام سے شائع ہوا۔۔۔ ۱۸۷۵ء میں لکھنؤ سے ایک اور منظوم ترجمہ "خریطۂ سرور" غلام محمد خاں خبر کے نام سے طبع ہوا۔[۱]

یہ تو ہندوستان کی بات ہے جہاں کے قارئین کے لیے کردار، ماحول، فضا اور زبان سبھی کچھ مانوس تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ عمر خیام کی رباعیوں کی مانند "باغ و بہار" نے مغربی ذہن کو خاصہ متاثر کیا۔ یہ درست ہے کہ اس کے تراجم کی نصابی حیثیت بھی رہی ہوگی لیکن ہمیشہ ایسا تو نہ ہوگا۔ بہ ذاتِ خود اگر سامانِ کشش نہ رکھتی تو انگریزی کے علاوہ بعض اور یورپی زبانوں میں اس کے تراجم کیوں ہوتے؟

انگریزی تراجم میں پروفیسر ڈنکن فوربس کا نام سرِ فہرست ہے (اس کا تفصیلی ذکر بعد میں ہوگا) ایل ایف سمتھ نے اس کا انگریزی ترجمہ ۱۸۰۳ء میں کلکتہ اور ۱۸۵۱ء میں لندن سے شائع کیا۔ الیٹ وک نے ۱۸۵۲ء اور ۱۸۷۷ء میں ہرٹ فورڈ سے اس کی طباعت کا اہتمام کیا۔

گارساں دتاسی کے بارھویں خطبہ (یکم دسمبر ۱۸۶۲ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ:

"باغ و بہار" کے دو ایڈیشن جو لاطینی رسم خط میں شائع ہوئے

---

[۱] ڈاکٹر فرمان فتح پوری: "اردو کی منظوم داستانیں" ص: ۵۱-۴۴۹

ہیں ہاتھوں ہاتھ بک رہے ہیں ۱۸۳۶ء میں ایک پرتگالی پی ایس ڈی روزاریو نے اس کا ایک ایڈیشن ہندوستان کے دارالسلطنت کلکتہ میں طبع کرایا تھا جو نیر ڈیمس نے چارلس ٹریولین کی فرمائش پر باغ و بہار کے اسی ایڈیشن کو تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ دوبارہ طبع کرایا ہے۔ ڈنکن فوربس نے بھی لاطینی رسم خط میں اُردو کے پہلو بہ پہلو اس کا ایک ایڈیشن نکالا ہے۔"

خود گارساں دتاسی نے ۱۸۷۸ء میں اس کا فرانسیسی ترجمہ پیرس سے طبع کرایا کمیونسٹ نظریات کی رو سے داستانیں جاگیردارانہ معاشرہ کے انحطاط پذیر رجحانات کی آئینہ دار ہوتی ہیں چنانچہ ابتدا میں بعض اُردو ناقدین کا رویہ بھی داستانوں کے بارے میں جارحانہ تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سوشلسٹ ممالک میں بھی اس سے دلچسپی لینے والے موجود ہیں چنانچہ ۱۹۶۳ء میں چیکوسلواکیہ میں جان میرک (JAN MAREK) نے اس کا چیک ترجمہ (PRIBEHYCTYR-DRVISU) کے نام سے کیا۔

باغ و بہار کا سنہ اشاعت

میرامن نے قصہ کا "باغ و بہار" تاریخی نام رکھا تھا چنانچہ خاتمہ کتاب میں اس نے یہ تحریر کیا:

"جب یہ کتاب فضل الٰہی سے اختتام کو پہنچی، جی میں آیا کہ اس کا نام بھی ایسا رکھوں کہ اس میں تاریخ نکلے جب حساب کیا تو بارہ سو پندرہ ہجری میں لکھنا شروع کیا تھا۔ باعث عدم فرصت کے بارہ سو سترہ سن کی ابتدا میں انجام ہوئی۔ اس فکر میں کہ دل نے کہا کہ باغ و بہار اچھا نام ہے کہ نام و ہم تاریخ اس میں نکلتی ہے تب میں نے یہی نام رکھا۔۔۔

"تھے سنہ بارہ سو سترہ ورشمار — ہوا جب یہ باغ و بہار
"ہر ہیر اب اس کی تم رات دن — کہ ہے نام و تاریخ "باغ و بہار"

اسی طرح "گنج خوبی" کے دیباچہ میں بھی میرامن نے باغ و بہار کا ذکر کرتے ہوئے یہی لکھا:

"سنہ ایک ہزار دو سو سترہ ہجری مطابق اٹھارہ سو دو کے باغ و بہار کو تمام کر کے اس کو لکھنا شروع کیا۔"

خود مصنف کی تحریر کردہ تاریخ میں شک کی گنجائش نہیں ہو سکتی لیکن محمد عتیق صدیقی کی تالیف "گل کرسٹ اور اس کا عہد" کی اشاعت کے بعد سے اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ ایک سال قبل یعنی ۱۸۰۱ء میں مکمل ہو چکی تھی کیونکہ :-

"بعض ایسی دستاویزی شہادتیں ہم کو ملتی ہیں جن سے گمان ہوتا ہے کہ چہار درویش ۱۸۰۱ء کے اواخر میں مکمل ہو چکی تھی۔ اس معاملہ میں ہمارے سامنے سب سے زیادہ اہم اور واضح بیان گل کرسٹ کا ہے جس کے مطابق ۱۱ر جنوری ۱۸۰۲ء کو چہار درویش ہرکارہ پریس میں فارسی رسم الخط میں چھپ رہی تھی اور اس تاریخ تک اس کے ۵۸ صفحات چھپ چکے تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ۱۸۰۱ء کے اواخر میں کتاب مکمل ہو چکی تھی اور چھاپے خانے کے سپرد کی جا چکی تھی۔ انڈیا آفس کے مخطوطات کی فہرست بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ چہار درویش ۱۸۰۱ء میں تالیف ہو چکی تھی۔ اس فہرست کے مطابق یہ کتاب : . . . :

"۱۲۱۶ ہجری مطابق ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوئی دراصل کتاب کے نام پر اس کا نام بھی چہار درویش رکھا گیا لیکن "باغ و بہار" کے نام سے مشہور ہوئی جو اس کا تاریخی نام ہے۔ پہلے پہل ۱۸۰۳ء میں کلکتے سے شائع ہوئی لیکن اس سے ایک سال قبل اس کا کچھ حصہ گل کرسٹ کے "ہندی مینول" میں شائع ہو چکا تھا :

اس سلسلہ میں ایک امکان کا اظہار کر دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ جنوری ۱۸۰۲ء میں اور کتابوں کے ساتھ ساتھ چہار درویش کی طباعت بھی جب ملتوی کی گئی تو اس وقت میرامن نے چہار درویش کے مسودے پر نظر ثانی کر کے اس کو "باغ و بہار" بنا لیا اور اسی مناسبت سے اس کا سنہ تالیف ۱۲۱۷ ہجری مطابق ۱۸۰۲ عیسوی قرار دیا ہے"

عام دلچسپی کے لئے باغ و بہار کی اولیں اشاعت کے ضمن میں مزید معلومات درج کی جاتی ہیں۔ عتیق صدیقی کے موجب گل کرسٹ نے ۱۱ر جنوری ۱۸۰۲ء کو کتابوں کی اشاعت کے سلسلہ میں کالج کونسل کو جو اعداد و شمار پیش کئے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اشاعت کا تخمینہ ۸۸۰۰ روپے ہے صفحات ۲۳۴ جن میں سے ۵۸ ہرکارہ پریس میں طبع ہو چکے تھے اور تعداد اشاعت ۱۵۰۰ فورٹ ولیم کالج کی کارروائیوں کے ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں یہ چہار درویش

کے نام سے پیش کی گئی اور اسی نام سے اس کے ۱۰۲ صفحات چھپے تھے اور یہی صفحات ۱۸۰۲ء میں گل کرسٹ کی مرتبہ "HINDEE MANUAL" میں شائع ہوئے۔ جب مکمل کتاب "ہندوستانی پریس" کلکتہ سے ۱۸۰۳ء میں پہلی بار طبع ہوئی تو اس کا تاریخی نام "باغ و بہار" ہی نام قرار پایا۔

ڈنکن فوربس اور باغ و بہار

اب اشاعت کی بات شروع ہوئی ہے تو ڈنکن فوربس کا بھی ذکر ہو جائے کہ وہ لندن سے بہت اہتمام سے اس کی طباعت کراتا رہا۔ گو اس نے ہندوستان میں ۱۸۲۳-۲۶ء تک صرف تین برس ہی گزارے لیکن گل کرسٹ کی صحبت نے اس میں اردو زبان و ادب سے جو محبت پیدا کر دی وہ برقرار رہی۔ گل کرسٹ کے ساتھ وہ بطور معاون پروفیسر کام کرتا رہا اور کنگز کالج لندن میں ۱۸۳۷-۶۱ء تک لسانِ شرقیہ کے شعبہ کا پروفیسر رہا۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹن اینڈ آئرلینڈ کا رکن بھی تھا۔ ۱۸۴۶ء میں اس نے "ہندوستانی گرامر" اور ۱۸۴۸ء میں انگریزی ہندوستانی اور ہندوستانی انگریزی لغت مرتب کی۔ ۱۸۳۰ء میں حاتم طائی اور ۱۸۴۶ء میں باغ و بہار کے تراجم کیے۔ اس کے بعد اس نے ۱۸۵۷ء، ۱۸۶۲ء اور ۱۸۷۳ء میں بھی باغ و بہار کی اشاعت کی۔ ڈنکن فوربس کیونکہ بہت احتیاط اور محنت سے کام کرتا تھا اس لئے اس کے مرتبہ نسخے باغ و بہار کی اشاعتی تاریخ میں اہم حیثیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔

۱۸۷۳ء میں باغ و بہار کے چوتھے ایڈیشن کی طباعت ایک اہم سنگِ میل قرار دی جا سکتی ہے۔ ۱۸×۲۲ سائز کے ۲۸۲ صفحات پر مشتمل باغ و بہار خوبصورت ٹائپ میں بہت اہتمام سے شائع کی گئی ہے۔ اس میں فرہنگ کے ۱۲۳ صفحات بھی شامل ہیں جو اس قدر جامع ہے کہ اسے اچھی خاصی لغت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں الفاظ کے تلفظ، تذکیر و تانیث اور تشریحِ معانی کے ساتھ ساتھ متعلقہ زبان کی بھی نشان دہی کر دی گئی ہے۔ ایک مثال پیش ہے:

آبداری ab-a-ri ? د ف. THE BRILLIANCY (OF GEMS); TEMPER (OF STEEL); SHARPNESS; OFFICE OF abdar P

۱۸۸۲ء میں چوتھی اشاعت کے موقع پر ڈنکن فوربس نے طبع اول کے پیش لفظ پر ایک اردو دیباچہ کا اضافہ کیا۔ اس میں اب باغ و بہار کے ساتھ چھپنے والی گل کرسٹ کی مختصر تحریر

ہی شامل نہیں بلکہ اس اہم حقیقت کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ محرّب الاخلاق سمجھے جانے کی بنا پر باغ و بہار کے بعض حصّے حذف بھی کئے گئے تھے۔ اس دیباچہ میں "باغ و بہار" کی نصابی حیثیت پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے۔

تنقیدی اور تحقیقی اہمیت کی بنا پر انگریزی دیباچہ کتاب کے آخر میں درج ہے

قیمت
بارہ روپے

پیش لفظ: طبع اوّل، ۱۸۴۶ء

ہندوستانی زبان میں اب تک ضبطِ تحریر میں لائے گئے تمام ادبی کارناموں میں "باغ و بہار" کی برتری مسلّم اور عالمگیر ہے۔ تقریباً نصف صدی سے کمپنی کے ماتحت عملہ کے اس امتحان کے لئے نصابی کتب کی حیثیت سے۔ اس کی فوقیت برقرار ہے جو برطانوی ہند کی بولیوں میں سب سے زیادہ مفید اور ناگزیر زبان سے واقفیت کے لئے لیا جاتا ہے۔

کئی سال سے آنریبل کورٹ آف ڈائریکٹرز نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ عوام کی زبان سے عدم واقفیت کی بنا پر مختلف ملازمین کو ہندوستانی میں اپنے فرائض کی تکمیل میں کتنی دقت پیش آتی ہوگی، مقامی انتظامیہ کو یہ قطعی ہدایات جاری کر دیں جن کے بموجب تمام ملٹری اور میڈیکل جونیئر آفیسرز کے لئے ہندوستانی میں امتحان پاس کرنا لازم قرار پایا۔ اس ضمن میں حالیہ جنرل آرڈر درج ذیل ہے جس سے ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ میر امن ہی کے الفاظ میں ابھی تک "باغ و بہار" "تر و تازہ" ہے۔

ہندوستانی زبان میں امتحان (ٹیسٹ):

"فورٹ ولیم:۔ ۳۱ مئی ۱۸۴۴ء

جنرل آرڈر مجریہ ۹ جنوری ۱۸۳۷ء کی رو سے ملٹری آفیسرز کے ہندوستانی امتحان کے لئے جو امتحان منظور کیا گیا تھا اسی کو اب افواج کی اطلاع کے لئے دوبارہ مشتہر کیا جا رہا ہے۔

"امیدواروں کے لئے "باغ و بہار" اور "بے تال پچیسی" کا ترجمہ لکتاب خوانی ہے۔ اوّل الذکر فارسی اور مؤخر الذکر دیوناگری رسم الخط میں ہے۔ علاوہ ازیں صاف اور خوش خط فارسی اور دیوناگری رسم الخط میں سادہ اور بیانیہ انداز میں انگریزی سے ہندوستانی میں درست اور قابلِ فہم ترجمہ بھی کرنا ہوگا۔

ہندوستانی میں گفتگو کو بنیادی اہمیت حاصل ہونے کی بنا پر ممتحن حضرات سند تفویض دینے سے قبل امیدوار کی مہارت کا تعین بھی کریں گے۔"

جہاں تک "باغ و بہار" کے مصنف کا اس کے ہندوستانی مترجم میر امن کا تعلق ہے

تو قارئین اس کے خود نوشت حالات کے لئے کتاب کے پیش لفظ سے رجوع کر سکتے ہیں۔ اس کتاب کی نوعیت اور مقصد کلکتہ سے طبع ہونے والے اوّلیں ایڈیشن میں شامل ڈاکٹر گل کرسٹ کی اس تحریر (ولوٹس) سے آشکارا ہے جو بعض مشرقی الفاظ کی املا میں معمولی سی تبدیلی کے ساتھ درج ذیل ہے:

"فارسی میں قصّہ چہار درویش مدّتوں مقبول رہا۔ اسے امیر خسرو[1] نے اپنے دوست اور مُرشد حضرت نظام الدین اولیاؒ کی بیماری کے دوران ان کی تفریحِ طبع کے لئے ۔۔۔ پُرتاثیر زبان میں قلم بند کیا تھا۔ عطا حسین خان نے "نوطرزِ مرصّع" کے عنوان سے اس کا ترجمہ تو کیا لیکن عربی اور فارسی محاورات کی کثرت اور پُر تکلف اسلوب کی بنا پر اس زبان کے نمونہ کی حیثیت سے پسند نہ کیا جا سکا۔ یہ قباحت دور کرنے کے لئے محوّالا بالا ترجمہ سے میر امن دلّی والے نے جو کہ کالج سے وابستہ مقامی فضلائیں سے ہے اس کو قلم بند کیا ہے اور ہندوستانی کے طالب علم پر فوراً ہی یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اُس نے کس خوش اسلوبی سے ریختہ کے محاورہ کی برقراری کے ساتھ ساتھ اسلوب کی سادگی اور زبان کی صفائی کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا جس سے زبان پر اس

---

[1] امیر خسرو ہندوستانی ہونے کے باوجود فارسی شعرا میں بلند پایہ مرتبہ رکھتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے فارسی کے عظیم شاعر نظامی کا تتبع کیا لیکن ان دونوں کے کلام میں شعری محاسن کی بنا پر امتیاز کرنا آسان نہیں۔ انوارِ سہیلی کی بارھویں کتاب میں حسین واعظ نے دونوں شعرا کو یکساں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فصاحت کی اعلیٰ مثالوں کے طور پر دونوں ہی کے اشعار درج کئے ہیں۔ امیر خسرو کا دہلی میں ۱۳۲۵ء میں انتقال ہوا۔

جہاں تک "باغ و بہار" کی بنیاد یعنی قصّہ "چہار درویش" کی اصل کا تعلق ہے تو دکھو الہ پیش لفظ میر امن) مرتب کردہ "نوطرزِ مرصع" کا ایک دیدہ زیب نسخہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن اس پر نہ تو تاریخ طباعت درج تھی اور نہ ہی مقام اشاعت۔ اس کے بارے میں وہ خود زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکا ہے کہ یہ کتاب ہندوستان ہی کی ہے اور بظاہر یہ مقامی علما اور فضلا کے لئے لکھی گئی تھی۔ اس کا اسلوب واقعی پُر تکلف ہے بلکہ مقصدیت کو مجروح کر دینے کی حد تک پُر تکلف! اسے عام ہندوستانی زبان سے وہی تعلق ہے جو ہمایوں نامہ کا ترکی سے۔ دونوں کتابوں ہی کا مطالعہ فارسی سے نابلد حضرات کے لئے تکلہ کندن و کاہ بر آوردن والی بات ثابت ہوتی ہے۔

کی قدرت عیاں ہو جاتی ہے۔

کتاب میں مشرقی اداب و روایات کی دل خوش کن تفاصیل ملتی ہیں اور پھر کوثر و تسنیم میں دھلی زبان اسے ایک حد تک اصل تصنیف ہی بنا دیتی ہے اسی بنا پر ہندوستان کی اس مقبول زبان میں حالیہ شائع شدہ کتابوں میں یہ ایک کار آمد اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔"

موجودہ طباعت کے ضمن میں چند معروضات ہیں۔ اس کا متن ۱۸۰۳ء میں کلکتہ میں طبع ہونے والے ایڈیشن پر مشتمل ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دو اور مسودات سے بھی اس کا موازنہ کیا۔ ان میں سے ایک جو میرے پاس ہی ہے وہ خود آنجہانی ڈاکٹر گل کرسٹ کی ملکیت تھا اور یہ قرینِ قیاس ہے کہ یہ میر امن کا تحریر کردہ وہی مسودہ ہے جو اس نے اس عالم ڈاکٹر کی خدمت میں بغرض منظوری پیش کیا ہوگا۔ دوسرا مسودہ کمپنی کی آنریبل سول سروس سے متعلق مسٹر رومر (ROMER) کی ملکیت تھا۔ یہ میر امن کا شاگرد بھی تھا یہ نسخہ جزوی طور پر مسٹر رومر اور خود مصنف کی زیر نگرانی ضبط تحریر میں لایا گیا تھا۔ اس لئے اکثر مواقع پر میں نے مطبوعہ متن پر ان مسودات کو ترجیح دی ہے۔

میں نے پورے طور سے حروفِ علت کا التزام روا رکھا ہے، وہ اس لئے کہ ان کی عدم موجودگی میں محتاط سے محتاط قاری بھی تلفظ کی اغلاط کا مرتکب ہو سکتا ہے اسی طرح اعراب کا بھی۔ کسی قدیم لاطینی کلاسیک کی تدوین ہی کی مانند، خصوصی خیال رکھا گیا ہے۔ یہ بجا کہ کلکتہ کی طباعتوں میں کسی حد تک اعراب بھی ملتے ہیں لیکن یہ بے فائدہ ہیں کیونکہ بعض اوقات تو کسی فقرہ کے درمیان ہی میں وقفہ (فل سٹاپ) آجاتا ہے جب کہ بسا اوقات بغیر کسی وقفہ کے کئی کئی فقرات چلے آتے ہیں اس ضمن میں میں نے بہت زیادہ تبدیلیاں کی ہیں جو میری دانست میں تو افادہ بخش ہی ہیں ہو سکتا ہے بعض رجعت پسند حضرات یہ اعتراض کریں کہ جب خود مقامی ادیب ہی اپنے مسودات میں اعراب و اوقاف کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تو ہمیں ایسا کرنے کا کیا فائدہ؟ میرا جواب مبتدیوں کے لئے تحصیلِ زبان میں سہولت پیدا کرنے میں ہی اس کا افادہ مضمر ہے، جب وہ زبان پر عبور حاصل کر لیں گے تو پھر وہ مقامی مسودات کے مطالعہ میں کسی طرح کی دشواری نہ پائیں گے خواہ وہ تحریر میں اعراب ہی نہیں بلکہ حروفِ علت اور دیگر تمام امتیازی نشانات سے ہی عاری کیوں نہ ہوں۔ ویسے ایک غیر ضروری اور بے انتہا تکلیف دہ دقت کے رفع کر دینے

کے باوجود بھی طلبا کی ذہانت کی جانچ کے لئے "باغ و بہار" کی صورت میں ایک وسیع میدان موجود ہے۔ موجودہ ایڈیشن میں فرہنگ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ میرا یہ دعویٰ کہ سرے سے کوئی مشکل لفظ بچا ہی نہیں یقیناً "عذر" پر مبنی ہوگا لیکن اس ضمن میں کی گئی محنت سے مجھے فرہنگ میں شمولیت سے رہ جانے والے الفاظ کی تعداد کم ہونے کی توقع یقیناً ہے۔

آخر میں یہ واضح کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی نے کتاب کی ترتیب کے تمام اخراجات کی کفالت کی ہے، ان روشن ضمیر حکمرانوں کا مقصد محض جلبِ زر نہیں اس لئے یہ کتاب عوام کو نفع کے بغیر قیمتِ خرچ پر مل رہی ہے اور ان لاتعداد حضرات کے لئے یہ ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں جو ہندوستان میں فوجی اور معالجاتی آسامیوں کے لئے تیاری کر رہے ہیں۔ اب تک تو اس کتاب کی مہنگائی (دس بارہ پونڈ کے قریب) تحصیلِ زبان میں بہت بڑی رکاوٹ رہی ہے لیکن اب تو یہ کتاب ہندوستان میں ہر نوع کی ملازمت کے خواہاں تمام افراد کی حیثیت کے مطابق ان کی دسترس میں ہے تاکہ وہ اپنے فرائض کی بطریقِ احسن انجام دہی کے لئے ہندوستانی زبان کی ارزاں ترین اور بہترین کتاب حاصل کر کے ہر وقت مطالعہ سے اپنی تیاری کر سکیں، جس کتاب میں سے بالآخر انہیں امتحان پاس کرنا ہے۔ یہی ہے وہ کتاب "باغ و بہار!"

طبع چہارم : لندن، ۱۸۶۰ء

طبع چہارم کے لئے رائل ایشیاٹیک سوسائٹی کے ایک مسودہ سے موازنۂ متن کے ساتھ ساتھ خصوصی جائزہ کے بعد اعراب و اوقاف میں بعض تبدیلیوں سے یہ کتاب پہلے کی نسبت زیادہ کارآمد ہو گئی ہے، فرہنگ میں جن الفاظ کی کمی کھٹکی وہ بھی پوری کر دی گئی ہے۔ یوں ایسے کام کی نوعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ توقع بجا ہے کہ موجودہ صورت میں اس میں کم سے کم خامیاں ملیں گی۔

اس موقع پر یہ امر واضح رہے کہ میر امن کے اصل متن اور بعد ازاں اشاعت پذیر ہونے والے تمام نسخوں میں کچھ ایسے قابلِ اعتراض حصّے بھی تھے جو مشرقی تحریروں میں عموماً پائے جاتے ہیں چنانچہ میں نے ایسے حصّوں کو کیپٹن ڈبلیو این لیس (CAP T. W. N. LEES) ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن اور پرنسپل کلکتہ یونیورسٹی کے ایما پر یا تو حذف کر دیا یا قدرے مختلف الفاظ

میں بیان کردیا۔ موصوف کی توقیر بخش چٹھی درج ذیل ہے:

کالج آف فورٹ ولیم،

۸؍ اگست ۱۸۵۹ء

مائی ڈیئر سر،

کلکتہ یونیورسٹی میں داخلہ کے امتحان کے لئے "باغ و بہار" کی نصابی کتب میں شمولیت کے باعث اردو کی تدریس والے تمام سرکاری کالجوں اور سکولوں میں یہ داخلِ نصاب ہے۔ سرکاری سکولوں کی تمام نصابی کتب کا قابلِ اعتراض حصوں سے پاک ہونا کیونکہ پسندیدہ تصور کیا جاتا ہے اس لئے میں یہ استدعا کرنے پر مجبور ہوں کہ اگر آپ پسند کریں تو آپ اپنی اس نفیس کتاب کی آئندہ طباعتوں سے ایسے تمام حصے حذف کردیں جو اساتذہ کے لئے باعثِ شرم اور طلباء کے لئے مخرب الاخلاق بن سکتے ہوں۔

میں ان چند سطور کا خاتمہ آپ کی اس مساعی کے لئے اظہارِ تشکر کے بغیر نہیں کرسکتا کہ آپ تن دہی اور مفید محنت سے کام لیتے ہوئے مشرقی علوم کے طلبا کی سہولت کے لئے احتیاط سے مرتب شدہ اور محنت سے طبع کردہ نصابی کتب اور سودمند قواعد اور لغات مہیا کرتے رہتے ہیں۔

آپ کا صادق

(دستخط) ڈبلیو۔ این۔ لیس

ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن۔ بنگال۔

بخدمت:-

پروفیسر فاربس ایل۔ ایل۔ ڈی۔

باغ و بہار، تنقید کے آئینہ میں!

ہماری داستانوں میں کہانی کہنے کا ایک مخصوص انداز ہے جسے کم و بیش ہر داستان نگار بقدرِ ہمت اور دست نبھانے کی سعی کرتا ہے۔ داستانوں کی مخصوص فضا نے داستانی تکنیک کو جنم دیا۔ اس ضمن میں داستان کی طوالت یا اختصار سے کچھ اتنا فرق نہیں پڑتا بلکہ ایک لحاظ سے تو داستان کی

طوالت بھی اس کی مخصوص تکنیک کی مرہونِ منت قرار دی جا سکتی ہے۔ داستان میں ضمنی واقعات اور قصہ در قصہ کی گنجائش ہوتی ہے اس لیے واقعات کی کمی بیشی سے داستان نگار حسبِ منشا اسے طویل یا مختصر بنا سکتا ہے۔ داستان کی مخصوص فضا اور قصہ کے تار و پود کی تشکیل میں ضمنی واقعات اور قصہ در قصہ کیونکہ جائز حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے داستان کی طوالت مصنوعی نہیں معلوم ہوتی۔ یہی انداز اگر ناول میں روا رکھا جائے تو لسّی میں پانی ملانے والی بات بن جاتی ہے۔

داستان کی تکنیک کا جائزہ لیتے وقت یہ اساسی حقیقت ملحوظ رکھنی بہت ضروری ہے کہ اس میں واقعات کو ہر عنصر پر فوقیت حاصل ہے۔ داستان وہ عمارت ہے جس کی بنیاد، ڈھانچہ اور رنگ و روغن غرض سبھی کچھ واقعات ہیں۔ داستان نگار جس زندگی کی تصویر دکھاتا ہے اس کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اس لئے اسے حقیقت نگاری یا واقعیت کی کوئی ضرورت نہیں وہ تو واقعات سے تحیر کی ایک فضا تخلیق کرتا ہے اور اس تحیر کی برقراری میں وہ کس حد تک کامیاب رہتا ہے، اسی پر داستان کی کامیابی کا انحصار ہے۔ اس تحیر کی برقراری کے لئے جہاں وہ مافوق الفطرت عناصر، عجیب و غریب مہمات ، عجیب الخلقت کرداروں، ماورائے عقل اشیائ اور ناطق پرندوں اور حیوانات کا سہارا لیتا ہے وہاں وہ قصہ در قصہ اور ضمنی واقعات سے تحیر کا ایسا تانا بانا بنتا ہے کہ قاری کا دل واقعات کی تال پر دھڑکتا ہے۔

باغ و بہار کا تیکنیکی مطالعہ

"باغ و بہار" کے تیکنیکی مطالعہ کے ضمن میں یہ امر ملحوظ رہے کہ چار درویشوں کی آپ بیتیوں کے روپ میں یہ دراصل چار جداگانہ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ہر کہانی اپنی جگہ پر مکمل ہی نہیں بلکہ اپنی تکمیل کے لئے دوسری کہانی سے بے نیاز بھی ہے۔ ان چاروں کہانیوں کو چار ہم مرکز دائروں سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔ چاروں دائرے اپنے محیط کے لحاظ سے انفرادیت رکھتے ہیں لیکن ایک مرکز سے وابستگی کی بنا پر وہ ایک دوسرے سے قطعی طور پر لاتعلق بھی نہیں سمجھے جا سکتے۔ یہ مرکز ان درویشوں کا وطن یا سماجی مرتبہ نہیں، وہ کسی مخصوص معاشرے کے نمائندہ نہیں ہیں۔ گو محبت ان سب کی کمزوری ہے لیکن داستان کی تیکنیک کے نقطۂ نظر سے اسے مرکز نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ہر چند کہ یہ جذبہ تمام داستانوں کی روح ہے۔ ان چاروں دائروں کا مرکز شاہِ روم آزاد بخت کی ذات ہے۔ داستان کے آغاز میں جب وہ اولادِ نرینہ نہ ہونے کے غم سے عالمِ پریشانی میں "ایک رات کو موتے جھوٹے

کپڑے پہن کر،، ایک گورستان میں جا پہنچتا ہے اور :

"دیکھا تو چار فقیر بے نوا، کفنیاں گلے میں ڈالے اور سر زانو پر دھرے، عالم بے ہوشی میں خاموش بیٹھے ہیں اور ان کا یہ عالم ہے جیسے کوئی مسافر اپنے ملک اور قوم سے بچھڑ کر، بے کسی اور مفلسی کے رنج و غم میں گرفتار ہو کر حیران رہ جاتا ہے اسی طرح سے یہ چاروں نقش دیوار ہو رہے ہیں اور ایک چراغ پتھر پر دھرا ٹمٹما رہا ہے۔ ہر گز ہوا اس کو نہیں لگتی گویا فانوس اس کی آسمان بنا ہے کہ بے خطرے جلتا ہے"

اور یہی چار فقیر بے نوا اپنی آپ بیتیاں سناتے ہیں۔ چاروں اس پرندے کی مانند ہیں جو بلند سے بلند تر فضاؤں میں محوِ پرواز رہتا ہے لیکن بالآخر واپس اپنے آشیانہ پر آتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک گذشتہ واقعات کے اعادہ سے ماضی کی سیر ہی نہیں کرتا بلکہ اس امر کی بھی وضاحت کرتا ہے کہ جب اس نے حالات سے نا امید ہو کر خودکشی کا ارادہ کیا تو اسے یہاں پہنچنے کے بعد گوہر مقصود کے حصول کی بشارت بھی دی گئی تھی۔ گو پہلے دو درویش قبرستان میں اور باقی دو بادشاہ کے محل میں اپنی اپنی کہانی سناتے ہیں لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کیونکہ بادشاہ ہی ان چاروں کے لئے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے، شاید اس لئے چوتھے درویش کی کہانی کا اختتام یوں ہوا:

"ایک روز پہاڑ پر جا کر میں نے بھی ارادہ کیا کہ اپنے تئیں گرا کر ضائع کروں جوں مستعد گرنے کا ہوا، وہی سوار صاحب ذوالفقار برقع پوش آ پہنچا اور بولا کہ کیوں جان کھوتا ہے، آدمی پر دکھ درد سب ہوتا ہے اب تیرے بُرے دن گئے اور بھلے دن آئے، حلب روم کو جا، تین شخص ایسے ہی آگے گئے ہیں ان سے ملاقات کر اور وہاں کے سلطان سے مل، تم پانچوں کا مطلب ایک ہی جگہ میں ملے گا"

اور وہی ہوتا ہے ایک مرکز پر باہم یکجا ہونے سے پانچوں کی مرادیں بر آئیں۔

طوالت کی بنا پر بعض اوقات داستانیں شتر بے مہار معلوم ہوتی ہیں لیکن باغ و بہار اس عیب سے پاک ہے۔ یہی نہیں بلکہ تیکنیک کے لحاظ سے اسے اُردو کی بے مثال داستان قرار دیا جا سکتا ہے۔ واقعات کی تشکیل اور چاروں کہانیوں کی ترتیب میں جس فنی مہارت کا ثبوت دیا گیا اسے داستانی تیکنیک میں قابلِ قدر اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ابتدا میں آزاد بخت بادشاہ کا احوال ہے۔ اس کے بعد پہلے اور دوسرے درویش کی کہانیاں۔ پھر آزاد بخت اپنی کہانی سناتا ہے اس کے بعد تیسرے اور چوتھے درویش کی کہانیاں ہیں۔ گو آخر میں آزاد بخت کوئی کہانی تو نہیں سناتا لیکن

اسی کی سعی سے چاروں درویشوں کی مرادیں بر آتی ہیں اس لئے وہی اس حصّہ میں نمایاں رہتا ہے۔ ابتدائیہ اور اختتامیہ مختصر ہیں۔ ان میں کفایت الفاظ کا احساس ہوتا ہے اور یہ بالکل فطری ہے کیونکہ ابتدائیہ میں چاروں درویشوں کے ظہور کے لئے اسٹیج تیار کی جارہی تھی اور اختتامیہ میں کیونکہ سب کی سرگزشتیں سنی جاچکی ہیں اس لئے قاری ان کا انجام جاننے کے لئے بے چین ہے۔ یہ میر امن کے فن کا کمال ہے کہ انہوں نے ابتدائیہ اور اختتامیہ کی طوالت بھی تقریباً برابر ہی رکھی ہے۔ اس سے ابتدائیہ اور اختتامیہ میں ایک طرح کا فنی توازن بھی پیدا ہوگیا۔

چاروں درویش ناکام و ناشاد ہو کر خودکشی کا ارادہ کر لیتے ہیں لیکن حضرت علیؓ کی تلقین پر وہ روم کا رخ کرتے ہیں اس طریقہ سے قاری ہر کہانی کے انجام کے بارے میں مشتاق رہتا ہے اور یوں عام داستان نگاروں کے مقابلہ میں میر امن نے محض ایک کہانی نہیں بلکہ چار کہانیوں کے بارے میں بیک وقت سسپنس پیدا کر کے داستانی تیکنیک میں ایک نیا تجربہ کیا۔

باغ و بہار کے تمام حصّے اپنی انفرادی حیثیت میں اچھے خاصے افسانے ہیں جنہیں ماہرانہ انداز میں ایک سلسلہ میں مربوط کر دیا گیا ہے اور یہ باغ و بہار کی تیکنیک کا اعجاز ہے کہ کسی موقع پر بھی جھول کا احساس نہیں ہوتا۔ میر امن شعوری طور پر طولِ کلام سے احتراز کرتے ہیں اس لئے چاروں درویشوں کی کہانیاں طوالت میں یکساں نہیں ہیں۔ بحیثیت داستان نگار میر امن کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ واقعات کی تفصیلات اور ماحول کی جزئیات میں بھی ہنرِ الفاظ سے بچتے ہیں۔ پہلے درویش کی داستان میں کیونکہ انہوں نے دل کھول کر کھانوں، ملبوسات اسبابِ خانہ داری اور سامانِ تزئین کی تفصیلات بیان کیں اس لئے تکرار سے بچنے کے لئے بعد کی کہانیوں میں وہ قلم روکتے نظر آتے ہیں حتّٰی کہ چوتھے درویش کی کہانی میں کھانوں اور سامان وغیرہ کی کوئی تفصیل درج نہیں کی۔

تیکنیک کے بعد کردار نگاروں کا جائزہ لینے پر یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ ناول کی مانند داستانوں میں زندہ کرداروں کی تخلیق ناممکنات میں سے ہے۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ داستان کی اساس صرف تخیل پر استوار کی جاتی ہے۔ داستان کی دنیا فضا، ماحول، مقامات، واقعات، مہمات، افراد غرض سب کچھ حقیقی دنیا سے ماورا ہوتا ہے اس لئے زرخیز تخیل کا حامل داستان نگار اپنے قارئین سے عقل و استدلال کی بجائے تخیل کی کسوٹی کا طالب ہوتا ہے اور اپنے تخیل سے قاری کے تخیل کو تحریک دیتا ہے اس لئے وہ تنقید نہیں بلکہ

تابید چاہتا ہے۔ اسی تخیل کی فراوانی سے جو طلسماتی فضا جنم لیتی ہے اس میں زمان و مکان کا بُعد کیونکہ ختم ہو جاتا ہے اس لئے ہر شے اپنے اصل حجم اور جسامت سے بڑی یا چھوٹی نظر آتی ہے۔ فطرت نسبتاً زیادہ خوش رنگ یا وحشت ناک نظر آتی ہے۔ اسی طرح مرد زیادہ قد آور جری اور با اخلاق نظر آتے ہیں تو عورتوں کا حسن بے مثال اور شباب لازوال ہوتا ہے۔ داستان کی مخصوص فضا اپنی منطق خود ہی جنم دیتی ہے اس لئے پرندے بولتے ہیں، جن پری آدم زاد سے عشق کرتے ہیں اور آدم زاد ان پر حاوی رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی فضا میں زندہ اور متحرک کرداروں کا دم گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ داستان میں کیونکہ کرداروں کی بجائے واقعات کو اساسی اہمیت دی جاتی ہے اور پھر ان میں دلچسپی اور قاری میں تجسس کی برقراری کے لئے قصہ در قصہ اور ضمنی واقعات اور قصے بھی اصل داستان کے چوکھٹے میں فٹ کر دیئے جاتے ہیں اس لئے ان پیچیدہ واقعات کے الجھے تانے بانے میں کرداروں کی انفرادیت ہر لحاظ سے مجروح ہوتی ہے۔

داستان کے کردار کو کیونکہ محیر العقول کارنامے سرانجام دینے ہوتے ہیں اور اپنے سے بڑھ کر قوی، خوفناک اور ذی اختیار جنوں، بھوتوں، چڑیلوں اور پریوں سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے اس لئے انسانی کوتاہیوں پر غلبہ پانے کے لئے اسے بہت سے لوازمات سے نوازا جاتا ہے چنانچہ بیرونی امداد بلکہ "کمک" کے لئے بزرگ ہستیوں، ناطق پرندوں، نوابوں، تبارتوں اور حسب موقع عاشق ہونے والی پریوں کا سہارا لیا جاتا ہے تو بعض اوقات روپوشی کے لئے سلیمانی ٹوپی، اڑنے کے لئے کھڑاؤں، قالین یا پھر اڑن کھٹولے۔ دفینے دیکھنے کے لئے سرمہ اور یا پھر "زنبیل" کی صورت میں ایک ایسی طلسمی پر اسرار شے دے دی جاتی ہے کہ وہ فانی ہوتے ہوئے بھی لافانی بن کر عملاً ناقابل تسخیر ہو جاتا ہے یوں وہ بشر ہوتے ہوئے بھی فوق البشر بن جاتا ہے وہ فوق الفطرت ہستیوں میں سے تو نہیں لیکن ان امدادی اشیاء کی بنا پر کسی سے بھی کم تر ثابت نہیں ہوتا اور اس لئے وہ سب پر غالب رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ انسان کے علاوہ باقی سب کچھ بن سکتا ہے اس لئے نہ تو اس کی مصیبت پر قاری رنجیدہ ہوتا ہے اور نہ کامرانی پر شادماں!

ثنائیت کی بنا پر داستانی کردار یک رخی تصویروں سے مشابہ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ ہیرو اور ہیروئین میں دولت اور دولت حسن کے ساتھ ساتھ زمانہ بھر کی خوبیاں جمع کر کے مخالفین کا بالکل ہی منہ کالا کر دیا جاتا ہے۔ ادھر غیر ملکی رسوم و رواجات اور طرز بود و ماند سے ناواقفیت کی بنا پر داستان نگار محض غیر ممالک کے نام گنوا کر اپنی دانست میں ماحول کو

دیتا ہے حالانکہ افراد کی نفسیات میں جغرافیائی حالات، نسلی رجحانات اور ملی میلانات سے جنم لینے والے امتیازی اوصاف سے چشم پوشی کے باعث کردارنگاری خام رہتی ہے۔

باغ و بہار کے درویش

داستانی تکنیک سے جنم لینے والی کردارنگاری کی ان بنیادی خامیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے "باغ و بہار" کے مردانہ کرداروں کا تجزیہ کرنے پر ان میں تقریباً یہ تمام خامیاں کسی نہ کسی حد تک موجود نظر آئیں گی۔ داستانی فارمولے کے مطابق تین ہیرو تو شہزادے ہیں لیکن تاجرزادہ بھی ٹھاٹھ باٹھ میں کسی سے کم نہیں لیکن حالت یہ ہے کہ ان سب میں رکھ رکھاؤ، عزتِ نفس اور خودداری کا فقدان ہے۔ شہزادوں والی مکنت اور وقار تو کجا ان میں تو عام امیرزادوں والی خو بو بھی نہیں ملتی۔ اس پر مستزاد ایک خاص طرح کی بے بسی، عاجزی اور خوشامد!

اس لحاظ سے "باغ و بہار" کے یہ شہزادے اُردو داستانوں کے دیگر شہزادوں کے بالکل برعکس ہیں شاید ہی اور کسی داستان کے ہیرو میں ان ایسی مسکینی پائی جاتی ہو۔

اگر باغ و بہار کے ان چاروں درویش عاشقوں کا اُردو غزل اور بالخصوص میر تقی میر کی غزل کے تناظر میں تجزیہ کیا جائے تو ان سب کا کردار غزل کے روائتی عاشق سے کئی امور میں ملتا جلتا نظر آئے گا۔ ان درویشوں ہی کی مانند اُردو غزل کا عاشق بھی ایک خاص طرح کی عاجزی اور مسکینی کا حامل نظر آتا ہے اور محبوب کی کج ادائیوں پر بھی واری صدقے جاتا ہے۔ وہ محبوب اور اس کے ساتھ ساتھ زمانے کے ظلم برداشت کرتا ہے لیکن حرفِ شکایت لب پر نہیں لاتا اور اگر شکایت بھی کی تو نہایت عاجزی اور حلیمی سے۔ زمانے سے برسرِ پیکار ہو کر ماحول پر چھا جانے والی صحت مند جارحیت سے غزل کا روائتی عاشق ناآشنا ہے

اس عمومیت سے قطع نظر میر کی غزلوں سے ابھرنے والے عاشق کا اگر مجموعی لحاظ سے جائزہ لیا جائے تو بعض امور میں تو وہ چونکا دینے والی حد تک ان درویشوں (اور خصوصیت سے پہلے درویش) سے مشابہ دکھائی دیتا ہے۔ میر کے اپنے حالات اور افتادِ طبع سے قطع نظر ان کا عاشق بھی "باغ و بہار" کا پانچواں درویش معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے میر کے شاعرانہ لہجہ کا یوں تجزیہ کیا:

"میر کا لہجہ دردمندوں، مصیبت زدوں، خانقاہی نیاز مندوں اور مبتلاؤں کا ہے

جس کے پیرایوں میں غریبانہ مسکینی، دیہاتی معصومیت، عاشقانہ مجبوری، عاجزانہ کسمپرسی اور معذورانہ مخبوط الحواسی پائی جاتی ہے۔" [1]

کیا یہ درویشوں کے کرداری خصائص نہیں؟

میر کی غزلوں اور "باغ و بہار" میں ایک خاص قسم کی مشابہت ملتی ہے چنانچہ سرسید احمد خان نے اندازِ بیان کے بارے میں اس مشابہت کو محسوس کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ جو مرتبہ میر تقی میرؔ کو اُردو غزل میں حاصل ہے وہی میر امن کو اُردو نثر میں حاصل ہے لیکن درویشوں اور میرؔ کے عاشق میں پائی جانے والی مشابہت پر آج تک دھیان نہ دیا گیا حالانکہ اس مشابہت کا کئی جہات پر مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ [2]

بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ باغ و بہار کے مسکین ہیرو اور درویش عاشق چار جداگانہ ممالک سے تعلق رکھنے کے باوجود بھی اپنی سرشت اور شخصیت کے اعتبار سے ایک ہی سانچے میں ڈھلے معلوم ہوتے ہیں۔ داستان کے آغاز کی وجہ سے پہلا درویش اگر متاثر کر بھی جائے تو تکرارِ تواردِ کی بنا پر چوتھے درویش تک یکسانیت اکتاہٹ پیدا کر دیتی ہے۔

خواجہ سگ پرست ایک اور اہم کردار ہے مگر اس بھلے آدمی میں اتنی بھی سمجھ نہیں کہ بُرے بھلے کی تمیز کر سکے۔ بھائیوں کے بار بار بُرے بلکہ مہلک سلوک کے باوجود بھی یہ ہمیشہ ان کے بہکاوے میں آکر مزید بے وقوف بننے بلکہ مرنے کو تیار ہو جاتا ہے اور جب انتقام پر آتا ہے تو ایسے مکروہ طریقے سے لیتا ہے کہ اس قصہ سے جو اخلاقی درس مقصود ہو گا وہ بھی غارت ہو جاتا ہے۔

مگر باقی درویشوں کی مانند جنس اس کی بھی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ وہ چاروں نوجوان ہیں اس لئے ان کی بات تو ٹھیک ہے لیکن یہ بڈھا اس معاملہ میں ان سے بازی لے جاتا ہے کہ یہ "دو جنسیت" (BI - SEXUALITY) کا حامل ہے۔ اس بنا پر اس کردار کا نفسیاتی تجزیہ بے حد دلچسپ ہو جاتا ہے۔ پہلے پہل اس کا تعارف ایک ہم جنس پرست ہی کی حیثیت سے کرایا جاتا ہے، کیونکہ تیرہ سالہ وزیر زادی کو لڑکے کے بھیس میں دیکھ کر "برجھی عشق کی اس کے سینے میں" گڑ جاتی

---

[1] "نقدِ میر" ص : ۲۱۲

[2] مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو :

"باغ و بہار کے درویش عاشق"، "نگاہ اور نقطے" از سلیم اختر)

ہے اور گویہ "مانند اسے اپنے بیٹے کے جانتا ہے" لیکن اس پر دانت بھی تیز کئے ہے۔ اس کی مفارقت کا سن کر رونے لگتا ہے تو اس کی چاہت میں گھر بار تج کر اس کے ساتھ ہولیتا ہے۔۔ وزیر زادی کی حقیقت کھلنے پر وہ بے ہوش ہو جاتا ہے، ہوش میں آنے کے بعد عذرِ لنگ کے طور پر اسے متبنیٰ بنانے کی بات کرتا ہے لیکن بالآخر اس سے شادی رچا لیتا ہے۔

الغرض! ان چاروں درویش عاشقوں اور خواجہ سگ پرست کے علاوہ داستان میں آنے والے بیشتر کرداروں کی سب سے بڑی کمزوری جنس ہے، بقول دوسرے درویش:

"اتفاقاً ایک روز رات کو شیطان نے درغلایا، شہوت کی حالت میں یہ دل میں آیا کر جو کچھ ہو سو ہو، کہاں تک اپنے تئیں تھاموں؛ اسے چھاتی سے لگا لیا اور قصد جماع کا کیا۔۔۔"

لیکن یہی وہ کمزوری ہے جو بالآخر ان کی سب سے بڑی پناہ گاہ اور قوت بھی ثابت ہوتی ہے۔۔۔ عشق۔ جس کی اساس جنس پر استوار ہے۔ ایسا عشق ہے جس سے وہ بالآخر گوہرِ مقصود حاصل کرتے ہیں چنانچہ پہلے درویش سے لے کر (جس کے مرض کا علاج "وصل" تجویز کیا جاتا ہے) چوتھے درویش تک (جس کا وفادار غلام مبارک جو امانت میں خیانت کے ڈر سے اپنی علامت "کاٹ کر ڈبیہ میں بند کرکے مرہم سلیمانی لگا لیتا ہے)، سبھی کے ہاں اس کی کارفرمائیاں متنوع طور سے جلوہ گر نظر آتی ہیں۔

باغ و بہار کی شہزادیاں

اور کچھ یہی حال باغ و بہار کے نسوانی کرداروں کا بھی ہے۔ ان میں سے "بی جمن" ایسی بصرہ کی شہزادی سے قطع نظر باقی ہر ایک کی سب سے بڑی کمزوری جنسی خواہش ہے جس پر قابو پانے میں وہ بالعموم ناکام رہتی ہیں۔

اس ضمن میں میر امن نے بڑے لطیف فرق کو ملحوظ رکھا جس کی طرف ناقدین نے اب تک بطورِ خاص توجہ نہیں دی۔ گو باغ و بہار کے ہیرو اور ہیروئن دونوں ہی کی کمزوری جنس ہے لیکن ان کے اظہار میں فرق ہے یعنی درویش پہلے عشق کرتے ہیں اور پھر ان میں جنسی خواہش جنم لیتی ہے جب کہ شہزادیوں میں پہلے جنسی خواہش بیدار ہوتی ہے اور پھر اس کی تسکین کے لئے وہ محبت کرتی ہیں۔ البتہ اتنا ہے کہ محبت وہ ٹوٹ کر کرتی ہیں کیونکہ پھر۔ وہ گھر بار چھوڑ کر فقیر ہی نہیں ہو جاتیں بلکہ راستہ کی رکاوٹ بننے والی ہستی کو قتل کرنے تک سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔ درویش تو پھر

بھی کبھی خود ضبطی سے کام لے لیتے ہیں جیسے پہلا درویش جب نے شہزادی کا راز جاننے کی بے چینی میں "بعد رسم رسومات عقد کے، آٹھ دن تک باوصف اس اشتیاق کے، قصد مباشرت کا نہ کیا"۔

لیکن اس کے برعکس شہزادی نور" اطعنہ دے دیتی ہے:

"دکس برتے پر تتا پانی"؟

مردوں کے مقابلہ میں، نسوانی کرداروں میں زندگی کی تڑپ اور گرمی ملتی ہے۔ ان میں پہل قدمی کی صلاحیت بھی ہے اور وہ پریشان کن حالات سے عہدہ برا ہی کی صورت نکالنے پر بھی قادر ہیں۔ ان میں نسوانیت کی پیدا کردہ ذہانت اور تیزی تو ہے لیکن سب میں اس کے انداز میں یکسانیت نہیں مثلاً" پہلے درویش کی شہزادی اور خواجہ سگ پرست کی وزیر زادی میں یہ سب سے زیادہ ہے تو چوتھے درویش کی ہیروئن میں سب سے کم! اسی طرح عورتوں کے مخصوص انداز میں یہ اپنا راز چھپانا ہی نہیں جانتیں بلکہ ہر طرح کے مرد کو اپنے ڈھب پر لانے کے گر بھی جانتی ہیں اس ضمن میں بھی پہلے درویش کی شہزادی اور خواجہ سگ پرست کی وزیر زادی سرفہرست ہیں۔ الغرض! مردوں کے مقابلہ میں یہ یقیناً" باصلاحیت، منتظم اور عملی قسم کی عورتیں ہیں لیکن ان میں سے دوسرے درویش کی کہانی میں بصرہ کی شہزادی کی استثنائی مثال سے قطع نظر جو کہ جنس سے خوف زدہ بلکہ اینٹی سیکس نظر آتی ہے۔ باقی سبھی قابل ذکر اور اہم کرداروں کی سب سے بڑی کمزوری جنس ہی نظر آتی ہے۔ ان میں سے بیشتر میں شہزادیوں والی تمکنت، رکھ رکھاؤ اور حفظِ مراتب کا احساس ملتا ہے بلکہ پہلے درویش کی شہزادی میں تو سب سے زیادہ عزتِ نفس، خودداری، رکھ رکھاؤ اور سلیقہ ملتا ہے۔ اس حد تک کہ بعض اوقات تو وہ مغرور و متکبر بھی دکھائی دیتی ہے لیکن جنس اس کی بھی سب سے بڑی کمزوری ہے بلکہ بلحاظِ کردار ان سب میں جو بھی اعلیٰ صفات ہیں جنس ان کی نفی کر دیتی ہے۔ ان شہزادیوں کے کردار عورتوں کی نفسیات میں ایسی بلندی ایسی پستی کی مثال پیش کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی تمام کرداری صفات کا سوتہ جنس سے پھوٹتا ہے۔ بصرہ کی شہزادی جنس بے زار عورت ہے شاید اسی لئے اس کے کردار میں کسی طرح کی انفرادیت یا رنگینی نہیں ملتی۔

تقریباً" سبھی شہزادیاں والدین کی نگاہوں سے دور الگ محلات میں رہتی ہیں جہاں دایوں خواصوں، ہم جولیوں اور خواجہ سراؤں کی صورت میں ہم رازوں کی ایک فوج کی فوج ملتی ہے انہیں ہر طرح کی سہولتیں میسر ہیں چنانچہ اپنی آزادی سے وہ ہر طرح سے بہرہ یاب ہوتی ہیں۔ بیشتر

شہزادیوں کو نشہ کی علّت بھی ہے بلکہ پہلے درویش کی شہزادی تو "شربت ورق الخیال" (بھنگ) بھی پیتی ہے اور "جب اس کا نشہ طلوع ہوتا تو اس کی لہر میں اس لڑکے سے ٹھٹھا مزاخ کر کر دل بہلاتی تھی"

جب جنس کے ہاتھوں لاچار ہوئی تو "طبیعت خود بخود ایسی بے مزہ ہوئی کہ نہ مصاحبت کسی کی بھاوے نہ مجلس خوش آوے، سودائی سا مزاج ہو گیا۔ دل اُداس اور حیران، نہ کسی کی صورت اچھی لگی، نہ بات کہنے سننے کو جی چاہے" اس اعصابی پژمردگی کا علاج نشہ میں اور ایک نوجوان لڑکے کی صورت میں تلاش کیا جاتا ہے اور حال یہ ہو گیا کہ بقول شہزادی "میں اپنے دل کو ہر چند سنبھالتی پر اس کافر کی صورت جی میں ایسی کھب گئی تھی۔ یہی جی چاہتا تھا کہ مارے پیار کے اسے کلیجے میں ڈال رکھوں اور اپنی آنکھوں سے ایک پل جُدا نہ کروں"

وہ بالغ ہوا تو ملاقات کے لئے اس کی حویلی سے محل تک سُرنگ کھدوائی گئی اور یوں "تمام شب شراب کباب، عیش و عشرت میں کٹتی، میں اس کے ملنے سے آرام پاتی وہ میرے دیکھنے سے خوش ہوتا"

میں نے کردار نگاری کے تجزیہ میں ایک موقع پر عرض کیا تھا کہ یہ شہزادیاں جنس کی وساطت سے محبت تک پہنچتی ہیں۔ سو اس کی توثیق دمشق اس کی شہزادی سے ہو جاتی ہے یہی نہیں بلکہ یہ انداز دیگر لنسوانی کرداروں کی سیرت کشی میں بھی نمایاں ہے مثلاً کنیا راجہ زیرباد کی اپنی داستان سناتی ہے جو اپنے باپ کے وزیر کے بیٹے کو چوگان بازی کرتے دیکھتی ہے تو "یہ دیوان کا پوت سب میں سندر تھا اور گھوڑے کو کاوے دیکر کسب کر رہا تھا، مجھ کو بھایا اور دل سے اس پر ریجھی، مدت تک یہی گپت رہی"

یہ بھی اپنی خواہش سے مجبور ہوتی ہے اور زنداں میں قید محبوب کو "ان اور جل پہنچاتی رہتی ہے لیکن جب اسے رہائی دلانے کی کوشش میں خواجہ سگ پرست نکل آتا ہے تو محبوب کو یکسر فراموش کر کے مسلمان ہی نہیں ہو جاتی بلکہ گھر بار چھوڑ کر اس کے عقد میں آجاتی ہے۔

کچھ یہی حال سراندیپ کی ملکہ کا ہے جو پہلے تو مسلمان جان کر اس پر خفا ہوتی ہے لیکن شراب پینے کے بعد خواجہ سگ پرست کی ذرا سی تبلیغ سے وہ اپنا آبائی دھرم چھوڑ کر اس کے ساتھ فرار ہی نہیں ہوتی بلکہ راز دار اور وفادار دائی کو بھی قتل کر دیتی ہے۔

اس طرح تیسرے درویش کی کہانی میں یا تو ملکہ اپنے عاشق کے قتل پر اُداس اور مضمحل ہوتی ہے لیکن جب شہزادہ کا تذکرہ بطور ایک امیدوار عاشق کیا گیا تو " یہ ذکر سن کر ملکہ نے فرمایا:
"کہاں ہے؟ اگر شہزادہ ہے تو کیا مضائقہ: روبرو آوے"
اس سے اگلے دن ملاقات پر شہزادہ نے " قدم بوس کیا" انہوں نے سر میرا اٹھا لیا اور گلے سے لگا کر بولیں کر:

"اس فرصت کو غنیمت جان اور میرا کہا مان، مجھے یہاں سے لے نکل کسی اور ملک چل"

الغرض! ان شہزادیوں کی زندگی جنس کی تال پر رقص کرتی ہے اس لئے ان کی زندگیوں میں جو تغیرات یا بحران آتے ہیں وہ سبھی بالواسطہ یا بلاواسطہ طور سے جنس ہی کے مرہونِ منت ہوتے ہیں۔

باغ و بہار کے تقریباً سبھی اہم نسوانی کرداروں میں ایک خاص طرح کی متلون مزاجی ملتی ہے۔ تقریباً سبھی بہت زیادہ IMPULSIVE ہیں۔ یہ رجحان پہلے درویش کی شہزادی میں تو بہت ہی نمایاں ہے اتنا کہ بعض اوقات تو اس کی شخصیت ہی غیر متوازن معلوم ہونے لگتی ہے اور یہ بھی جنس کے باعث ہے۔ وہ اس وقت تک باوقار شہزادیاں اور پر تمکنت خواتین ہیں جب تک کہ وہ جنس کی پیدا کردہ بے چینی سے آشنا نہیں ہوتیں لیکن جیسے ہی جنسی تسکین کا کوئی سہارا ملا اس وقت وہ اس تیزی سے اپنے بلند استھان سے نیچے اترتی ہیں کہ اس تضاد سے قاری کے ذہن کو جھٹکا سا لگتا ہے۔

باغ و بہار اور لطفِ زبان

مرزا رجب علی بیگ سرور: "مرزا صاحب! اُردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے"
مرزا غالب: "چہار درویش کی"
مرزا رجب علی بیگ سرور: "اور فسانہ عجائب کیسی ہے؟"
مرزا غالب: "اجی لاحول ولا قوۃ! اس میں لطف زبان کہاں؟ ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے"

سرور اور غالب کا یہ مکالمہ فرضی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ ہوا یہ کہ جب مرزا رجب علی بیگ

سرورؔ لکھنؤ سے دہلی آئے تو ملاقات پر انہوں نے یہ ذکر چھیڑا۔ غالب کو یہ علم نہ تھا کہ مخاطب خود مرزا سرورؔ ہی ہیں۔ جب بعد میں یہ معلوم ہوا کہ نادانستہ طور پر سچ بول کر وہ مرزا سرورؔ کو ناراض کر چکے ہوں گے تو بہت جز بز ہوئے چنانچہ تلافی کے لئے اگلے دن مرزا سرورؔ کی قیام گاہ پر پہنچے اور باتوں باتوں میں "فسانۂ عجائب" کا ذکر نکال کر اس کی رنگین عبارت کی بہت تعریف کی۔

غالب فکشن کا نقاد نہ تھا لیکن اپنے تنقیدی شعور اور فن کارانہ وجدان کی بنا پر غالب نے دو الفاظ میں باغ و بہار کی اہم ترین خصوصیت کو "لطفِ زبان" سے واضح کر دیا غالب اس وقت تک خود سادگی پسند ہو چکا تھا اس لئے "فسانۂ عجائب" کی مصنوعی زبان اور شعوری کاوش کی پیدا کردہ رنگینی کو پسند نہ کیا۔ غالب کی یہ رائے اس لحاظ سے بھی بہت وقیع ہے کہ خود غالب نے رنگِ بیدل میں پر تکلف اسلوب اور مفرس اشعار کہنے کو بے سود جان کر سادگی اور سلاست کو اپنایا تھا اس لئے جب غالب نے میرامن کے اسلوب کو سراہا تو اس کے پیچھے خود اس کی ادبی زندگی کے تجربات کا شعور کارفرما تھا۔

آیئے اب ان عناصر کا تجزیہ کریں جن سے میرامن اپنے اسلوب میں "سادہ رنگینی" کی انوکھی خوبی پیدا کرنے میں کامیاب رہے۔

میرامن نے "باغ و بہار" اور "گنج خوبی" میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ میرامن نے کس طرح سے ترجمہ کیا یا بالفاظِ دیگر ایک اچھے ترجمہ کے لئے وہ کن لوازم کو لازم جانتے تھے۔

"گنج خوبی" میں لکھا ہے:

> "لیکن فقط فارسی کے ہوبہو معنی کہنے میں کچھ لطف اور مزہ نہ دیکھا اس لئے اس کا مطلب لے کر اپنے محاورہ میں سارا احوال بیان کیا۔۔۔ میں نے بھی اردوئے معلیٰ کی زبان کو بے پیچ و رکاوٹ، جیسے بادشاہ سے لے کر امرا اور اس کے ملازم بولتے ہیں۔ لہٰذا عربی و فارسی کی لفظیں چاہتا تو بہت سی بھر دیتا لیکن یہ زبان کچھ کیفیت نہ پاتی بلکہ آمیزش پا کر کچھ زبان اور کی ہو جاتی۔"

اس اقتباس سے تین ایسے نکات کا استخراج کیا جاسکتا ہے جنہیں میر امن کے ترجمہ کے لئے راہنما اصول قرار دیا جاسکتا ہے:

(ا) لفظی ترجمہ کے بجائے معانی اُجاگر کرنا پسند کرتے ہیں۔

(ب) عوام و خواص کی عام بول چال کی زبان کو معیاری سمجھتے ہیں۔

(ج) اُردو کو خالص رکھتے ہوئے اسے مفرس اور معرب بنانا پسند نہیں۔

اب ایک اساسی نوعیت کا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ترجمہ کا یہ نظریہ میر امن کا خود ساختہ تھا یا کسی اور (مثلاً ڈاکٹر گل کرسٹ) نے یہ سمجھایا تھا اس کا جواب باغ و بہار کے دیباچہ سے مل جاتا ہے:

"اب خداوند نعمت، صاحب مروت، نجیبوں کے قدردان، جان گل کرسٹ صاحب نے (کہ ہمیشہ اقبال ان کا زیادہ رہے، جب تک گنگا جمنا بہے) لطف سے فرمایا کہ اس قصہ کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اُردو کے لوگ، ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام، آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجمہ کرو، موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا، جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔"

اسی طرح باغ و بہار کے ساتھ گل کرسٹ کا جو "نوٹس" ملتا ہے اس میں خود اس نے بھی یہی کہا ہے لیکن اس سے میر امن کے کام کی قدر و قیمت کو کم کرنا مقصود نہیں اور نہ ہی ایسا ہو سکتا ہے کہ گل کرسٹ نے اپنے نصاب کے نقطۂ نظر سے سلاست کی تلقین کی تھی۔ اس کے سامنے کیونکہ "نو طرز مرصع" موجود تھی اس لئے گل کرسٹ نے میر امن سے یہ کہا ہوگا کہ ایسی رنگین نگارش سے پرہیز کرنا اور یہی میر امن نے کر دکھایا ورنہ میر امن نے بھی سادگی کے باوجود زبان کو رنگین اور مرصع بنانے کی کوشش کی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ حسن بیان کو مقصود بالذات قرار دینے کی بجائے اسے اظہار مطلب کا وسیلہ سمجھا گیا۔ میر امن کا کمال یہ ہے کہ اس نے "موافق حکم حضور کے" تو کام کیا لیکن اپنے تخلیقی جوہر کی جودت سے اُردو نثر میں حسن چراغ کو فروزاں کیا وہ بجھ نہ سکا۔

معلوم ہوتا ہے میر امن کو اپنی دلی اور اس کی زبان پر ناز تھا وہ ہر موقع پر خود کو دلی والا لکھتا ہی نہیں بلکہ دیباچہ میں بطور فخر یہ وضاحت بھی کرتا ہے کہ اس کی زبان خالص دہلی کی زبان ہے اور دیگر زبانوں کی آمیزش سے آلودہ بھی نہیں ہوئی:

"جب احمد شاہ ابدالی کابل سے آیا اور شہر کو لٹوایا۔ شاہ عالم پورب کی طرف

تھے، کوئی وارث اور مالک، ملک کا نہ رہا، شہر بے سر ہو گیا۔ سچ ہے، بادشاہت کے اقبال سے شہر کی رونق تھی۔ ایک بارگی تباہی پڑی، رئیس وہاں کے، میں کہیں تم کہیں ہو کر جہاں جس کے سینگ سمائے وہاں نکل گئے۔ جس ملک میں پہنچے وہاں کے آدمیوں کے ساتھ سنگت سے بات چیت میں فرق آیا اور بہت ایسے ہیں کہ دس پانچ برس کسو سبب سے دلی میں گئے اور رہے، وے بھی کہاں تلک بول سکیں گے کہیں نہ کہیں چوک ہی جائیں گے اور جو شخص سب آفتیں سہہ کر دلی کا روڑا ہو کر رہا اور دس پانچ پشتیں اس شہر میں گزریں اور اس نے در بار امرا کے اور میلے، ٹھیلے، عرس چھڑیاں، سیر تماشا اور کوچہ گردی اس شہر کی مدت تلک کی ہو گی اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہو گا اس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے۔"

آخری حصّہ میں میر امن نے جس طرح سے اپنے اہل زبان ہونے پر زور دیا ہے اس کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں صرف اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک طرف وہ ان لوگوں کو لیتا ہے جو کہ "دس پانچ برس کسو سبب سے دلی میں گئے اور رہے" تو دوسری طرف اپنی بات کرتا ہے جس کی "دس، پانچ پشتیں اس شہر میں گزریں"۔

دس پانچ برس اور دس پانچ پشتیں تقابل کا خوبصورت انداز ہی نہیں اس کی آن کا بھی مظہر ہے۔

باغ و بہار کے اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ کرتے وقت اس اساسی حقیقت کو ہر دم ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ میر امن نے اسے "ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں، جو اُردو کے لوگ ... بولتے چالتے ہیں" لکھا تھا اس سے یہ اہم لسانی نکتہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ میر امن شعوری یا غیر شعوری طور پر تحریر اور تقریر کی زبان میں امتیاز سے آشنا ہی نہ تھے بلکہ مؤخر الذکر کو اس بنا پر سلیس جانا کہ اس میں وہ تمام پابندیاں اور قواعد و ضوابط ملحوظ نہ رکھے جاتے تھے جن سے تحریر کی زبان پُر تکلف اور بوجھل بن جاتی ہے۔ واضح رہے کہ ان کے سامنے ادبی زبان کا نمونہ "نو طرزِ مرصع" کے روپ میں تھا جس کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا معرب و مقفیٰ انداز بیان اور متنبی عبارت تھی اس لئے اس کے برعکس زبان لکھنے کے لئے ایک ہی صورت نظر آئی اور وہ یہ کہ عام بول چال کی زبان کو اس کی تمام غلطیوں اور خامیوں سمیت ادبی زبان بنا دیا جائے۔ میر امن کے سامنے سلیس اُردو

تحریر کا نمونہ نہ تھا اس لئے انہوں نے دلّی کے گلی کوچوں میں بکھرے تقریری نمونوں پر اپنی عبارت استوار کی، اور ظاہر ہے کہ عوام نہ تو مقفیٰ فقرات بولتے ہیں اور نہ ہی انہیں عربی فارسی کے بھاری بھرکم اور بوجھل الفاظ اور خوشنما تراکیب استعمال کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ بعض ناقدین نے میرامن کے اسلوب پر بحث کرتے ہوئے یہ اعتراضات کئے ہیں کہ انہوں نے بعض اوقات فقرہ کی ساخت میں گرامر کی یا تبدیلیوں[١] کا لحاظ نہ کیا یا بعض الفاظ کے املا[٢] ادبی تحریر کے برعکس بول چال کے مطابق لکھے ہیں یا پھر بعض الفاظ کی تذکیر[٣] و تانیث غلط ہی نہیں بلکہ بعض مواقع پر تو جمع الجمع[٤] سے بھی کام لیا گیا ہے اور یا پھر ایسے الفاظ، محاورات اور ضرب الامثال ملتی ہیں جو صرف دلّی کے گلی کوچوں ہی میں بولے جاتے ہوں گے اور جن کی حیثیت ادبی نہیں بلکہ مقامی[٥] نوعیت کی تھی۔

---

١ بقول مولوی عبدالحق :

"جمع مونث اسم کے ساتھ فعل کی جمع "ان" سے یا امدادی فعل کے ساتھ اصل فعل کی بھی جمع جیسے" دو کشتیاں امانت حضور میں اس پری کے گزرانیاں" "یہ باتیں ہونیاں تھیں" "گھوڑے کی باگیں ڈال دیاں"

"اکثر اردو مضاف، مضاف الیہ فارسی طرز پر استعمال کئے گئے ہیں اور اردو حروف اضافت آخر میں لکھے گئے ہیں جیسے "موافق معمول کے" "تقریر خوش گوئی اس کی" ایک جگہ تو اضافت توصیفی لکھ کر موصوف کی جمع بنائی ہے" اور خانہ زاد موروثیوں کی قدر سمجھے گا"

"نے" کا استعمال یا ترک بعض افعال کے ساتھ جواب حال کے محاورہ کے خلاف ہے اور دکن میں اب تک رائج ہے: "القصہ دانت کرچکے یہ دونوں بھائی اور کوتوال کے ڈنڈے مجھے اس پہاڑ پر لے گئے" "ذرا سرت آئی تو میں اپنے تئیں مردہ خیال کیا" "اس پروانگی کے سنتے ہی جوان نے آداب بجا لایا"

٢ جمیرات (جمعرات) مرتے (مرقع) ("مقدمہ : باغ و بہار")

٣ بقول مولوی سید محمد :

"خلعت کو مونث لکھا ہے مگر اب اس کو مذکر لکھتے ہیں"

٤ "امیروں کی جمع امراؤں" ("ارباب نثر اردو")

٥ بقول گیان چند جین :

"دانت چڑھے کتا کاٹے، ادھر کی ڈومنی گادے تال بے تالا، بیل نہ کودا کودی گون یہ تماشہ دیکھے گون، سر سے سر راہ جب بڑا چھوٹی رائی رائی ہو گئی،

ذیل کے الفاظ اور محاورے باغ و بہار کے علاوہ اور کہیں دیکھنے میں نہیں آتے۔ (باقی ٦٥ پر)

یہ اور اس نوعیت کے اور بھی کئی اعتراضات کئے جا سکتے ہیں لیکن اگر یہ اساسی حقیقت ذہن نشین رہے کہ میر امن صرف بول چال کی زبان ہی نہ لکھ رہے تھے بلکہ اسے عوام کے لہجہ میں لکھنے کی کوشش بھی کر رہے تھے تو ان اعتراضات کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس لحاظ سے بلا شبہ دلّی والے میر امن کی "باغ و بہار" کو عوامی نثر کی اوّلیں اور کامیاب مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔

میر امن نے عربی، فارسی سے بچکر مقامی رنگ میں رنگ کر اُردو زبان کو ایک نیا آہنگ دینے کا جو تجربہ کیا "فسانۂ عجائب" کی صورت میں اس کا جو منفی ردِّ عمل ظاہر ہوا اس سے سبھی واقف ہیں لیکن اس کے مثبت ردِّ عمل کی طرف کسی کی توجہ نہ گئی میری مراد انشاؔ کی "رانی کیتکی کی کہانی"[۱] سے ہے جو ۱۸۰۳ء میں لکھی گئی۔ آج تک یہ ایک نثری داستان کی حیثیت سے معروف رہی ہے لیکن ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بقول انشاؔ نے اسے منظوم بھی کیا "یہ منظوم حصّہ کلیاتِ انشاؔ کے مطبوعہ نسخہ میں نہیں ہے۔ کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ میں کلیاتِ انشاؔ کے دو قلمی نسخوں میں البتہ نامکمل صورت میں موجود ہے"[۲]۔

انشاؔ نے اس قصّہ کو عربی فارسی الفاظ و محاورات سے بچ کر صرف بھاشا میں لکھنے کا التزام کیا چنانچہ انشاؔ نے "ڈول ڈال ایک انوکھی بات" کے عنوان تلے یہ دعویٰ کیا:

> "ایک دن بیٹھے بیٹھائے یہ بات اپنے دھیان میں چڑھ آئی کہ کوئی کہانی ایسی کہیئے جس میں ہندوی چھُٹ اور کسی بولی سے پُٹ نہ ملے، تب جا کر میرا جی پھول

لقبیہ حاشیہ صفحہ ۶۵ سے آگے

صبح خیزے، بجھ ہونا (ضد کرنا)، تلپھتے (تڑپتے) روبٹ (رونق) بت کہاؤ (بات کہنے کا ڈھنگ)، کدھو (کبھی) اچنت (یکایک) سُرت (سکت) تپیانا (بات کرنا) گھوڑے کو ٹنگیانا (ایڑ لگانا) نبدانوں (قیدیوں) ہُمک گھنی (سجدہ) گھر بیٹا (گھر میں بیٹھے رہنا) کلچھواں رنگ (کالا رنگ) ہزاری، ہزاری، پرنچ مرنج کھینچنا، ہر بال میں علیلہ لگنا، نخش (ترکش) پرچھا ہونا (بھیڑ کا ہٹنا) کرٹ باندھ بیٹھنا (نشست کی ایک صورت) جوتا اڑانا (جوتا پہننا) "اُردو کی نثری داستانیں"

[۱] گو یہ "رانی کیتکی کی کہانی" کے نام سے مشہور ہے لیکن اس کا اصل نام "داستان رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی" ہے۔

[۲] ڈاکٹر فرمان فتح پوری "اُردو کی منظوم داستانیں" ص: ۴۱۸

کی کلی کے روپ کھلے، باہر کی بو لی اور گنواری کچھ اس کے بیچ نہ ہو۔"

رانی کیتکی کی کہانی کو منظوم کرتے وقت انشاؔ نے نثر کے اس دعویٰ کو یوں نظم کیا:

کہانی وہ کہیئے کہ ہندی کے چھُٹ
نہ رکھے کسی اور بولی کا پُٹ

اب سوال یہ ہے کیا انشاؔ واقعی میر امن سے متاثر تھا؟

اس کا جواب قطعی طور سے دینا تو مشکل ہے لیکن قیاس سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ انشاؔ جدّت پسند تھا اور اسے نت نئے تجربات کا شوق بھی تھا اس لئے امکان ہے کہ باغ و بہار کی نثر سے متاثر ہو کر اس نے بھی ایسا ہی تجربہ کرنے کا سوچا ہو لیکن اپنی طبعی ذہانت اور خلاقانہ ذہن کی بنا پر محض تقلید کی بجائے ایک قدم اور بڑھ کر عربی فارسی کو کلیتاً" ترک کر کے خالص بھاشا میں ایک کہانی لکھ ڈالی۔ اس قیاس کو اس امر سے بھی تقویت پہنچ سکتی ہے کہ جب رنگین نے ریختی کی ایجاد کی تو انشاؔ نے اظہار ناپسندیدگی کیا لیکن بعد میں خود بھی ریختی کہی اس لئے ہو سکتا ہے کہ "باغ و بہار" ہی "رانی کیتکی کی کہانی" کی محرک بنی ہو!

میر امن نے لکھا تھا:-

مجھے بھول جا دیں گے سب بعد مرگ - رہے گا مگر یہ سخن یادگار
اسے جو پڑھے یاد مجھ کو کرے - یہی قاریوں سے مرا ہے قرار

میر امن کا یہ دعویٰ کھوکھلا نہ ثابت ہوا کیونکہ زمانہ نے واقعی میر امن کو یاد رکھا، باغ و بہار مختلف افراد، شخصیات، واقعات اور کیفیات کا مجموعہ ہے۔ ہر ایک اپنی جگہ پر منفرد اور دلکش ہے انہیں میر امن کی فن کارانہ اپج اور تخلیقی جوہر نے جو رنگینی عطا کی اسی میں اس کی مقبولیت کا راز مضمر ہے۔ بحیثیت مجموعی اسے ایک "MOSAIC" سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ خوبصورت دلکش اور سب سے بڑھ کر رنگین!

باغ و بہار

قصّہ چہار درویش

میر امّن دہلوی

عرضی میر امن دلّی والے کی

جو

مدرسے کے مختار کار صاحبوں کے حضور میں دی گئی :

صاحبانِ والا شان نجیبوں کے قدر دانوں کو خدا سلامت رکھے۔ اس بے دلمن نے حکم اشتہار کا سن کر چار درویش کے قصّے کو ہزار جدّ و کد سے اُردوئے معلّا کی زبان میں باغ و بہار بنایا۔ فضلِ الٰہی سے سب صاحبوں کے سیر کرنے کے باعث سرسبز ہوا۔ اب امیدوار ہوں کہ اس کا پھل مجھے بھی ملے، تو میرا غنچۂ دل مانند گل کے کھلے۔ بقول حکیم فردوسی کے کہ شاہ نامے میں کہا ہے :

بسے رنج بُردم دریں سال سی
عجم زندہ کردم بہ ایں پارسی
سو اُردو کی آراستہ کر زباں
کہا میں نے بنگالہ ہندوستاں

خاوند آپ قدردان ہیں، حاجت عرض کرنے کی نہیں
الٰہی تا رہے اقبال کا چمکتا رہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باغ و بہار

واسطے زبدۂ نوئینان عالیشان مشیر خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان مارکویس
ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ کے جو حامی و حافظ مدرسے کے ہیں

ماخذ اسکا نوطرز مرصع کہ وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خاں کا ہی
فارسی قصہ چار درویش سے

بیچ گلکرسٹ صاحب دام ثروتہٗ کی فرمایش سے
تالیف کیا ہوا میر امن دلّی والےکا

سُست و شستہ دوں ہوں پیش الفاظ کو جس پائی سے
دُر رہی اب گُہر سا بہنے اُسکے دو زُلال
خامہ کہتا ہی بکھرا ہی جو گو فصاحت ایک چیز
سوز مانگی ہی میری نادرسے زر و مال
ختم اب کرتا ہی سب دا بدعا ای خدا
دوستان ہوں شاد ہمیشہ اور ہوں دشمن پایمال

ہندوستانی چھاپاخانہ
سنہ ۱۸۰۳ عیسوی مطابق سنہ ۱۲۱۸ ہجری کے

باغ و بہار کی پہلی اشاعت کا سرورق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم !

سبحان اللہ، کیا صانع ہے کہ جس نے ایک مٹھی خاک سے کیا کیا صورتیں اور مٹی کی مورتیں پیدا کیں ! باوجود دو رنگ کے، ایک گورا ایک کالا ۔ اور یہی ناک، کان، ہاتھ، پاؤں سب کو دیئے ہیں۔ تس پر، رنگ بہ رنگ کی شکلیں، جدی جدی بنائیں کہ ایک کی سج دھج سے دوسرے کا ڈیل ڈول ملتا نہیں۔ کروڑوں خلقت میں جس کو چاہیئے، پہچان لیجئے۔ آسمان اس کے دریائے وحدت کا ایک بلبلا ہے، اور زمین پانی کا بتاشا۔ لیکن یہ تماشا ہے کہ سمندر ہزاروں لہریں مارتا ہے، پر اس کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ جس کی یہ قدرت اور سکت ہو اُس کی حمد و ثنا میں زبان انسان کی گویا گونگی ہے۔ کہے تو کیا کہے ! بہتر یوں ہے کہ جس بات میں دم نہ مار سکے، چپکا ہو رہے : ۔

عرش سے لے فرش تک جس کا یہ سامان ہے
حمد اُس کی گر لکھا چاہوں تو کیا امکان ہے
جب پیمبر نے کہا ہو " میں نے پہچانا نہیں "
پھر جو کوئی دعویٰ کرے اس کا ، بڑا نادان ہے
رات دن یہ مہر و مہ پھرتے ہیں صنعت دیکھتے
پر ہر ایک واحد کی صورت دیدۂ حیران ہے
جس کا ثانی اور مقابل ہے ، نہ ہووے گا کبھو
ایسے یکتا کو خدائی سب طرح شایان ہے
لیکن اتنا جانتا ہوں خالق و رازق ہے وہ
ہر طرح سے مجھ پر اس کا لطف اور احسان ہے

اور درود اس کے دوست پر جس کی خاطر زمین اور آسمان کو پیدا کیا اور درجہ رسالت دیا:

جسم پاک مصطفےٰ ، اللہ کا اک نور ہے
اس لئے پرچھائیں اس قد کی نہ تھی مشہور ہے
حوصلہ میرا کہاں اتنا، جو نعت اس کی کہوں !
پر سخن گویوں کا یہ بھی قاعدہ دستور ہے

اور اُس کی آل پر صلواۃ وسلام، جو ہیں بارہ امام۔

حمد حق اور نعت احمد کو یہاں کر اختتام
اب میں آغاز اس کو کرتا ہوں جو ہے منظور کام
یا الٰہی ، واسطے اپنے نبیؐ کی آل کے
کر یہ میری گفتگو مقبول طبع خاص و عام

منشا اس تالیف کا یہ ہے کہ سن ایک ہزار دو سو پندرہ برس بحری اور اٹھارہ سے، اور ایک سال عیسوی مطابق ایک ہزار، دو سو سات سن فصلی کے، عہد میں، شرف الاشراف مارکوئس ولزلی، گورنر جنرل، لارڈ مارنگٹن صاحب کے دجن کی تعریف میں عقل حیران اور فہم سرگردان ہے جتنے وصف سرداروں کو چاہیئے ان کی ذات میں خدا نے جمع کئے ہیں۔ غرض، قسمت کی خوبی اس ملک کی تھی جو ایسا حاکم تشریف لایا، جس کے قدم کے فیض سے، ایک عالم نے آرام پایا۔ مجال نہیں کہ کوئی کسو پر زبردستی کر سکے، شیر اور بکری، ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں، سارے غریب غربا دعا دیتے ہیں اور جیتے ہیں) چرچا علم کا پھیلا۔ صاحبان ذی شان کو شوق ہوا کہ اُردو کی زبان سے واقف ہو کر ہندوستانیوں سے گفت وشنود کریں اور ملکی کام کو بہ آگاہی تمام انجام دیں۔ اس واسطے کتنی کتابیں اسی سال بموجب فرمائش کے تالیف ہوئیں۔

جو صاحب دانا اور ہندوستان کی زبان بولنے والے ہیں، ان کی خدمت میں گزارش کرتا ہوں کہ قصہ چہار درویش کا ابتدا میں امیر خسرو دہلوی نے اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ، زری زربخش، جو اُن کے پیر تھے، اور درگاہ ان کی دلی میں قلعے سے تین کوس، لال دروازے کے باہر، مٹیا دروازے سے آگے، لال بنگلے کے پاس ہے، ان کی طبیعت ماندی ہوئی۔ تب مرشدے دل بہلانے کے واسطے امیر خسرو یہ قصہ ہمیشہ کہتے اور بیمارداری میں حاضر رہتے۔ اللہ نے چند روز میں شفا دی۔ تب انہوں نے غسل صحت کے دن یہ دعا دی کہ جو کوئی اس قصے کو سنے گا خدا کے فضل سے تندرست رہے گا۔ جب سے یہ قصہ فارسی میں مروج ہوا۔

اب خداوند نعمت، صاحب مروت، نجیبوں کے قدردان، جان گل کرسٹ صاحب نے (کہ ہمیشہ اقبال ان کا زیادہ رہے، جب تلک گنگا جمنا بہے) لطف سے فرمایا کہ اس قصے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں، جو اُردو کے لوگ: ہندو، مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص وعام آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے، میں نے بھی اسی محاورے سے لکھنا شروع

کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔

پہلے اپنا احوال یہ عاصی، گنہگار، میر امن دلی والا بیان کرتا ہے کہ میرے بزرگ، ہمایوں بادشاہ کے عہد سے، ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں، پشت بہ پشت، جاں فشانی بجا لاتے رہے اور وہ بھی پرورش کی نظر سے قدردانی جتنی چاہیے فرماتے رہے، جاگیر و منصب اور خدمات کی عنایات سے سرفراز کر کر، مالامال اور نہال کر دیا، اور "خانہ زاد موروثی" اور "منصب دار قدیمی" زبان مبارک سے فرمایا۔ چنانچہ یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا۔ جب ایسے گھر کی (کہ سارے گھر اس گھر کے سبب آباد تھے) یہ نوبت پہنچی کہ ظاہر ہے (عیاں را چہ بیاں؟) تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا اور احمد شاہ درانی نے گھر بار تاراج کیا۔ ایسی ایسی تباہی کھا کر ویسے شہر سے (کہ وطن اور جنم بھوم میرا ہے، اور آنول نال وہیں گڑا ہے) جلاوطن ہوا، اور ایسا جہاز (کہ جس کا ناخدا بادشاہ تھا) غارت ہوا۔ میں بے کسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ ڈوبتے کو تنکے کا آسرا بہت ہے، کتنے برس بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا۔ کچھ بنی کچھ بگڑی۔ آخر وہاں سے بھی پاؤں اکھڑے، روزگار نے موافقت نہ کی۔ عیال و اطفال کو چھوڑ کر تن تنہا کشتی پر سوار ہوا۔ اشرف البلاد کلکتے میں آب و دانے کے زور سے آ پہنچا۔ چندے بیکاری گزری۔ اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے واسطے، مقرر کیا۔ قریب دو سال کے، وہاں رہنا ہوا، لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا۔ تب منشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے، حضور تک جان گل کرسٹ صاحب بہادر (دام اقبالہ) کے، رسائی ہوئی۔ بارے، طالع کی مدد سے ایسے جواں مرد کا دامن ہاتھ لگا ہے، چاہیے کہ دن کچھ بھلے آویں۔ نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر، پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں اور گھر میں دس آدمی، چھوٹے بڑے، پرورش پا کر دعا اس قدردان کو کرتے ہیں۔ خدا قبول کرے!

حقیقت اردو کی زبان کی، بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے، انہیں کے راجا پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے اور اپنی بھاکھا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا۔ سلطان محمود غزنوی آیا، پھر غوری اور لودھی بادشاہ ہوئے۔ اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی۔ آخر امیر تیمور نے (جن کے گھرانے میں اب تک، نام نہاد، سلطنت کا چلا جاتا ہے) ہندوستان کو لیا۔ ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا، اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا۔ پھر ہمایوں بادشاہ پٹھانوں کے ہاتھ سے حیران ہو کر ولایت گئے، آخر وہاں سے آن کر پسماندوں کو گوشمالی دی۔ کوئی مفسد باقی نہ رہا

کرنتہ و فساد برپا کرے۔

جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم، قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان الاثانی کی سن کر، حضور میں آکر جمع ہوئے۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرتے، ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی جب حضرت شاہ جہان صاحب قران نے قلعہ مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کروایا اور تختِ طاؤس میں جواہر جڑوایا اور دل باول ساخیمہ، چوبوں پہ استادکر، طنابوں سے کھنچوایا اور نواب علی مردان خاں نہر کو لے کر آیا، تب بادشاہ نے خوش ہوکر حسن فرمایا اور شہر کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ تب سے شاہ جہان آباد مشہور ہوا اگرچہ دلّی جدی ہے، وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے) اور وہاں کے بازار کو اُردوے معلّےٰ خطاب دیا۔

امیر تیمور کے عہد سے محمد شاہ کی بادشاہت، بلکہ احمد شاہ اور عالم گیر ثانی کے وقت تلک، پیڑھی بہ پیڑھی سلطنت یکساں چلی آئی۔ ندان، زبان اُردو کی منجھتے منجھتے ایسی منجھی کہ کسو شہر کی بولی اُس سے ٹکر نہیں کھاتی۔ لیکن قدردان منصف چاہیئے، جو تجویز کرے۔ سو اب خدا نے، بعد مدت کے، جان گل کرسٹ صاحب سا دیا، نکتہ رس پیدا کیا کہ جنہوں نے اپنے گیان اور اُگت سے اور تلاش و محنت سے، قاعدوں کی کتابیں تصنیف کیں۔ اس سبب سے ہندوستان کی زبان کا ملکوں میں رواج ہوا اور نئے سر سے رونق زیادہ ہوئی۔ نہیں تو اپنی دستار و گفتار و رفتار کو کوئی بُرا نہیں جانتا، اگر ایک گنوار سے پوچھیے تو شہر والوں کو نام رکھتا ہے، اور اپنے تئیں سب سے بہتر سمجھتا ہے۔ خیر، عاقلاں خود میدانند۔

جب احمد شاہ ابدالی کابل سے آیا اور شہر کو لٹوایا، شاہ عالم پورب کی طرف تھے کوئی وارث اور مالک، ملک کا نہ رہا، شہر بے سر ہوگیا۔ سچ ہے، پادشاہت کے اقبال سے شہر کی رونق تھی۔ ایک بارگی تباہی پڑی۔ رئیس وہاں کے "میں کہیں تم کہیں" ہوکر جہاں جس کے سینگ سمائے وہاں نکل گئے۔ جس ملک میں پہنچے، وہاں کے آدمیوں کے ساتھ سنگت سے بات چیت میں فرق آیا اور بہت ایسے ہیں کہ دس پانچ برس کسو سبب سے دلّی میں رہے اور رہے، وہ بھی کہاں تلک بول سکیں گے، کہیں نہ کہیں چوک ہی جائیں گے اور جو شخص سب آفتیں سہہ کر دلّی کا روڑا ہو کر رہا، اور دس پانچ پشتیں اسی شہر میں گزریں اور اس نے دربار اُمراؤں کے اور میلے ٹھیلے، عرس چھڑیاں،

سیر تماشا اور کوچہ گردی اس شہر کی مدت تلک کی ہو گی، اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا، اس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے۔ یہ عاجز بھی ہر ایک شہر کی سیر کرتا اور تماشا دیکھتا یہاں تلک پہنچا ہے۔

فیروز اللغات اُردو جدید

نیا ایڈیشن

جدید ترتیب اور اضافوں کے ساتھ

ستّر ہزار کے لگ بھگ مُتداوَل الفاظ، مرکّبات، محاورات،
ضربُ الامثال اور سائنسی اور فنّی اِصطلاحات

قیمت مجلّد ریگزین ——— ۲۵ روپے

اعجاز پبلشنگ ہاؤس
۲۰۶۰۔ ناہر خاں اسٹریٹ ۔ دریا گنج ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شروع قصّے میں

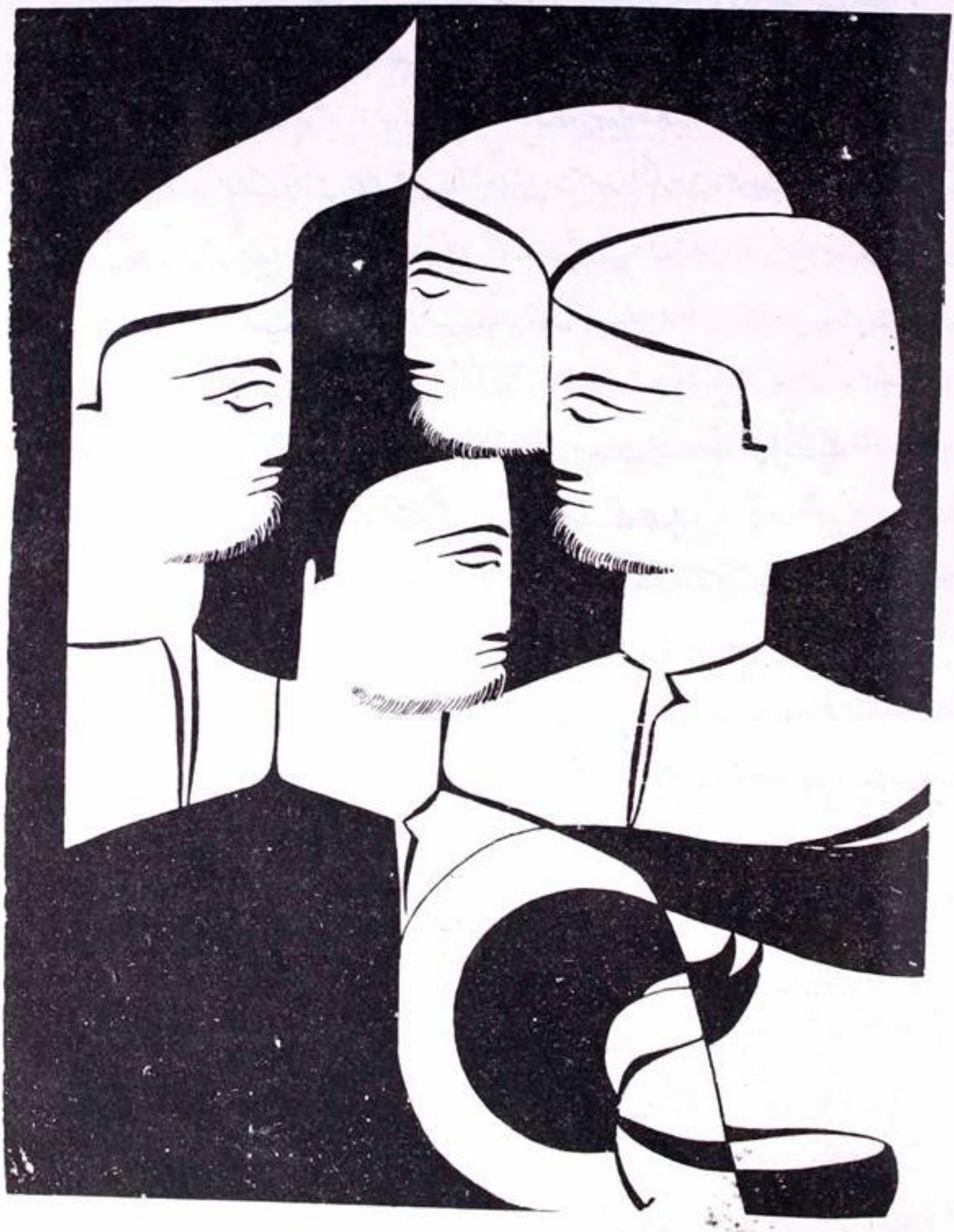

اب آغاز قصّے کا کرتا ہوں، ذرا کان دھر کر سنو اور منصفی کرو۔ سیر میں چار درویش کی یوں لکھا ہے اور کہنے والے نے کہا ہے، کہ آگے، روم کے ملک میں، کوئی شہنشاہ تھا کہ نوشیرواں کی سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت، اس کی ذات میں تھی۔ نام اس کا آزاد بخت اور شہر قسطنطنیہ (جس کو استنبول کہتے ہیں) اُس کا پایۂ تخت تھا۔ اس کے وقت میں رعیت آباد، خزانہ معمور، لشکر مرفّہ، غریب غربا آسودہ۔ ایسے چین سے گزران کرتے اور خوشی سے رہتے کہ ہر ایک کے گھر میں دن عید، اور رات شب برات تھی اور جتنے چور چکار، جیب کترے، صبح خیزے، اٹھائی گیرے، دغا باز تھے، سب کو نیست و نابود کر کر، نام و نشان ان کا اپنے ملک بھر میں نہ رکھا تھا۔ ساری رات دروازے گھروں کے بند نہ ہوتے اور دکانیں بازار کی کھلی رہتیں۔ راہی مسافر، جنگل میدان میں، سونا اچھالتے چلے جاتے۔ کوئی نہ پوچھتا کہ تمہارے منہ میں کے دانت ہیں اور کہاں جاتے ہو؟

اس بادشاہ کے عمل میں ہزاروں شہر تھے اور کئی سلطان نعل بندی دیتے۔ ایسی بڑی سلطنت پہ ایک ساعت اپنے دل کو، خدا کی یاد اور بندگی سے غافل نہ کرتا۔ آرام دنیا کا جو چاہیئے سب موجود تھا، لیکن فرزند کہ زندگانی کا پھل ہے، اس کی قسمت کے باغ میں نہ تھا۔ اس خاطر اکثر فکرمند رہتا اور پانچوں وقت کی نماز کے بعد اپنے کریم سے کہتا کہ "اے اللہ مجھ عاجز کو تو نے اپنی عنایت سے سب کچھ دیا لیکن ایک اس اندھیرے گھر کا دیا نہ دیا۔ یہی ارمان جی میں باقی ہے کہ میرا نام لیوا اور پانی دیوا کوئی نہیں اور تیرے خزانۂ غیب میں سب کچھ موجود ہے، ایک بیٹا جیتا جاگتا مجھے دے تو میرا نام اور اس سلطنت کا نشان قائم رہے۔"

اسی امید میں بادشاہ کی عمر چالیس برس ہو گئی۔ ایک دن شیش محل میں نماز ادا کر کر وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ ایک بار گی آئینہ کی طرف جو خیال کرتے ہیں تو ایک سفید بال مونچھوں میں نظر آیا کہ مانند تار مقیش کے چمک رہا ہے۔ بادشاہ دیکھ کے آب دیدہ ہوئے اور ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر دل میں اپنے سوچ کیا کہ "افسوس! تو نے اتنی عمر ناحق برباد کی اور اس دنیا کی حرص میں ایک عالم کو زیر و زبر کیا۔ اتنا ملک جو لیا، اب تیرے کس کام آوے گا؟ آخر یہ سارا مال اسباب کوئی دوسرا اُڑا دیگا

تجھے تو پیغام موت کا آچکا، اگر کوئی دن جیے بھی تو بدن کی طاقت کم ہوگی۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میری تقدیر میں نہیں لکھا کہ وارث، چھتر اور تخت کا، پیدا ہو۔ آخر ایک روز مرنا ہے اور سب کچھ چھوڑ جانا ہے، اس سے یہی بہتر ہے کہ میں ہی اسے چھوڑ دوں اور باقی زندگی اپنے خالق کی یاد میں کاٹوں۔"

یہ بات اپنے دل میں ٹھہرا کر پائیں باغ میں جاکر، سب مجرائیوں کو جواب دے کر فرمایا کہ "کوئی آج سے میرے پاس نہ آوے، سب دیوان عام میں آیا جایا کریں اور اپنے کام میں مستعد رہیں۔" یہ کہہ کر آپ ایک مکان میں جا بیٹھے اور مصلیٰ بچھا کر عبادت میں مشغول ہوئے۔ سوائے رونے اور آہ بھرنے کے کچھ کام نہ تھا۔ اسی طرح بادشاہ آزاد بخت کو کئی دن گزرے۔ شام کو روزہ کھولنے کے وقت ایک چھوہارا کھاتے اور تین گھونٹ پانی پیتے اور تمام دن رات، جا نماز پر پڑے رہتے۔ اس بات کا باہر چرچا پھیلا۔ رفتہ رفتہ تمام ملک میں خبر گئی کہ بادشاہ نے بادشاہت سے ہاتھ کھینچ کر گوشہ نشینی اختیار کی۔ چاروں طرف غنیموں اور مفسدوں نے سر اٹھایا اور قدم اپنی حد سے بڑھایا۔ جس نے چاہا، ملک دبایا اور سر انجام سرکشی کا کیا۔ جہاں کہیں حاکم تھے، ان کے حکم میں خلل عظیم واقع ہوا۔ ہر ایک صوبے سے عرضی، بدعملی کی، حضور میں پہنچی۔ درباری امرا جتنے تھے جمع ہوئے اور صلاح مصلحت کرنے لگے۔

آخر یہ تجویز ٹھہری کہ نواب وزیر، عاقل اور دانا ہے اور بادشاہ کا مقرب اور معتمد ہے اور درجے میں بھی سب سے بڑا ہے۔ اس کی خدمت میں چلیں، دیکھیں، وہ کیا مناسب جان کر کہتا ہے؟ سب عمدہ، امیر وزیر کے پاس آئے اور کہا "بادشاہ کی یہ صورت اور ملک کی یہ حقیقت، اگر چندے اور تغافل ہوا تو اس محنت کا ملک لیا ہوا مفت میں جاتا رہے گا، پھر ہاتھ آنا مشکل ہے۔" وزیر پرانا، قدیم، نمک حلال اور عقل مند، نام بھی خردمند اسم بامسمیٰ تھا، بولا "اگرچہ بادشاہ نے حضور میں آنے کو منع کیا ہے لیکن تم چلو، میں بھی چلتا ہوں۔ خدا کرے بادشاہ کی مرضی آوے، جو روبرو بلاوے۔" یہ کہہ کر، سب کو دیوان عام تک اپنے ساتھ لایا۔ اُن کو وہاں چھوڑ کر، آپ دیوان خاص میں آیا اور بادشاہ کی خدمت میں، محلی کے ہاتھ، کہلا بھیجا کہ "یہ پیر غلام حاضر ہے۔ کئی دنوں سے جمال جہاں آرا نہیں دیکھا۔ امیدوار ہوں۔ ایک نظر دیکھ کر قدم بوسی کروں تو خاطر جمع ہو۔" یہ عرض وزیر کی بادشاہ نے سنی، ازبس کہ قدامت اور خیر خواہی اور تدبیر اور جاں نثاری اُس کی جانتے تھے، اور اکثر اس کی بات مانتے تھے، بعد ال

کے فرمایا "خردمند کو بلالو"۔ بارے جب بہ دلدہی ہوئی، وزیر حضور میں آیا، آداب بجالایا! کھڑا رہا۔ دیکھا تو بادشاہ کی عجیب صورت بن رہی ہے کہ زار زار رونے اور دبلاپے سے آنکھوں میں حلقے پڑگئے ہیں اور چہرہ زرد ہوگیا ہے۔

خردمند کو تاب نہ رہی، بے اختیار دوڑ کر قدموں پہ جاگرا۔ بادشاہ نے ہاتھ سے اس کا سر اٹھایا اور فرمایا "لو، مجھے دیکھا، خاطر جمع ہوئی؟ اب جاؤ، زیادہ مجھے نہ ستاؤ، تم سلطنت کرو"۔ خردمند سن کر ڈاڑھ مار کر رویا اور عرض کی "غلام کو، آپ کے تصدق اور سلامتی سے، ہمیشہ بادشاہت میسّر ہے۔ لیکن جہاں پناہ کی، یک بیک، اس طرح کی گوشہ گیری سے، تمام ملک میں تہلکہ پڑ گیا ہے۔ اور انجام اس کا اچھا نہیں۔ یہ خیال مزاج مبارک میں آیا؟ اگر اس خانہ زاد موروثی کو بھی محرم اس راز کا کیجئے تو بہتر ہے۔ جو کچھ عقل ناقص میں آوے، التماس کرے۔ غلاموں کو جو یہ سرفرازیاں بخشی ہیں، اسی دن کے واسطے کہ بادشاہ عیش و آرام کریں، اور ملک پر در دے تدبیر میں ملک کی رہیں۔ خدانخواستہ جب فکر مزاج عالی کے لاحق ہوئی تو بند جائے پادشاہی کس دن کام آویں گے؟ بادشاہ نے کہا کہ "سچ کہتا ہے، پر جو فکر میرے جی کے اندر ہے، سو تدبیر سے باہر ہے۔

"سن اے خردمند، میری ساری عمر اسی ملک گیری کے دردسر میں کٹی، اب یہ سن و سال ہوا آگے موت باقی ہے، اس کا بھی پیغام آیا کہ سیاہ بال سفید ہوچکے۔ وہ مثل ہے، ساری رات سوئے اب صبح کو بھی نہ جاگیں؟ اب تک ایک بیٹا پیدا نہ ہوا، جو میری خاطر جمع ہوتی۔ اس لئے دل سخت اداس ہوا اور میں سب کچھ چھوڑ بیٹھا۔ جس کا جی چاہے، ملک لے یا مال لے، مجھے کچھ کام نہیں۔ بلکہ کوئی دن میں یہ ارادہ رکھتا ہوں کہ چھوڑ چھاڑ کر جنگل اور پہاڑوں میں نکل جاؤں اور منہ اپنا کسو کو نہ دکھاؤں۔ اسی طرح یہ چند روز کی زندگی بسر کروں۔ اور کوئی مکان خوش آیا تو وہاں بیٹھ کر بندگی اپنے معبود کی بجا لاؤں گا۔ شاید عاقبت بخیر ہو۔ اور دنیا کو تو خوب دیکھا، کچھ مزا نہ پایا"۔ اتنی بات بول کر، اور ایک آہ بھر کر، بادشاہ چپ ہو رہے۔

خردمند ان کے باپ کا وزیر تھا، جب یہ شہزادے تھے، تب سے محبت رکھتا تھا۔ علاوہ، دانا اور نیک اندیش تھا۔ کہنے لگا "خدا کی جناب سے ناامید ہونا ہرگز مناسب نہیں۔ جس نے ہیژدہ ہزار عالم کو ایک حکم میں پیدا کیا، تمہیں اولاد دینی اس کے نزدیک کیا بڑی بات ہے؟ قبلۂ عالم، یہ تصور باطل کو دل سے دور کریں، نہیں تو تمام عالم درہم برہم ہوجائے گا اور یہ سلطنت کس کس محنت

اور مشقت سے تمہارے بزرگوں نے اور تم نے پیدا کی ہے! ایک ذرا میں ہاتھ سے نکل جائے گی اور بے خبری سے ملک ویران ہو جائے گا۔ خدا نخواستہ بدنامی حاصل ہوگی۔ اس پر بھی بازپرس، روز قیامت ہونا ہے کہ تجھے بادشاہ بنا کر اپنے بندوں کو تیرے حوالے کیا تھا، تو ہماری رحمت سے مایوس ہوا اور رعیت کو حیران و پریشان کیا۔ اس سوال کا کیا جواب دو گے؟ پس عبادت بھی اس روز کام نہ آئے گی، اس واسطے کہ آدمی کا دل خدا کا گھر ہے اور بادشاہ فقط عدل کے واسطے پوچھے جائیں گے۔ غلام کی بے ادبی معاف ہو، گھر سے نکل جانا اور جنگل جنگل پھرنا، کام جوگیوں اور فقیروں کا ہے، نہ کہ بادشاہوں کا، اور تم اپنے جو کا کام کرو۔ خدا کی یاد اور بندگی، جنگل پہاڑ پر موقوف نہیں۔ آپ نے یہ بات سنی ہوگی:

خدا اس پاس، یہ ڈھونڈے جنگل میں
ڈھنڈورا شہر میں، لڑکا بغل میں

اگر منصفی فرمائیے، اور اس فدوی کی عرض قبول کیجئے تو بہتر یوں ہے کہ جہاں پناہ، ہر دم اور ہر ساعت دھیان اپنا خدا کی طرف لگا کر، دعا مانگا کریں۔ اس کی درگاہ سے کوئی محروم نہیں رہا۔ دن کو بندوبست ملک کا اور انصاف، عدالت غریب غربا کی فرمائیں، تو بندے خدا کے، دامن دولت کے سائے میں امن و اماں، خوش گزران رہیں۔ اور رات کو عبادت کیجئے، اور درود پیمبر کی روح پاک کو بیاد کر کر درویش گوشہ نشین متوکلوں سے مدد لیجئے، اور روزینہ یتیم، اسیر، عیالدار، محتاجوں اور رانڈ بیواؤں کو دیجئے۔ ایسے اچھے کاموں اور نیک نیتوں کی برکت سے، خدا چاہے تو امید قوی ہے کہ تمہارے دل کے مقصد اور مطلب سب پورے ہوں۔ اور جس واسطے مزاج عالی فکر مند رہا ہے، وہ آرزو بر آوے، اور خوشی خاطر شریف کو ہو۔ اللہ کی عنایت پر نظر رکھیے کہ وہ ایک دم میں جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔" بارے خردمند وزیر نے، ایسی ایسی عرض معروض کرنے سے، آزاد بخت کے دل کو ڈھارس بندھی۔ فرمایا "اچھا، تو جو کہتا ہے، بھلا یہ بھی کر دیکھیں۔ آگے جو اللہ کی مرضی ہے، سو ہوگا۔"

جب بادشاہ کے دل کو تسلی ہوئی، تب وزیر سے پوچھا کہ "اور سب امیر و دبیر کیا کرتے ہیں اور کس طرح ہیں؟" اس نے عرض کی کہ "سب ارکان دولت قبلۂ عالم کے جان و مال کو دعا کرتے ہیں۔ آپ کا فکر سے سب حیران و پریشان ہو رہے ہیں۔ جمال مبارک اپنا دکھائیے تو سب کی خاطر جمع ہووے۔ چنانچہ اسی وقت دیوان عام میں حاضر ہیں۔" یہ سن کر بادشاہ نے حکم کیا "انشاءاللہ کل

دربار کروں گا، سب کو کہہ دو حاضر رہیں۔" خردمند یہ وعدہ سن کر خوش ہوا، اور دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا دی کہ "جب تلک یہ زمین و آسمان برپا ہیں، تمہارا تاج و تخت قائم رہے۔" اور حضور سے رخصت ہو کر خوشی خوشی باہر نکلا، اور یہ خوش خبری اُمراؤں سے کہی۔ سب امیر ہنستی خوشی گھر کو گئے۔ سارے شہر میں آنند ہو گئی۔ رعیت پر جا بگن ہوئی کہ کل بادشاہ دربار عام کرے گا۔ صبح کو سب خانہ زاد، اعلیٰ و ادنیٰ اور ارکان دولت، چھوٹے بڑے، اپنے اپنے پائے اور مرتبے پر آ کر کھڑے ہوئے، اور منتظر جلوۂ بادشاہی کے تھے۔

جب پہر دن چڑھا، ایک بارگی پردہ اٹھا اور بادشاہ نے برآمد ہو کر تخت مبارک پر جلوس فرمایا۔ نوبت خانے میں شادیانے بجنے لگے۔ سبھوں نے نذریں مبارک بادی کی گزاریں اور مجرے گاہ میں تسلیمات و کورنشات بجا لائے۔ موافق قدر و منزلت کے ہر ایک کو سرفرازی ہوئی۔ سب کے دل کو خوشی اور چین ہوا۔ جب دوپہر ہوئی، برخاست ہو کر اندرون محل ہوئے۔ خاصہ نوش جان فرما کر خواب گاہ میں آرام کیا۔ اس دن سے بادشاہ نے یہی مقرر کیا کہ ہمیشہ صبح کو دربار کرنا، اور تیسرے پہر کتاب کا شغل، یاد و وظیفہ پڑھنا، اور خدا کی درگاہ میں توبہ استغفار کر کر، اپنے مطلب کی دعا مانگنی۔

ایک روز کتاب میں بھی لکھا دیکھا، کہ "اگر کسی شخص کو غم یا فکر ایسی لاحق ہو کہ اس کا علاج تدبیر سے نہ ہو سکے تو چاہیے کہ تقدیر کے حوالے کرے اور آپ گورستان کی طرف رجوع کرے۔ درود، طفیل پیغمبر کی روح کے، ان کو بخشے، اور اپنے تئیں نیست و نابود سمجھ کر، دل کو اس غفلت دنیوی سے ہشیار رکھے، اور عبرت سے رو دے، اور خدا کی قدرت کو دیکھے کہ مجھ سے آگے کیسے کیسے صاحب ملک و خزانہ اس زمین پر پیدا ہوئے، لیکن آسمان نے سب کو اپنی گردش میں لا کر خاک میں ملا دیا! یہ کہاوت ہے:

چلتی چکی دیکھ کر، دیا کبیرا رو
دو پاٹن کے بیچ آ، ثابت گیا نہ کو

اب جو دیکھیے، سوائے ایک مٹی کے ڈھیر کے اُن کا کچھ نشان باقی نہیں رہا، اور سب دولت دنیا، گھر بار، آل اُولاد، آشنا دوست، نوکر چاکر، ہاتھی گھوڑے چھوڑ کر کیلے پڑے ہیں۔ یہ سب ان کے کچھ کام نہ آیا، بلکہ اب کوئی نام بھی نہیں جانتا کہ یہ کون تھے اور قبر کے اندر کا احوال معلوم نہیں کیڑے مکوڑے، چیونٹے سانپ ان کو کھا گئے یا ان پر کیا بیتی اور خدا سے کیسی بنی۔ یہ باتیں اپنے دل

میں سوچ کر ساری دنیا کو سیکھنے کا کھیل جانے، تب اس کے دل کا غنچہ ہمیشہ شگفتہ رہے گا، کسو حالت میں پژمردہ نہ ہوگا۔"

یہ نصیحت جب کتاب میں مطالعہ کی، بادشاہ کو خردمند وزیر کا کہنا یاد آیا اور دونوں کو مطابق پایا۔ یہ شوق ہوا کہ اس پر عمل کروں لیکن سوار ہو کر، اور بھیڑ بھاڑ لے کر بادشاہوں کی طرح سے جانا اور پھرنا، مناسب نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ لباس بدل کر، رات کو، اکیلے مقبروں یا کسی مردِ خدا گوشہ نشین کی خدمت میں جایا کروں، اور شب بیدار رہوں، شاید ان مردوں کے وسیلے سے دنیا کی مراد اور عاقبت کی نجات میسّر ہو۔

یہ بات دل میں مقرر کر کے ایک روز رات کو موٹے موٹے کپڑے پہن کر، کچھ اشرفی روپے لے کر، چپکے قلعے سے باہر نکلے اور میدان کی راہ لی۔ جاتے جاتے ایک گورستان میں پہنچے، نہایت صدقِ دل سے درود پڑھ رہے تھے، اور اس وقت بادِ تند چل رہی تھی، بلکہ آندھی کہا چاہیے۔ ایک بارگی بادشاہ کو دور سے ایک شعلہ سا نظر آیا کہ مانند صبح کے تارے کے روشن ہے۔ دل میں اپنے خیال کیا کہ آندھی اور اندھیرے میں یہ روشنی، خالی حکمت سے نہیں۔ یا یہ طلسم ہے کہ اگر پھلکڑی اور گندھک کو، چراغ میں، بتی کے آس پاس چھڑک دیجئے، تو کیسی ہی ہوا چلے چراغ گل نہ ہوگا۔ یا کسو ولی کا چراغ جلتا ہے۔ جو کچھ ہو سو ہو، چل کر دیکھا چاہیئے، شاید اس شمع کے نور سے میرے بھی گھر کا چراغ روشن ہو اور دل کی مراد ملے۔ یہ نیت کر کے اس طرف کو چلے۔ جب نزدیک پہنچے، دیکھا تو چار فقیر بے نوا، کفنیاں گلے میں ڈالے اور سر زانو پر دھرے، عالم بے ہوشی میں خاموش بیٹھے ہیں اور ان کا یہ عالم ہے جیسے کوئی مسافر اپنے ملک اور قوم سے بچھڑ کر بے کسی اور مفلسی کے رنج و غم میں گرفتار ہو کر حیران رہ جاتا ہے۔ اسی طرح سے یہ چاروں نقشِ دیوار ہو رہے ہیں، اور ایک چراغ پتھر پر دھرا ٹمٹما رہا ہے۔ ہر گز ہوا اس کو نہیں لگتی۔ گویا فانوس اس کی آسمان بنا ہے کہ بے خطرے جلتا ہے۔

آزاد بخت کو دیکھتے ہی یقین آیا کہ مقرر، تیری آرزو ان مردانِ خدا کے قدم کی برکت سے بر آوے گی، اور تیری امید کا سوکھا درخت ان کی توجہ سے ہرا ہو کر پھلے گا۔ ان کی خدمت میں چل کر اپنا احوال کہہ اور مجلس کا شریک ہو۔ شاید تجھ پر رحم کھا کر دعا کریں جو بے نیاز کے یہاں قبول ہو۔ یہ ارادہ کر کر، چاہا کہ قدم آگے دھرے، وہیں عقل نے سمجھایا کہ "اے بیوقوف! جلدی نہ کر۔ ذرا دیکھ لے تجھے کیا معلوم ہے کہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ اور کیدھر جاتے

ہیں؟ کیا جانیں یہ غول بیابانی ہیں کہ آدمی کی صورت بن کر مل بیٹھے ہیں۔ بہر صورت جلدی کرنا اور ان کے درمیان جا کر مخل ہونا خوب نہیں۔ ابھی ایک گوشے میں چھپ کر حقیقت ان درویشوں کی جاننا چاہیئے۔" آخر بادشاہ نے یہی کیا کہ ایک کونے میں اس مکان کے، چپکا جا بیٹھا کہ کسو کو اس کے آنے کی آہٹ کی خبر نہ ہوئی، اپنا دھیان ان کی طرف لگایا کہ دیکھئے آپس میں کیا بات چیت کرتے ہیں۔ اتفاقاً ایک فقیر کو چھینک آئی، شکر خدا کا کیا۔ وہ تینوں قلندر اس کی آواز سے چونک پڑے۔ چراغ کو اکسایا، ٹھیپ تو روشن تھا، اپنے اپنے بستروں پر حقے بھر کر پینے لگے ایک ان آزادوں میں سے بولا "اے یاران ہمدرد و رفیقان جہاں گرد! ہم چار صورتیں، آسمان کی گردش سے اور لیل و نہار کے انقلاب سے، در بہ در خاک بہ سر، ایک مدت سے ہیں۔ الحمد للہ کہ طالع کی مدد اور قسمت کی یاوری سے، آج اس مقام پر باہم ملاقات ہوئی اور کل کا احوال کچھ معلوم نہیں کہ کیا پیش آوے۔ ایک گمنت رہیں یا جدا جدا ہو جاویں۔ رات بڑی پہاڑ ہوتی ہے۔ ابھی پڑ پڑ رہنا خوب نہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ اپنی اپنی سرگزشت جو اس دنیا میں جس پہ بیتی ہو البتہ بشرطیکہ جھوٹ اس میں کوڑی بھر نہ ہو) بیان کرے، تو باتوں میں رات کٹ جائے جب تھوڑی شب باقی رہے، تب لوٹ پوٹ رہیں گے۔" سبھوں نے کہا "یا ہادی! جو کچھ ارشاد ہوتا ہے ہم نے قبول کیا، پہلے آپ ہی اپنا احوال جو دیکھا ہے شروع کیجئے تو ہم مستفید ہوں۔"

اردو میں مشکل الفاظ کی بہترین فرہنگ

فیروز اللغات (جیبی ایڈیشن)

(فوٹو آفسٹ سے طبع شدہ)

طلباء اور معمور میں حصہ لینے والے شائقین کے لئے اس لغت میں:

- بیس ہزار سے زیادہ الفاظ اور ان کے معانی ہیں۔
- تمام الفاظ پر اعراب لگائے گئے ہیں تاکہ صحیح تلفظ کیا جا سکے۔
- ہر اسم کی تذکیر و تانیث بھی بتائی گئی ہے۔
- اس میں تمام متداول اور مشکل الفاظ ہیں جو درسی اور ادبی کتب اور اخبارات و رسائل میں استعمال ہوتے ہیں۔
- وہ تمام افعال دیئے گئے ہیں جن کے ساتھ کوئی محاورہ وابستہ ہے۔

قیمت مجلد: ۸۰۰

سیر پہلے درویش کی

پہلا درویش دو زانو ہو بیٹھا اور اپنی سیر کا قصہ اس طرح سے کہنے لگا :

"یا معبود اللہ! ذرا ادھر متوجہ ہو، اور ماجرا اس بے سروپا کا سنو!

یہ سرگزشت میری ذرا کان دھر سنو!
مجھ کو فلک نے کر دیا زیر و زبر سنو!
جو کچھ کہ پیش آئی ہے شدت میرے تئیں
اُس کا بیان کرتا ہوں، تم سربہ سر سنو!

اے یاران! میری پیدائش اور وطن بزرگوں کا، ملک یمن ہے۔ والد اس عاجز کا، ملک التجار خواجہ احمد نام، بڑا سوداگر تھا۔ اس وقت میں کوئی مہاجن یا بے پاری اُن کے برابر نہ تھا۔ اکثر شہروں میں کوٹھیاں اور گماشتے، خرید و فروخت کے واسطے مقرر تھے، اور لاکھوں روپے نقد، اور جنس ملک ملک کی، گھر میں موجود تھی۔ ان کے یہاں دو لڑکے پیدا ہوئے: ایک تو یہی فقیر، جو کفنی سیلی پہنے ہوئے، مرشدوں کی حضوری میں حاضر اور بولتا ہے۔ دوسرے، ایک بہن جس کو قبلہ گاہ نے اپنے جیتے جی، اور شہر کے سوداگر بچے سے شادی کر دی تھی۔ وہ اپنی سسرال میں رہتی تھی۔ غرض جس کے گھر میں اتنی دولت اور ایک لڑکا ہو، اُس کے لاڈ پیار کا کیا ٹھکانا ہے؟ مجھ فقیر نے بڑے چاؤ چوزے ماں باپ کے سائے میں پرورش پائی۔ اور پڑھنا لکھنا، سپاہ گری کا کسب فن، سوداگری کا بہی کھاتا، روزنامچہ سیکھنے لگا۔ چودہ برس تک نہایت خوشی اور بے فکری میں گزرے۔ کچھ دنیا کا اندیشہ دل میں نہ آیا۔ یک بہ یک ایک ہی سال میں والدین قضائے الٰہی سے مر گئے۔

عجب طرح کا غم ہوا جس کا بیان نہیں کر سکتا۔ ایک بارگی یتیم ہو گیا۔ کوئی سر پر بوڑھا بڑا نہ رہا۔ اس مصیبت ناگہانی سے رات دن رویا کرتا۔ کھانا پینا سب چھوٹ گیا۔ چالیس دن جوں توں کر کے کٹے۔ چہلم میں اپنے بیگانے چھوٹے بڑے جمع ہوئے۔ جب فاتحہ سے فراغت ہوئی، سب نے فقیر کو باپ کی پگڑی بندھوائی، اور سمجھایا کہ دنیا میں سب کے ماں باپ مرتے آئے ہیں، اور اپنے تئیں بھی ایک روز مرنا ہے۔ پس صبر کرو۔ اپنے گھر کو دیکھو۔ اب باپ کی جگہ تم سردار ہوئے، اپنے کاروبار

لین دین سے ہوشیار رہو۔ تسلّی دے کر مجھے رخصت ہوئے۔ گماشتے کاروباری، نوکر چاکر جتنے تھے آن کر حاضر ہوئے، نذریں دیں اور بولے "کوٹھی نقد و جنس کی، اپنی نظر مبارک سے دیکھ لیجئے۔" ایک بارگی جو اس دولت بے انتہا پر نگاہ پڑی، آنکھیں کھل گئیں۔ دیوان خانے کی تیاری کو حکم کیا۔ فراشوں نے فرش فروش بچھا کر چھت، پردے، چلونیں تکلف کی، لگا دیں اور اچھے اچھے خدمت گار، دیدہ رو نوکر رکھے۔ سرکار سے زرق برق کی پوشاکیں بنوا دیں۔ فقیر مسند پر تکیہ لگا کر بیٹھا۔ ویسے ہی آدمی غنڈے، بھانکڑے، مفت بر کھانے پینے والے، جھوٹے خوشامدی، آکر آشنا ہوئے اور مصاحب بنے۔ اُن سے آٹھ پہر صحبت رہنے لگی، ہر کہیں کی باتیں اور زٹلیں، واہی تباہی ادھر اُدھر کی کرتے اور کہتے "اس جوانی کے عالم میں کیتکی کی شراب یا گل گلاب کھنچوائیے، نازنین معشوقوں کو بلوا کر اُن کے ساتھ پیجئے اور عیش کیجئے۔"

غرض آدمی کا شیطان آدمی ہے۔ ہر دم کے کہنے سننے سے اپنا بھی مزاج بہک گیا۔ شراب ناچ اور جوئے کا چرچا ہوا۔ پھر تو یہ نوبت آئی کہ سوداگری بھول کر تماش بینی کا اور دینے لینے کا سودا ہوا۔ اپنے نوکر اور رفیقوں نے جب یہ غفلت دیکھی، جو جس کے ہاتھ پڑا، الگ کیا۔ گویا لوٹ مچا دی۔ کچھ خبر نہ تھی کتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے، کہاں سے آتا اور کیدھر جاتا ہے۔ مالِ مفت دلِ بے رحم۔ اس درخرچی کے آگے، اگر گنج قارون کا ہوتا تو بھی وفا نہ کرتا۔ کئی برس کے عرصے میں ایک بارگی یہ حالت ہوئی کہ فقط ٹوپی اور لنگوٹی باقی رہی۔ دوست آشنا جو دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے اور چمچہ بھر خون اپنا، ہر بات میں نثار کرتے تھے، کافور ہو گئے۔ بلکہ راہ باٹ میں اگر کہیں بھینٹ ملاقات ہو جاتی تو آنکھیں چرا کر منہ پھیر لیتے۔ اور نوکر چاکر، خدمت گار، بہلیے، ڈسلیت، خاص بردار، صابت خانی، سب چھوڑ کر کنارے لگے۔ کوئی بات کا پوچھنے والا نہ رہا جو کہے دو یہ کیا تمہارا حال ہوا؟ سوائے غم اور افسوس کے کوئی رفیق نہ ٹھہرا۔

اب دمڑی کی ٹھڈیاں میسر نہیں جو چبا کر پانی پیوں۔ دو تین فاقے کڑاکے کھینچے۔ تاب بھوک کی نہ لا سکا۔ لاچار، بے حیائی کا برقع منہ پر ڈال کر یہ قصد کیا کہ بہن کے پاس چلیے۔ لیکن یہ شرم دل میں آتی تھی کہ قبلہ گاہ کی وفات کے بعد، نہ بہن سے کچھ سلوک کیا، نہ خالی خط لکھا بلکہ اس نے خط خطوط ماتم پرسی اور اشتیاق کے جو لکھے، اُن کا بھی جواب اس خواب خرگوش میں نہ بھیجا۔ اس شرمندگی سے جی تو نہ چاہتا تھا، پر سوائے اس گھر کے اور کوئی ٹھکانا نظر میں نہ ٹھہرا۔ جوں توں، پا پیادہ، خالی ہاتھ، گرتا پڑتا، ہزار محنت سے وہ کئی منزلیں کاٹ کر ہمشیرہ کے

شہر میں جاکر اُس کے مکان پر پہنچا۔ وہ ماں جائی میرا یہ حال دیکھ کر بلائیں لی اور گلے مل کر بہت روئی۔ تیل، ماش اور کالے ٹکے، مجھ پر سے صدقے کیے۔ کہنے لگی "اگرچہ ملاقات سے دل بہت خوش ہوا لیکن بھیا، تیری یہ کیا صورت بنی؟" اس کا جواب میں کچھ نہ دے سکا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر چپکا ہو رہا۔ بہن نے جلدی، خاصی پوشاک سلوا کر حمام میں بھیجا۔ نہا دھو کر وہ کپڑے پہنے۔ ایک مکان اپنے پاس، بہت اچھا تکلف کا، میرے رہنے کو مقرر کیا۔ صبح کو شربت اور لوزیات، حلوا سوہن، پستہ، مغزی ناشتے کو، اور تیسرے پہر میوے، خشک و تر، پھل پھلاری، اور رات دن دونوں وقت پلاؤ، نان، قلیے، کباب، تحفہ تحفہ، مزے دار منگوا کر، اپنے روبرو کھلا کر جاتی۔ سب طرح خاطرداری کرتی۔ میں نے ویسی تصدیع کے بعد جو یہ آرام پایا، خدا کی درگاہ میں ہزار ہزار شکر بجا لایا۔ کئی مہینے اس فراغت سے گزرے کہ پاؤں اس خلوت سے باہر نہ رکھا۔

ایک دن، وہ بہن جو بجائے والدہ کے میری خاطر رکھتی تھی، کہنے لگی "اے بیرن! تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں، باغ باغ ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا، لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لیے بنایا ہے۔ گھر میں بیٹھے رہنا اُن کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے، اُس کو دنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں۔ خصوصاً اس شہر کے آدمی چھوٹے بڑے، بے سبب تمہارے رہنے پر کہیں گے، اپنے باپ کی دولت دنیا کھو، کر بہنوئی کے ٹکڑوں پر آ پڑا۔ یہ نہایت بے غیرتی اور میری تمہاری ہنسائی اور ماں باپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے۔ نہیں تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا کر تجھے پہناؤں اور کلیجے میں ڈال رکھوں۔ اب یہ صلاح ہے کہ سفر کا قصد کرو۔ خدا چاہے تو دن پھریں اور اس حیرانی و مفلسی کے بدلے خاطرجمعی اور خوشی حاصل ہو۔" یہ بات سن کر مجھے بھی غیرت آئی۔ اس کی نصیحت پسند کی۔ جواب دیا "اچھا۔ اب تم ماں کی جگہ ہو، جو کہو سو کروں۔" یہ مرضی پا کر، گھر میں جا کے، پچاس توڑے اشرفی کے اصیل لونڈیوں کے ہاتھوں میں لوا کر میرے آگے لا رکھے اور بولی "ایک قافلہ سوداگروں کا دمشق کو جاتا ہے۔ تم ان روپیوں سے جنس تجارت کی خرید کرو۔ ایک تاجر ایماندار کے حوالے کر کے، دستاویز پکی لکھوا لو۔ اور آپ بھی قصد دمشق کا کرو۔ وہاں جب خیریت سے جا پہنچو، اپنا مال مع منافع سمجھ بوجھ لیجو یا آپ بیچیو۔" میں وہ نقد لے کر بازار میں گیا۔ اسباب سوداگری کا خرید کر، ایک بڑے سوداگر کے سپرد کیا۔ نوشت و خواند سے خاطرجمع کر لی۔ وہ

تاجر، دریا کی راہ سے، جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ فقیر نے خشکی کے راستے چلنے کی تیاری کی۔ جب رخصت ہونے لگا، بہن نے ایک سری پاؤ بھاری اور ایک گھوڑا، جڑاؤ ساز سے تواضع کیا اور مٹھائی پکوان، ایک خاصدان میں بھر کر ہرنے سے لٹکا دیا، اور چھاگل پانی کی شکار بند میں بندھوا دی۔ امام ضامن کا روپیہ میرے بازو پر باندھا، دھی کا ٹیکا ماتھے پر لگا کر آنسو پی کر بولی "سدھارو! تمہیں خدا کو سونپا، پیٹھ دکھائے جاتے ہو، اسی طرح جلد اپنا منہ دکھائیو"۔ میں نے فاتحہ خیر کی پڑھ کر کہا "تمہارا بھی اللہ حافظ ہے"، میں نے قبول کیا۔ وہاں سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا، خدا کے توکل پر بھروسہ کر کے، دو منزل کی ایک منزل کرتا ہوا دمشق کے پاس جا پہنچا۔

غرض جب شہر کے دروازے پر گیا، بہت رات جا چکی تھی۔ دربان اور نگاہ بانوں نے دروازہ بند کیا تھا۔ میں نے بہت منت کی کہ "مسافر ہوں، دور سے دھاوا مارے آتا ہوں اگر کواڑ کھول دو، شہر میں جا کر دانے گھاس کا آرام پاؤں"۔ اندر سے گھرک کر بولے "اس وقت دروازہ کھولنے کا حکم نہیں۔ کیوں اتنی رات گئے تم آئے؟" جب میں نے جواب صاف اُن سے سنا، شہر پناہ کی دیوار کے تلے، گھوڑے پر سے اُتر، زین پوش بچھا کر بیٹھا۔ جاگنے کی خاطر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ جس وقت آدھی رات ادھر اور آدھی رات اُدھر ہوئی، سنسان ہو گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک صندوق قلعے کی دیوار پر سے نیچے چلا آتا ہے۔ یہ دیکھ کر میں اچنبھے میں ہوا کہ یہ کیا طلسم ہے؟ شاید خدا نے میری حیرانی و پریشانی پر رحم کھا کر خزانہ غیب سے عنایت کیا۔ جب وہ صندوق زمین پر ٹھہرا، ڈرتے ڈرتے میں پاس گیا۔ دیکھا تو کاٹھ کا صندوق ہے۔ لاچار سے اُسے کھولا۔ ایک معشوق خوبصورت، کامنی سی عورت (جس کے دیکھنے سے ہوش جاتا رہے) گھایل، لہو میں تربتر، آنکھیں بند کئے، پڑی کلبلاتی ہے آہستہ آہستہ ہونٹ ہلتے ہیں اور یہ آواز منہ سے نکلتی ہے، "اے کم بخت بے وفا! اے ظالم پرجفا! بدلا اس بھلائی اور محبت کا، یہی تھا جو تو نے کیا؟ بھلا ایک زخم اور بھی لگا۔ میں نے اپنا تیرا انصاف خدا کو سونپا"۔ یہ کہہ کر، اسی بے ہوشی کے عالم میں، دوپٹے کا آنچل منہ پر لے لیا۔ میری طرف دھیان نہ کیا۔

فقیر اس کو دیکھ کر اور یہ بات سن کر سن ہوا۔ جی میں آیا "کسی بے حیا ظالم نے کیوں ایسے نازنین صنم کو زخمی کیا؟ کیا اُس کے دل میں آیا؟ اور ہاتھ اس پر کیوں کر چلایا؟ اس کے دل میں

تو محبت اب تلک باقی ہے، جو اس جان کندنی کی حالت میں اُس کو یاد کرتی ہے۔" میں آپ ہی آپ یہ کہہ رہا تھا، آواز اُس کے کان میں گئی، ایک مرتبہ پڑا منہ سے سر اُٹھا کر مجھ کو دیکھا۔ جس وقت اس کی نگاہیں میری نظروں سے لڑیں، مجھے غش آنے اور جی سنسنانے لگا۔ بہ زور اپنے تئیں تھانبا، جرأت کر کے پوچھا "سچ کہو، تم کون ہو اور یہ کیا ماجرا ہے؟ اگر بیان کرو تو میرے دل کو تسلی ہو۔" یہ سن کر، اگرچہ طاقت بولنے کی نہ تھی آہستے سے کہا "شکر ہے۔ میری حالت زخموں کے مارے یہ کچھ ہو رہی ہے، کیا خاک بولوں؟ کوئی دم کی مہمان ہوں، جب میری جان نکل جاوے تو خدا کے واسطے، جواں مردی کر کے، مجھ بدبخت کو اسی صندوق میں کسی جگہ گاڑ دیجو، تو میں بھلے بُرے کی زبان سے نجات پاؤں اور تو داخل ثواب کے ہو۔" اتنا بول کر چپ ہو گئی۔

رات کو مجھ سے کچھ تدبیر نہ ہو سکی، وہ صندوق اپنے پاس اٹھا لایا، اور گھڑیاں گننے لگا کہ کب اتنی رات تمام ہو تو فجر کو شہر میں جا کر جو کچھ علاج اس کا ہو سکے بہ مقدور اپنے کروں۔ وہ تھوڑی سی رات ایسی پہاڑ ہو گئی کہ دل گھبرا گیا۔ بارے خدا خدا کر، صبح جب نزدیک ہوئی مرغ بولا، آدمیوں کی آواز آنے لگی، میں نے فجر کی نماز پڑھ کر، صندوق کو خورجی میں کسا جو ہی دروازہ کھلا، میں شہر میں داخل ہوا۔ ہر ایک آدمی اور دکان دار سے حویلی کرائے کی تلاش کرنے لگا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک مکان خوش قطع، نیا، فراغت کا، بھاڑے لے کر جا اُترا۔ پہلے اُس معشوق کو صندوق سے نکال کر روئی کے پہلوں پر ملائم بچھونا کر کے، ایک گوشے میں لٹایا، اور آدمی اعتباری وہاں چھوڑ کر فقیر جراح کی تلاش میں نکلا۔ ہر ایک سے پوچھتا پھرتا تھا کہ اس شہر میں جراح کاریگر کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟ ایک شخص نے کہا "ایک حجام جراحی کے کسب اور حکیمی کے فن میں یکتا ہے، اور اس کام میں نپٹ پکا ہے۔ اگر مردے کو اُس کے پاس لے جاؤ، خدا کے حکم سے ایسی تدبیر کرے کہ ایک بار وہ بھی جی اُٹھے۔ وہ اسی محلے میں رہتا ہے اور عیسیٰ نام ہے۔"

میں یہ مژدہ سن کر بے اختیار چلا۔ تلاش کرتے کرتے، ڈھونڈتے سے اس کے دروازے پر پہنچا۔ ایک مرد سفید ریش کو دہلیز پر بیٹھا دیکھا، اور کئی آدمی مرہم کی تیاری کے لیے، کچھ پیس رہے تھے۔ فقیر نے مارے خوشامد کے، ادب سے سلام کیا اور کہا "میں تمہارا نام اور خوبیاں سن کر آیا ہوں۔ ماجرا یہ ہے کہ میں اپنے ملک سے تجارت کے لیے چلا، قبیلے کو

بہ سبب محبت کے، ساتھ لیا۔ جب نزدیک اس شہر کے آیا، تھوڑی سی دُور رہا تھا کہ شام پڑ گئی۔ ان دیکھے ملک میں رات کو چلنا مناسب نہ جانا۔ میدان میں ایک درخت کے تلے اتر پڑا۔ پچھلے پہر ڈاکا آیا، جو کچھ مال اسباب پایا لوٹ لیا، گہنے کے لالچ سے اس بی بی کو بھی گھائل کیا۔ مجھ سے کچھ نہ ہو سکا۔ رات جو باقی تھی، جوں توں کر کاٹی۔ فجر ہی شہر میں آن کر ایک مکان کرائے لیا۔ اُن کو وہاں رکھ کر میں تمہارے پاس دوڑا آیا ہوں۔ خدا نے تمہیں یہ کمال دیا ہے۔ اس مسافر پر مہربانی کر، غریب خانے تشریف لے چلو۔ اس کو دیکھو۔ اگر اس کی زندگی ہوئی تو تم کو بڑا جس ہوگا، اور میں ساری عمر غلامی کروں گا۔" عیسیٰ جراح بہت رحمدل اور خدا پرست تھا میری غریبی کی باتوں پر ترس کھا کر، میرے ساتھ اس حویلی تک آیا۔ زخموں کو دیکھتے ہی میری تسلی کی۔ بولا کہ "خدا کے کرم سے، اس بی بی کے زخم چالیس دن میں بھر آویں گے۔ غسل شفا کا کروا دوں گا۔"

غرض اس مرد خدا نے سب زخموں کو نیم کے پانی سے، دھو دھا کر، صاف کیا۔ جو لائق ٹانکوں کے پائے، انہیں سیا۔ باقی گھاؤں پر، اپنی کھیسے سے ایک ڈبیا نکال کر، کتنوں میں بتّی رکھی اور کتنوں پر پھائے چڑھا کر، پٹی سے باندھ دیا اور نہایت شفقت سے کہا "میں دونوں وقت آیا کروں گا۔ تو خبردار رہیو ایسی حرکت نہ کرے جو ٹانکے ٹوٹ جائیں۔ مرغ کا شوربا بجائے غذا اس کے حلق میں چوائیو اور اکثر عرق بید مشک گلاب کے ساتھ دیا کیجیو جو قوت رہے۔" یہ کہہ کر رخصت چاہی۔ میں نے بہت منت کی اور ہاتھ جوڑ کر کہا، "تمہاری تشفی دینے سے میری بھی زندگی ہوئی، نہیں تو سوائے مرنے کے کچھ سوجھتا نہ تھا۔ خدا تمہیں سلامت رکھے۔" عطر پان دے کر رخصت کیا۔ میں رات دن خدمت میں اس پری کے حاضر رہتا۔ آرام اپنے اوپر حرام کیا۔ خدا کی درگاہ سے روز روز اُس کے چنگے ہونے کی دعا مانگتا۔

اتفاقاً وہ سوداگر بھی آ پہنچا، اور میرا مال امانت میرے حوالے کیا۔ میں نے اسے اونے پونے بیچ ڈالا، اور دارو درمن میں خرچ کرنے لگا۔ وہ مرد جراح ہمیشہ آتا جاتا، تھوڑے عرصے میں سب زخم بھر کر انگور کر لائے۔ بعد کئی دن کے غسل شفا کا کیا۔ عجب طرح کی خوشی حاصل ہوئی۔ خلعت اور اشرفیاں عیسیٰ حجام کے آگے دھریں اور اس پری کو مکلف فرش بچھا کر، مسند پر بٹھایا۔ فقیر غریبوں کو بہت سی خیر خیرات کی۔ اس دن گویا بادشاہت ہفت اقلیم کی، اس فقیر کے ہاتھ لگی، اور اس پری کا شفا پانے سے البتہ رنگ نکھرا کہ چہرا سورج کی مانند چمکنے اور کندن کی طرح دمکنے لگا۔ نظر کی مجال نہ تھی جو اس کے جمال پر ٹھہرے۔ فقیر بسر و چشم اس کے حکم میں حاضر رہتا۔

فرماتی سو بجا لاتا۔ وہ اپنے حسن کے غرور اور سرداری کے دماغ میں، جو میری طرف کبھو دیکھتی تو فرماتی "خبردار، اگر تجھے ہماری خاطر منظور ہے تو ہرگز ہماری بات میں دم نہ ماریو۔ جو ہم کہیں، سو بلا عذر کیے جاؤ۔ اپنا کسی بات میں دخل نہ کریو، نہیں تو پچھتاوے گا۔" اس کی وضع سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ حق، میری خدمت گزاری اور فرماں برداری کا، اسے البتہ منظور ہے۔ فقیر بھی اس کی بے مرضی ایک کام نہ کرتا۔ اس کا فرمانا بسر و چشم بجا لاتا۔

ایک مدت اسی راز و نیاز میں کٹی۔ جو اس نے فرمائش کی، وونہیں میں نے لا کر حاضر کی۔ اس فقیر پاس، جو کچھ جنس اور نقد اصل و نفع کا تھا سب صرف ہوا۔ اس بیگانہ ملک میں کون اعتبار کرے جو قرض دام سے کام چلے؟ آخر تکلیف روز مرے کے خرچ کی ہونے لگی۔ اس سے دل بہت گھبرایا۔ فکر سے دبلا ہوتا چلا۔ چہرے کا رنگ کلجھواں ہو گیا، لیکن کس سے کہوں؟ جو کچھ دل پر گزری سو گزری، قہر درویش بر جان درویش۔ ایک دن اس پری نے اپنے شعور سے دریافت کر کے کہا "اے فلانے! تیری خدمتوں کا حق ہمارے جی میں نقش کالحجر ہے، پر اس کا عوض بالفعل ہم سے نہیں ہو سکتا۔ اگر واسطے خرچ ضروری کے، کچھ درکار ہو تو اپنے دل میں اندیشہ نہ کر۔ ایک ٹکڑا کاغذ اور قلم دوات حاضر کر۔" میں نے تب معلوم کیا، کسی ملک کی بادشاہ زادی ہے جو اس دل و دماغ سے گفتگو کرتی ہے فی الفور قلم دان آگے رکھ دیا۔ اس نازنین نے ایک شقہ دستخط خاص سے لکھ کر میرے حوالے کیا اور کہا "قلعے کے پاس ترپولیا ہے، وہاں اس کوچے میں ایک حویلی بڑی سی ہے، اس مکان کے مالک کا نام سیدی بہار ہے۔ تو جا کر اس رقعے کو اس تلک پہنچا دے۔"

فقیر، موافق فرمانے اس کے، اسی نام و نشان پر منزل مقصود تک جا پہنچا۔ دربان کی زبانی کیفیت خط کی، کہلا بھیجی۔ وونہیں سنتے ہی ایک حبشی جواں، خوب صورت، ایک بینا طرح دار سجے ہوئے، باہر نکل آیا۔ اگرچہ رنگ سانولا تھا پر گویا تمام نمک بھرا ہوا۔ میرے ہاتھ سے خط لے لیا۔ نہ بولا نہ کچھ پوچھا۔ انہیں قدموں پھر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں گیارہ کشتیاں، سر بمہر زربفت کی تورہ پوش پڑے ہوئے، غلاموں کے سر پر دھرے۔ باہر آیا، کہا "اس جوان کے ساتھ جا کر جو گوشے پہنچا دو۔" میں بھی سلام کر، رخصت ہوا۔ اپنے مکان میں لایا۔ آدمیوں کو دروازے کے باہر سے رخصت کیا۔ کشتیاں، امانت، حضور میں اس پری کے گزرانیاں۔ دیکھ کر فرمایا "یہ گیارہ بدرے اشرفیوں کے لے اور خرچ میں لا۔ خدا رزاق ہے۔" فقیر اس نقد کو لے کر ضروریات میں خرچ کرنے لگا۔ اگرچہ خاطر جمع ہوئی، پر دل میں خلش رہی آیا کہ یہ کیا صورت ہے۔ بغیر پوچھے گچھے، ناتا ناآشنا

صورت اجنبی نے، ایک پُرزے کاغذ پر، میرے حوالے کیا: "اگر اس پری سے بھید پوچھوں، تو اس نے پہلے ہی منع کر رکھا تھا۔ مارے ڈر کے دم نہیں مار سکتا تھا۔

بعد آٹھ دن کے، وہ معشوقہ مجھ سے مخاطب ہوئی "حق تعالیٰ نے آدمی کو انسانیت کا جامہ عنایت کیا ہے کہ نہ پھٹے نہ میلا ہو۔ اگرچہ پرانے کپڑے سے اس کی آدمیت میں فرق نہیں آتا، پر ظاہر میں خلق اللہ کی نظروں میں اعتبار نہیں پاتا۔ دو توڑے اشرفی کے ساتھ لے کر، چوک کے چوراہے پر یوسف سوداگر کی دکان میں جا اور کچھ رقم جواہر کے بیش قیمت اور دو خلعتیں زرق برق کی مول لے آ۔" فقیر وہیں سوار ہو کر اس کی دکان پر گیا۔ دیکھا تو ایک جوان شکیل، زعفرانی جوڑا پہنے، گدی پر بیٹھا ہے، اور اس کا یہ عالم ہے کہ ایک عالم دیکھنے کے لیے، دکان سے بازار تک، کھڑا ہے۔ فقیر کمال شوق سے نزدیک جا کر، سلام علیک کر کر، بیٹھا اور جو جو چیز مطلوب تھی طلب کی۔ میری بات چیت اس شہر کے باشندوں کی سی نہ تھی۔ اُس جوان نے گرم جوشی سے کہا "جو صاحب کو چاہیے موجود ہے، لیکن یہ فرمائیے کس ملک سے آنا ہوا؟ اور اس اجنبی شہر میں رہنے کا کیا باعث ہے؟ اگر اس حقیقت سے مطلع کیجیے تو مہربانی سے بعید نہیں۔" میرے تئیں اپنا احوال ظاہر کرنا منظور نہ تھا۔ کچھ بات بنا کر اور جواہر پوشاک لے کر اور قیمت اس کی دیگر رخصت چاہی۔ اس جوان نے دو کھے پھیکے ہو کر کہا "اے صاحب! اگر تم کو ایسی ہی ناآشنائی کرنی تھی، تو پہلے دوستی، اتنی گرمی سے، کرنی کیا ضرور تھی؟ بھلے آدمیوں میں صاحب سلامت کا پاس بڑا ہوتا ہے۔" یہ بات اس مزے اور انداز سے کہی، بے اختیار دل کو بھائی اور بے مروّت ہو کر وہاں سے اٹھنا انسانیت کے مناسب نہ جانا۔ اُس کی خاطر پھر بیٹھا اور بولا "تمہارا فرمانا سر آنکھوں پر، میں حاضر ہوں۔"

اتنے کہنے سے بہت خوش ہوا، ہنس کر کہنے لگا "اگر آج کے دن غریب خانے پر کرم کیجیے تو تمہاری بدولت، مجلس خوشی کی جما کر، دو چار گھڑی دل بہلا دیں، اور کچھ کھانے پینے کا شغل باہم بیٹھ کر کریں۔" فقیر نے اُس پری کو، کچھ اکیلا نہ چھوڑا تھا۔ اُس کی تنہائی یاد کر کر، چند در چند عذر کیے، پر اُس جوان نے ہرگز نہ مانا۔ آخر وعدہ، ان چیزوں کو پہنچا کر، میرے پھر آنے کا لے کر، اور قسم کھلا کر رخصت کر دی۔ میں دکان سے اٹھ کر، جواہر اور خلعتیں اس پری کی خدمت میں لایا۔ اس نے قیمت جواہر کی اور حقیقت جوہری کی پوچھی۔ میں نے سارا احوال، مول تول کا اور مہمانی کے بجا ہونے کا کہہ سنایا۔ فرمانے لگی "آدمی کو اپنا قول قرار پورا

کرنا واجب ہے ہمیں خدا کی نگہبانی میں چھوڑ کر اپنے وعدے کو وفا کر، ضیافت قبول کرنی، سنت رسول کی ہے۔" تب میں نے کہا "میرا دل چاہتا نہیں کہ تمہیں اکیلا چھوڑ کر جاؤں، اور حکم یوں ہوتا ہے۔ لاچار جاتا ہوں، جب تک آؤں گا دل یہیں لگا رہے گا۔" یہ کہہ کر، پھر اس جوہری کی دکان پہ گیا۔ وہ مونڈھے پر بیٹھا میرا انتظار کھینچ رہا تھا۔ دیکھتے ہی بولا "آؤ مہربان بڑی راہ دکھائی۔"

وہیں اُٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور چلا۔ جاتے جاتے ایک باغ میں لے گیا۔ وہ بڑی بہار کا باغ تھا۔ حوض اور نہروں میں فوارے چھوٹتے تھے، میوے طرح بہ طرح کے پھل رہے تھے۔ ہر ایک درخت مارے بوجھ کے جھوم رہا تھا۔ رنگ برنگ کے جانور ان پر بیٹھے چہچہے کر رہے تھے۔ اور ہر مکان عالیشان میں، فرش ستھرا بچھا تھا۔ وہاں، لب نہر ایک بنگلے میں جا کر بیٹھا۔ ایک دم کے بعد آپ اُٹھ کر چلا گیا۔ پھر دوسری پوشاک معقول پہن کر آیا۔ میں نے دیکھ کر کہا "سبحان اللہ چشم بد دور"۔ سن کر مسکرا دیا اور بولا "مناسب یہ ہے کہ صاحب بھی اپنا لباس بدل ڈالیں۔" اس کی خاطر میں نے بھی دوسرے کپڑے پہنے۔ اُس جوان نے بڑی ٹیپ ٹاپ سے تیاری ضیافت کی کی، اور سامان خوشی کا جیسا چاہیے موجود کیا اور فقیر سے صحبت بہت گرم کر، مزے کی باتیں کرنے لگا۔ اتنے میں ساقی، صراحی و پیالہ بلور کا لے کر حاضر ہوا اور گزک کئی قسم کی، لا کے رکھی۔ نمک دان چن دیئے۔ دور شراب کا شروع ہوا۔ جب دو جام کی نوبت پہنچی، چار لڑکے، امرد، صاحب جمال، زلفیں کھولے ہوئے مجلس میں آئے، گانے بجانے لگے۔ یہ عالم ہوا اور ایسا سماں بندھا، اگر تان سین اُس گھڑی ہوتا تو اپنی تان بھول جاتا اور بیجو باورا سن کر باؤلا ہو جاتا۔ اس مزے میں ایک بارگی وہ جوان آنسو بھر لایا۔ دو چار قطرے بے اختیار نکل پڑے اور فقیر سے بولا "اب ہماری تمہاری دوستی جانی ہوئی۔ پس دل کا بھید دوستوں سے چھپانا کسو مذہب میں درست نہیں۔ ایک بات، بے تکلف آشنائی کے بھروسے، کہتا ہوں اگر حکم کرو تو اپنی معشوقہ کو بلوا کر اس مجلس میں تسلی اپنے دل کی کروں۔ اس کی جدائی سے جی نہیں لگتا۔"

یہ بات ایسے اشتیاق سے کہی کہ بغیر دیکھے بھالے، فقیر کا دل بھی مشتاق ہوا۔ میں نے کہا "مجھے تمہاری خوشی درکار ہے۔ اس سے کیا بہتر؟ دیر نہ کیجئے۔ سچ ہے، معشوق بن کچھ اچھا نہیں لگتا۔" اس جوان نے چلون کی طرف اشارت کی۔ وہیں ایک کالی کلوٹی، بھتنی سی، جس کے دیکھنے سے انسان بے اجل مر جاوے۔ جوان کے پاس آن بیٹھی۔ فقیر اس کے دیکھنے سے ڈر گیا۔ دل میں کہا "یہی بلا محبوبہ ایسے جوان پری زاد کی ہے جس کی اتنی تعریف اور اشتیاق ظاہر کیا؟" میں لاحول پڑھ کر چپ ہو

رہا۔ اسی عالم میں تین دن رات مجلس شراب اور راگ رنگ کی جمی رہی۔ چوتھی شب کو غلبہ نشے اور نیند کا ہوا۔ میں خواب غفلت میں بے اختیار سو گیا۔ جب صبح ہوئی، اُس جوان نے جگایا۔ کئی پیالے خمار شکنی کے پلا کر اپنی معشوقہ سے کہا "اب زیادہ تکلیف مہمان کو دینی خوب نہیں۔"

دونوں ہاتھ پکڑے اُٹھے، میں نے رخصت مانگی۔ خوشی بہ خوشی اجازت دی۔ تب میں نے جلد اپنے قدیمی کپڑے پہن لیے۔ اپنے گھر کی راہ لی، اور اس پری کی خدمت میں جا حاضر ہوا۔ مگر ایسا اتفاق کبھو نہ ہوا تھا کہ اسے تنہا چھوڑ کر شب باش کہیں ہوا ہوں۔ اس تین دن کی غیر حاضری سے نہایت خجل ہو کر عذر کیا، اور قصہ ضیافت کا اور اس کے نہ رخصت کرنے کا، سارا عرض کیا۔ وہ ایک دانا زمانے کی تھی، تبسم کر کے بولی "کیا مضائقہ، اگر ایک دوست کی خاطر رہنا ہوا! ہم نے معاف کیا، تیری کیا تقصیر ہے؟ آدمی کسو کے گھر جاتا ہے، تب اس کی مرضی سے پھر آتا ہے۔ لیکن یہ مفت کی مہمانیاں کھا پی کر چپکے ہو رہو گے یا اُس کا بدلا بھی اتارو گے؟ اب یہ لازم ہے کہ جا کر اُس سوداگر بچے کو اپنے ساتھ لے آؤ، اور اس سے دوچند ضیافت کرو۔ اور اسباب کا کچھ اندیشہ نہیں، خدا کے کرم سے ایک دم میں سب لوازمہ تیار ہو جاوے گا اور بہ خوبی مجلس ضیافت کی، رونق پاوے گی۔" فقیر موافق حکم کے، جوہری پاس گیا اور کہا "تمہارا فرمانا تو میں سر آنکھوں سے بجا لایا، اب تم بھی مہربانی کی راہ سے میری عرض قبول کرو۔" اُس نے کہا "جان و دل سے حاضر ہوں۔"

تب میں نے کہا "اگر اس بندے کے گھر تشریف لے چلو، عین غریب نوازی ہے۔" اس جوان نے بہت عذر اور حیلے کیے، پر میں نے پنڈ نہ چھوڑا، جب تلک وہ راضی ہوا، ساتھ ہی ساتھ اس کو اپنے مکان پر لے چلا۔ لیکن راہ میں یہی فکر کرتا تھا کہ آج اپنے تئیں مقدور ہوتا تو ایسی تواضع کرتا کہ یہ بھی خوش ہوتا۔ اب میں اسے لیے جاتا ہوں، دیکھیے کیا اتفاق ہوتا ہے۔ اسی حیص بیص میں گھر کے نزدیک پہنچا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ دروازے پر دھوم دھام ہو رہی ہے۔ گلیارے میں جھاڑو دے کر چھڑکاؤ کیا ہے، یسادل اور عصے بردار کھڑے ہیں۔ میں حیران ہوا، لیکن اپنا گھر جان کر قدم اندر رکھا۔ دیکھا تو تمام حویلی میں فرش مکلف، موافق ہر مکان کے، جا بجا بچھا ہے اور مسندیں لگی ہیں۔ پان دان، گلاب پاش، عطر دان، پیک دان، چنگیریں، نرگس دان قرینے سے دھرے ہیں۔ طاقوں پر رنگترے، کنولے، نارنگیاں اور گلابیاں، رنگ برنگ کی چنی ہیں۔ ایک طرف رنگ آمیز ابرک کی ٹٹیوں میں چراغاں کی بہار ہے، ایک طرف جھاڑ اور سرو، کنول کے روشن ہیں، اور تمام دالان اور شہ نشینوں میں طلائی شمع دانوں پر کافوری شمعیں چڑھی ہیں، اور جڑاؤ فانوس بلور،

اوپر دھری ہیں۔ سب آدمی اپنے اپنے عہدوں پر مستعد ہیں، باورچی خانے میں دیگیں ٹھنٹھنا رہی ہیں، آبدار خانے کی ویسی ہی تیاری ہے۔ کوری کوری ٹھلیاں، روپے کی گھڑونچیوں پر، صافیوں سے بندھیں اور پجروں سے ڈھکی رکھی ہیں، آگے چوکی پر ڈونگے، کٹورے، مع بھتالی، سرپوش دھرے، برف کے آب خورے لگ رہے ہیں اور شورے کی صراحیاں ہل رہی ہیں۔

غرض سب اسباب بادشاہانہ موجود ہے، اور کنچنیاں، بھانڈ، بھگتیے، کلاونت، قوال اچھی پوشاک پہنے، ساز کے سرملائے، حاضر ہیں۔ فقیر نے اس جوان کو لے جاکر مسند پر بٹھایا اور دل میں حیران تھا کہ یا الٰہی! اتنے عرصے میں یہ سب تیاری کیوں کر ہوئی؟ ہر طرف دیکھتا پھرتا تھا لیکن اس پری کا نشان کہیں نہ پایا۔ اسی جستجو میں ایک مرتبہ باورچی خانے کی طرف جا نکلا، دیکھتا ہوں تو وہ نازنین ایک مکان میں، گلے میں کرتی، پانوؤں میں تہ پوشی، سر پہ سفید رومالی اوڑھے ہوئے سادی خوزادی بن گئے بانے، بنی ہوئی:

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی
کہ جیسے خوش نما لگتا ہے دیکھو چاند بن گہنے

خبر گیری میں ضیافت کے لگ رہی ہے اور تاکید ہر ایک کھانے کی کر رہی ہے کہ خبردار بامزہ ہو اور آب و نمک، بو باس درست رہے۔ اس محنت سے وہ گلاب سا بدن سارا پسینے پسینے ہو رہا ہے۔

میں پاس جاکر تصدق ہوا اور اس شعور و لیاقت کو سراہ کر دعائیں دینے لگا۔ یہ خوشامد سن کر تیوری چڑھا کر بولی: "آدمی سے ایسے کام ہوتے ہیں کہ فرشتے کی مجال نہیں۔ میں نے ایسا کیا کیا ہے، جو تو اتنا حیران ہو رہا ہے؟ بس بہت باتیں بنانی مجھے خوش نہیں آتیں۔ بھلا کہہ تو، یہ کون آدمیت ہے کہ مہمان کو اکیلا بٹھلا کر ادھر اُدھر پڑے پھرتے ہو؟ وہ اپنے جی میں کیا کہتا ہوگا؟ جلد جا، مجلس میں بیٹھ کر مہمان کی خاطرداری کر اور اس کی معشوقہ کو بھی بلوا کر اس کے پاس بٹھلا۔" فقیر وونہیں اس جوان کے پاس گیا اور گرم جوشی کرنے لگا۔ اتنے میں دو غلام، صاحب جمال، صراحی اور جام جڑاؤ ہاتھ میں لیے روبرو آئے، شراب پلانے لگے۔ اس میں، میں نے اس جوان کو کہا: "میں سب طرح مخلص اور خادم ہوں، بہتر یہ ہے کہ وہ صاحب جمال کہ جس کی طرف دل صاحب کا مائل ہے، تشریف لاوے تو بڑی بات ہے۔ اگر فرماؤ تو آدمی بلانے کی خاطر جاوے۔" یہ سنتے ہی خوش ہو کر بولا: "بہت اچھا، اس وقت [illegible]" اس کی بات کہی۔ میں نے ایک خوجے کو بھیجا

جب آدھی رات گئی وہ پری بہت خاصی چوڈول پر سوار ہو کر بدے ناگہانی سی آپہنچی۔

فقیر نے لاچار، خاطر سے مہمان کی، استقبال کر کر، نہایت تپاک سے برابر اس جوان کے لا بٹھایا۔ جوان اس کو دیکھتے ہی ایسا خوش ہوا جیسے دنیا کی نعمت ملی، وہ چھتنی بھی اس جوان پری زاد کے گلے لپٹ گئی۔ یہ سچ یہ تماشا ہوا جیسے چودھویں رات کے چاند کو گہن لگتا ہے، جتنے مجلس میں آدمی تھے، اپنی اپنی انگلیاں دانتوں میں دبانے لگے کہ کیا کوئی بلا اس جوان پر مسلط ہوئی؟ سب کی نگاہ اسی طرف تھی۔ ناچ مجلس کا بھول کر اس کا تماشا دیکھنے لگے۔ ایک شخص کنارے سے بولا "یارو! عشق اور عقل میں ضد ہے۔ جو کچھ عقل میں نہ آوے، یہ کافر عشق کر دکھاوے۔ لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھوں سے دیکھو" سبھوں نے کہا "آمنا، یہی بات ہے۔"

یہ فقیر، بموجب حکم کے، مہمان داری میں حاضر تھا۔ ہر چند جوان، ہم پیالہ ہم نوالہ ہونے کو مجبور ہوتا تھا، پر میں ہرگز اس پری کے خوف کے مارے اپنا دل، کھانے پینے یا سیر تماشے کی طرف رجوع نہ کرتا تھا۔ اور عذر مہمان داری کا کر کے اس کے شامل نہ ہوتا۔ اسی کیفیت سے تین شبانہ روز گزرے، چوتھی رات وہ جوان، نہایت جوشش سے مجھے بلا کر کہنے لگا "اب ہم بھی رخصت ہوں گے، تمہاری خاطر اپنا سب کاروبار چھوڑ چھاڑ کر تین دن تمہاری خدمت میں حاضر ہیں، تم بھی تو ہمارے پاس ایک دم بیٹھ کر ہمارا دل خوش کرو۔" میں نے اپنے جی میں خیال کیا "اگر اس وقت، کہا اس کا، نہیں مانتا تو آزردہ ہوگا، پس نئے دوست اور مہمان کی خاطر رکھنی ضرور ہے" تب یہ کہا "صاحب کا حکم بجالانا منظور، کہ الامر فوق الادب"۔ سنتے ہی اس کو، جوان نے پیالہ نوش کیا اور میں نے پی لیا۔ پھر تو ایسا پیہم دور چلا کر تھوڑی دیر میں سب آدمی مجلس کے کیفی ہو کر بے خبر ہو گئے، اور میں بھی بے ہوش ہو گیا۔

جب صبح ہوئی اور آفتاب دو نیزے بلند ہوا، تب میری آنکھ کھلی تو دیکھا، نہ وہ تیاری ہے، نہ وہ مجلس، نہ وہ پری، فقط حویلی خالی پڑی ہے۔ مگر ایک کونے میں کمبل لپٹا ہوا دھرا ہے۔ جو اس کو کھول کر دیکھا تو وہ جوان اور اس کی رنڈی دونوں سر کٹے پڑے ہیں۔ یہ حالت دیکھتے ہی ہوش جاتے رہے، عقل کچھ کام نہیں کرتی کہ یہ کیا ہے اور کیا ہوا؟ حیرانی سے ہر طرف تک رہا تھا اتنے میں ایک خواجہ سرا (جسے ضیافت کے کام کاج میں دیکھا تھا) نظر پڑا۔ فقیر کو اس کے دیکھنے سے کچھ تسلی ہوئی۔ احوال اس واردات کا پوچھا۔ اس نے جواب دیا "تجھے اس بات کی تحقیق کرنے سے کیا حاصل، جو تو پوچھتا ہے؟" میں نے بھی اپنے دل میں غور کی کہ سچ تو کہتا ہے۔ پھر ایک ذرا تامل

کرکے میں بولا "خیر، نہ کہو، بھلا یہ تو بتاؤ، وہ معشوقہ کس مکان میں ہے؟" تب اس نے کہا "البتہ جو میں جانتا ہوں سو کہہ دوں گا۔ لیکن تجھ سا آدمی عقل مند، بے مرضی حضور کے، دو دن کی دوستی پر بے محابہ بے تکلف ہو کر، صحبت مے نوشی کی باہم گرم کرے، یہ کیا معنی رکھتا ہے؟"

فقیر اپنی حرکت اور اس کی نصیحت سے بہت نادم ہوا، سوائے اس بات کے، زبان سے کچھ نہ نکلا "فی الحقیقت اب تو تقصیر ہوئی معاف کیجیے۔" بارے، محلی نے مہربان ہو کر اُس پری کے مکان کا نشان بتایا اور مجھے رخصت کیا۔ آپ ان دونوں زخمیوں کے گاڑنے دابنے کی فکر میں رہا۔ میں تہمت سے، اُس فساد کی الگ ہوا اور اشتیاق میں، اس پری کے ملنے کے، گھبرایا ہوا، گرتا پڑتا، ڈھونڈتا شام کے وقت اس کوچے میں، اس پتے پر، جا پہنچا اور نزدیک دروازے کے، ایک گوشے میں ساری رات تلملاتے کٹی۔ کسو کی آمد و رفت کی آہٹ نہ ملی، اور کوئی احوال پرسان میرا نہ ہوا۔ اسی بے کسی کی حالت میں صبح ہو گئی، جب سورج نکلا، اُس مکان کے بالاخانے کی ایک کھڑکی سے وہ ماہ رو میری طرف دیکھنے لگی۔ اس وقت، عالم خوشی کا جو مجھ پر گزرا، دل ہی جانتا ہے۔ شکر خدا کا کیا۔

اتنے میں ایک خوجے نے میرے پاس آ کر کہا "اُس مسجد میں تو جا کر بیٹھ۔ شاید تیرا مطلب اُس جگہ بر آوے اور اپنے دل کی مراد پاوے۔" فقیر فرمانے سے اُس کے، وہاں سے اُٹھ کر اسی مسجد میں جا رہا۔ لیکن آنکھیں دروازے کی طرف لگ رہی تھیں کہ دیکھیے، پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ تمام دن جیسے روزہ دار شام ہونے کا انتظار کھینچتا ہے، میں نے بھی وہ روز ویسی ہی بے قراری میں کاٹا۔ بارے، جس تس طرح سے شام ہوئی اور دن پہاڑ سا، چھاتی پر سے ٹلا، ایک بارگی وہی خواجہ سرا (جن نے اس پری کے مکان کا پتہ بتا دیا تھا) مسجد میں آیا۔ بعد فراغت نماز مغرب کے، میرے پاس آ کر اُس شفیق نے (کہ سب رازِ نیاز کا محرم تھا)، نہایت تسلی دے کر ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے ساتھ لے چلا۔ رفتہ رفتہ ایک باغیچے میں مجھے بٹھا کر کہا "یہاں رہو، جب تک تمہاری آرزو بر آوے۔" اور آپ رخصت ہو کر شاید میری حقیقت حضور میں کہنے گیا۔ میں اس باغ کے پھولوں کی بہار اور چاندنی کا عالم اور حوض نہروں میں فوارے، ساون بھادوں کے، اُچھلنے کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ لیکن جب پھولوں کو دیکھتا تب اُس گل بدن کا خیال آتا، جب چاند پر نظر پڑتی ہے تب اُس مہ رو کا مکھڑا یاد کرتا۔ یہ سب بہار اس کے بغیر میری آنکھوں میں خار تھی۔

بارے خدا نے اُس کے دل کو مہربان کیا۔ ایک دم کے بعد وہ پری دروازے سے، جیسے چودھویں رات کا چاند، بناؤ کیے گلے میں پشواز، بادلے کی، سنجاف کی موتیوں کا دردامن ٹکا ہوا

اور سر پر اوڑھنی، جس پر آنچل، پلو، لہر، گوکھرو لگا ہوا، سر سے پاؤں تک موتیوں میں جڑی، اور وش پر آکر کھڑی ہوئی۔ اُس کے آنے سے تر و تازگی نئے سر سے، اس باغ کو اور فقیر کے دل کو ہو گئی۔ ایک دم اِدھر اُدھر سیر کر کر، شہ نشین میں مغرق، مسند پر تکیہ لگا کر بیٹھی۔ میں دوڑ کر پروانے کی طرح جیسے شمع کے گرد پھرتا ہے، تصدق ہوا اور غلام کے مانند دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوا اس میں وہ خوجہ میری خاطر، بہ طور سفارش کے عرض کرنے لگا۔ میں نے اُس محلّی سے کہا "بندہ گنہ گار تقصیر وار ہے۔ جو کچھ سزا میرے لائق ٹھہرے، سو ہو۔" وہ پری از بسکہ ناخوش تھی، بد دماغی سے بولی کہ "اب اس کے حق میں یہی بھلا ہے کہ سو توڑے اشرفی کے لیوے، اپنا اسباب درست کر کے وطن کو سدھارے۔"

میں یہ بات سنتے ہی کاٹھ ہو گیا اور سوکھ گیا کہ اگر کوئی میرے بدن کو کاٹے تو ایک بوند لہو کی نہ نکلے، اور تمام دنیا آنکھوں کے آگے اندھیری لگنے لگی، اور ایک آہ نامرادی کی، بے اختیار جگر سے نکلی۔ آنسو بھی ٹپکنے لگے۔ سوائے خدا کے اس وقت کسو کی توقع نہ رہی۔ مایوس محض ہو کر اتنا بولا "بھلا ٹک اپنے دل میں غور فرمایئے، اگر مجھ کم نصیب کو دنیا کا لالچ ہوتا تو اپنا جان و مال حضور میں نہ کھوتا۔ کیا ایک بارگی حق، خدمت گزاری اور جاں نثاری کا، عالم سے اٹھ گیا، جو مجھ سے کم بخت پر اتنی بے مہری فرمائی؟ خیر اب میرے تئیں بھی زندگی سے کچھ کام نہیں، معشوقوں کی بے وفائی سے بے چارے عاشق نیم جاں کا نباہ نہیں ہوتا۔"

یہ سن کر تیکھی ہو، تیوری چڑھا کر، خفگی سے بولی "چہ خوش! آپ ہمارے عاشق ہیں! مینڈکی کو بھی زکام ہوا! اے بے وقوف! اپنے حوصلے سے زیادہ باتیں بنانی خیالِ خام ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ بس چپ رہ، یہ نکمی بات چیت مت کر۔ اگر کسی اور نے یہ حرکت بے معنی کی ہوتی، پروردگار کی سوں، اُس کی بوٹیاں کٹوا چیلوں کو بانٹتی۔ پر کیا کروں؟ تیری خدمت یاد آتی ہے اب اسی میں بھلائی ہے کہ اپنی راہ لے۔ تیری قسمت کا دانہ پانی ہماری سرکار میں یہیں تک تھا۔" پھر میں نے روتے بسورتے کہا "اگر میری تقدیر میں یہی لکھا ہے کہ اپنے دل کے مقصد کو نہ پہنچوں اور جنگل پہاڑوں میں سر ٹکراتا پھروں تو لاچار ہوں۔" اس بات سے بھی دق ہو کہنے لگی "میرے تئیں یہ پھپھا ہندے چوچلے اور رمز کی باتیں پسند نہیں آتیں۔ اس اشارے کی گفتگو کی، جو لائق ہو، اُس سے جا کر کر۔" پھر اُسی خفگی کے عالم میں اُٹھ کر اپنے دولت خانے کو چلی۔ میں نے بہتیرا سر پٹکا، متوجہ نہ ہوئی۔ لاچار میں بھی اس مکان سے اُداس اور ناامید ہو کر نکلا۔

غرض چالیس دن تک یہی نوبت رہی۔ جب شہر کی کوچہ گردی سے اُکتاتا، جنگل میں نکل جاتا، جب وہاں سے گھبراتا، پھر شہر کی گلیوں میں دیوانہ سا آتا۔ نہ دن کو کھاتا نہ رات کو سوتا، جیسے دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ زندگی انسان کے کھانے پینے سے ہے، آدمی اناج کا کیڑا ہے طاقت بدن میں مطلق نہ رہی، اپاہج ہو کر اسی مسجد کی دیوار تلے جا پڑا کہ ایک روز وہی خواجہ سرا جمعے کی نماز پڑھنے آیا۔ میرے پاس سے ہو کر چلا، میں یہ شعر آہستہ ناطاقتی سے پڑھ رہا تھا:

اس درد دل سے موت ہو یا دل کو تاب ہو
قسمت میں جو لکھا ہو الٰہی شتاب ہو

اگرچہ ظاہر میں، صورت میری، بالکل تبدیل ہو گئی تھی۔ چہرے کی یہ شکل بنی تھی کہ جن نے مجھے پہلے دیکھا، وہ بھی نہ پہچان سکتا کہ یہ وہی آدمی ہے۔ لیکن وہ محلی، آواز درد کی سن کر متوجہ ہوا۔ میرے تئیں بہ غور دیکھ کر، افسوس کیا اور شفقت سے مخاطب ہوا کہ آخر یہ حالت اپنی پہنچائی۔ میں نے کہا "اب تو جو ہوا سو ہوا، مال سے بھی حاضر تھا، جان بھی تصدق کی، اُس کی خوشی یوں ہی ہوئی تو کیا کروں؟"

یہ سن کر ایک خدمت گار میرے پاس چھوڑ کر مسجد میں گیا۔ نماز اور خطبے سے فراغت کر کر، جب باہر نکلا، فقیر کو ایک میانے میں ڈال کر اپنے ساتھ، خدمت میں اس پری بے پروا کی لے جا کر، چق کے باہر بٹھایا۔ اگرچہ میری روہٹ کچھ باقی نہ رہی تھی، پر مدت تک شب و روز اُس پری کے پاس اتفاق رہنے کا ہوا تھا، جان بوجھ کر بے گانی ہو کر پوچھنے لگی "یہ کون ہے؟" اُس مرد آدمی نے کہا "یہ وہی کم بخت، بدنصیب ہے جو حضور کی خفگی اور عتاب میں پڑا تھا۔ اسی سبب سے اس کی یہ صورت بنی ہے۔ عشق کی آگ سے جلا جاتا ہے، ہر چند آنسوؤں کے پانی سے بجھاتا ہے پر وہ دونی بھڑکتی ہے۔ کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ علاوہ، اپنی تقصیر کی خجالت سے مرا جاتا ہے۔" پری نے ٹھٹھولی سے فرمایا "کیوں جھوٹ بکتا ہے؟ بہت دن ہوئے اُس کی خبر، وطن پہنچنے کی خبر داروں نے دی ہے۔ واللہ اعلم، یہ کون ہے اور تو کس کا ذکر کرتا ہے؟" اُس دم خواجہ سرا نے ہاتھ جوڑ کر التماس کیا "اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔" فرمایا "کہہ، تیری جان تجھے بخشی۔" خواجہ بولا "آپ کی ذات قدر دان ہے۔ واسطے خدا کے، چلون کو درمیان سے اُٹھوا کر پہچانیے اور اس کی بے کسی کی حالت پر رحم کیجیے۔ ناحق شناسی خوب نہیں۔ اب اس کے احوال پر جو کچھ ترس کھائیے، بجا ہے اور جائے ثواب ہے۔ آگے حد ادب، جو مزاج مبارک میں آوے سو

ہی بہتر ہے۔"

اتنے کہنے پر مسکرا کر فرمایا "بھلا کوئی ہو، اسے دار الشفا میں رکھو، جب بھلا چنگا ہوگا تب اس کے احوال کی پرسش کی جائے گی۔" خوجے نے کہا "اگر اپنے دستِ خاص سے گلاب اس پر چھڑکیے اور زبان سے کچھ فرمایئے تو اس کو اپنے جینے کا بھروسہ بندھے۔ ناامیدی بڑی چیز ہے دنیا بہ اُمید قائم ہے۔" اس پر بھی اس پری نے کچھ نہ کہا۔ یہ سوال وجواب سن کر، میں بھی اپنے جی سے اکتا رہا تھا، ندھڑک بول اٹھا کہ "اب اس طور کی زندگی کو دل نہیں چاہتا۔ پاؤں تو گور میں لٹکا چکا ہوں۔ ایک روز مرنا ہے اور علاج میرا بادشاہ زادی کے ہاتھ میں ہے۔ کریں یا نہ کریں وہ جانیں۔" بارے، مقلب القلوب نے اس سنگ دل کے دل کو نرم کیا۔ مہربان ہو کر فرمایا "جلد بادشاہی حکیموں کو حاضر کرو۔" وونہیں طبیب آکر جمع ہوئے۔ نبض قارورہ دیکھ کر بہت غور کی۔ آخر تشخیص میں ٹھہرا کہ یہ شخص کہیں عاشق ہوا ہے۔ سوائے وصل معشوق کے اس کا کچھ علاج نہیں جس وقت وہ ملے، یہ صحت پاوے۔ جب حکیموں کی زبانی بھی یہی مرض میرا ثابت ہوا، حکم کیا "اس جوان کو گرمابے میں لے جاؤ۔ نہلا کر خاصی پوشاک پہنا کر حضور میں لے آؤ۔" وونہیں مجھے باہر لے گئے۔ حمام کروا، اچھے کپڑے پہنا خدمت میں پری کی حاضر کیا۔ تب وہ نازنین تپاک سے بولی "تو نے مجھے بیٹھے بٹھلائے ناحق بدنام اور رسوا کیا۔ اب اور کیا چاہتا ہے؟ جو تیرے دل میں ہے، صاف صاف بیان کر۔"

یا فقیرا! اُس وقت یہ عالم ہوا کہ شادی مرگ ہو جاؤں۔ خوشی کے مارے ایسا پھولا کہ جامے میں نہ سماتا تھا اور صورت شکل بدل گئی۔ شکر خدا کا کیا اور اُس سے کہا "اس دم ساری حکیمی آپ پر ختم ہوئی کہ مجھ سے مردے کو ایک بات میں زندہ کیا۔ دیکھو تو اس وقت سے اس وقت تک میرے احوال میں کیا فرق ہو گیا!" یہ کہہ کر تین بار گرد پھرا اور سامنے آکر کھڑا ہوا اور کہا "حضور سے یوں حکم ہوتا ہے کہ، جو تیرے جی میں ہو سو کہہ، بندے کو ہفت اقلیم کی سلطنت سے زیادہ یہ ہے کہ غریب نوازی کر کر، اس عاجز کو قبول کیجیے اور اپنی قدم بوسی سے سرفرازی دیجیے۔" ایک لمحہ تو سن کر غوطے میں گئی۔ پھر کن انکھیوں سے دیکھ کر کہا "بیٹھو، تم نے خدمت اور وفاداری ایسی ہی کی ہے۔ جو کچھ کہو سو پھبتی ہے اور اپنے بھی دل پر نقش ہے۔ خیر ہم نے قبول کیا۔"

اسی دن اچھی ساعت، شبھ لگن میں چپکے چپکے قاضی نے نکاح پڑھ دیا۔ بعد اتنی محنت اور آفت کے، خدا نے یہ دن دکھایا کہ میں نے اپنے دل کا مدعا پایا، لیکن جیسی دل میں آرزو اس پری سے ہم بستر ہونے کی تھی ویسی ہی جی میں بے کلی اُس واردات عجیب کے معلوم کرنے کی تھی کہ آج تک میں نے کچھ نہ سمجھا کہ یہ پری کون ہے؟ اور وہ حبشی سانولا سجیلا جس نے ایک پُرزے کاغذ پر اتنی اشرفیوں کے بدلے میرے حوالے کئے، کون تھا؟ اور تیاری ضیافت کی بادشاہوں کے لائق ایک پہر میں کیوں کر ہوئی؟ اور وہ دونوں بے گناہ اس مجلس میں کس لئے مارے گئے؟ اور سبب خفگی اور بے مروتی کا، باوجود خدمت گزاری اور نازبرداری کے، مجھ پر کیا ہوا؟ اور پھر ایک بارگی عاجز کو یوں سربلند کیا؟ غرض اسی واسطے، بعد رسم و رسومیات عقد کے، آٹھ دن تلک باوصف اس اشتیاق کے، قصد مباشرت کا نہ کیا۔ رات کو ساتھ سوتا، دن کو یونہی اٹھ کھڑا ہوتا۔

ایک دن غسل کرنے کے لئے میں نے خواص کو کہا کہ "تھوڑا پانی گرم کر دے تو نہاؤں۔" ملکہ مسکرا کر بولی "کس برتے پر تتا پانی؟" میں خاموش ہو رہا۔ لیکن وہ پری میری حرکت سے حیران ہوئی۔ بلکہ چہرے پر آثار خفگی کے نمود ہوئے۔ یہاں تک کہ ایک روز وہ بولی "تم بھی عجب آدمی ہو، یا اتنے گرم یا ایسے ٹھنڈے، اس کو کیا کہتے ہیں؟ اگر تم میں قوت نہ تھی تو کیوں ایسی کچی ہوس پکائی؟" اس وقت میں نے بے دھڑک ہو، کہا "اے جانی! منصفی شرط ہے، آدمی کو چاہیئے کہ انصاف سے نہ چوکے۔" بولی "اب کیا انصاف رہ گیا ہے؟ جو کچھ ہونا تھا سو ہو چکا۔" فقیر نے کہا "واقعی بڑی آرزو اور مراد میری یہی تھی، سو مجھے ملی لیکن دل میرا دبدھے میں ہے اور دو دلے آدمی کی خاطر پریشان رہتی ہے۔ اس سے کچھ ہو نہیں سکتا، انسانیت سے خارج ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنے دل میں یہ قول کیا تھا کہ بعد اس نکاح کے (کہ عین دل کی شادی ہے) بعضی باتیں (جو خیال میں نہیں آتیں اور نہیں کھلتیں) حضور میں پوچھوں گا کہ زبان مبارک سے اس کا بیان سنوں تو جی کو تسکین ہو۔" اُس پری نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا "کیا خوب! ابھی سے بھول گئے؟ یاد کرو، بارہا ہم نے کہا ہے کہ ہمارے کام میں ہرگز دخل نہ کیجیو، اور کسی بات کے معترض نہ ہو۔ خلافِ معمول یہ بے ادبی کرنی کیا لازم ہے؟" فقیر نے ہنس کر کہا "جیسی اور بے ادبیاں معاف کرنے کا حکم ہے، ایک یہ بھی سہی۔" وہ پری نظریں بدل کر تیہے میں آکر، آگ کا بگولا بن گئی اور بولی "اب تو بہت سر چڑھتا جاتا ہے، جا اپنا کام کر، ان باتوں سے تجھے کیا فائدہ ہوگا؟" میں نے کہا "دنیا میں اپنے تن کی شرم سب سے [illegible] ہوتی ہے [illegible] لیکن ایک ذرہ سے کا [illegible] وقت کا رہو تا نہیں

جب ایسی چیز دل پر روا رکھی، تو اور کون سا بھید چھپانے کے لائق ہے؟"

میری اس رمز کو وہ پری، دقوف سے دریافت کر کر، کہنے لگی "یہ بات سچ ہے، پر جی میں یہ سونچ آتا ہے کہ اگر مجھ نگوڑی کا راز فاش ہو تو بڑی قیامت مچے۔" میں بولا "یہ کیا مذکور ہے؟ بندے کی طرف سے یہ خیال دل میں نہ لاؤ، اور خوشی سے ساری کیفیت جو بیتی ہے، فرماؤ۔ ہرگز ہرگز، میں دل سے زبان تک نہ لاؤں گا۔ کسو کے کان پڑنا کیا امکان ہے!" جب اس نے دیکھا کہ اب سوائے کہنے کے، اس عزیز کے، چھٹکارا نہیں، لاچار ہو کر بولی "ان باتوں کے کہنے میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ تو خواہ نخواہ درپے ہوا۔ خیر تیری خاطر عزیز ہے، اس لئے اپنی سرگزشت بیان کرتی ہوں۔ تجھے بھی اس کا پوشیدہ رکھنا ضرور ہے، خبر شرط۔"

غرض بہت سی تاکید کر کر کہنے لگی کہ "میں بدبخت ملک دمشق کے سلطان کی بیٹی ہوں اور وہ سلاطینوں سے بڑا بادشاہ ہے۔ سوائے میرے کوئی لڑکا بالا اس کے یہاں نہیں ہوا۔ جس دن سے میں پیدا ہوئی، ماں باپ کے سائے میں ناز و نعمت اور خوشی، خرمی سے پلی۔ جب ہوش آیا تب اپنے دل کو خوب صورتوں اور نازنینوں کے ساتھ لگایا۔ چنانچہ ستھری ستھری، پری زاد، مہ جبین، امرازادیاں مصاحبت میں، اور اچھی اچھی، قبول صورت، ہم عمر خواصیں سہیلیاں، خدمت میں رہتی تھیں۔ تماشا ناچ اور راگ رنگ کا، ہمیشہ دیکھا کرتی۔ دنیا کے بھلے برے سے کچھ سروکار نہ تھا۔ اپنی بےفکری کے عالم کو دیکھ کر، سوائے خدا کے شکر کے، کچھ منہ سے نہ نکلتا تھا۔

اتفاقاً طبیعت خودبخود ایسی بےمزہ ہوئی کہ نہ مصاحبت کسو کی بھاوے، نہ مجلس خوشی کی خوش آوے۔ سودائی سا مزاج ہو گیا۔ دل اداس اور حیران۔ نہ کسو کی صورت اچھی لگے، نہ بات کہنے سننے کو جی چاہے۔ میری یہ حالت دیکھ کر، دادا، چھوچھو، انگا، سب کی سب متفکر ہوئیں اور قدم پر گرنے لگیں۔ یہی خواجہ سرا، نمک حلال، قدیم سے میرا محرم اور ہمراز ہے۔ اس سے کوئی بات مخفی نہیں۔ میری وحشت دیکھ کر بولا کہ "اگر بادشاہ زادی تھوڑا سا شربت ورق الخیال کا نوش جان فرماویں تو اغلب ہے کہ طبیعت بحال ہو جاوے اور فرحت مزاج میں آوے۔" اس کے اس طرح کے کہنے سے مجھے بھی شوق ہوا۔ تب میں نے فرمایا "جلد حاضر کر۔"

"خواجہ سرا باہر گیا اور ایک صراحی اس شربت کی تکلف سے بنا کر، برف میں لگا کر، لڑکے کے ہاتھ لوا کر آیا۔ میں نے پیا اور جو کچھ اس کا فائدہ بیان کیا تھا، ویسا ہی دیکھا۔ اسی وقت اس خدمت کے انعام میں، ایک بھاری خلعت خواجے کو عنایت کی اور حکم کیا کہ ایک صراحی ہمیشہ اسی

وقت حاضر کیا کر۔ اُس دن سے یہ مقرر ہوا کہ خواجہ سرا صراحی اُسی چھوکرے کے ہاتھ لوا لادے اور بندی پی جاوے۔ جب اس کا نشہ طلوع ہوتا، تو اُس کی لہر میں اس لڑکے سے ٹھٹھا مزاخ کر کر، دل بہلاتی تھی۔ وہ بھی جب ڈھیٹ ہوا، تب اچھی اچھی میٹھی باتیں کرنے لگا، اور اچنبھے کی نقلیں لانے بلکہ آہ، اوہی بھی بھرنے اور سسکیاں لینے۔ صورت تو اس کی، طرح دار، لائق دیکھنے کے تھی بے اختیار جی چاہنے لگا۔ میں دل کے شوق سے اور اٹکھیلیوں کے ذوق سے ہر روز انعام بخشش دینے لگی، پر وہ کم بخت اُنہیں کپڑوں سے، جیسے ہمیشہ پہن رہا تھا حضور میں آتا بلکہ وہ لباس بھی میلا کچیلا ہو جاتا۔

"ایک دن پوچھا کہ تجھے سرکار سے اتنا کچھ ملا، پر تو نے اپنی صورت ویسی کی ویسی ہی پریشان بنا رکھی۔ کیا سبب ہے؟ وے روپے خرچ کہاں کئے؟ یا جمع کر رکھے؟ لڑکے نے خاطر داری کی باتیں جو سنیں، اور مجھے احوال پرساں پایا، آنسو ڈبڈبا کر کہنے لگا: جو کچھ آپ نے اس غلام کو عنایت کیا، سب استاد نے لے لیا۔ مجھے ایک پیسہ نہیں دیا۔ کہاں سے دوسرے کپڑے بناؤں جو پہن کر حضور میں آؤں؟ اس میں میری تقصیر نہیں، میں لاچار ہوں۔ اس غریبی کے کہنے پر اُس کے ترس آیا دو نہیں خواجہ سرا کو فرمایا کہ آج سے اس لڑکے کو اپنی صحبت میں تربیت کر، اور اچھا لباس تیار کروا کے پہنا، اور لونڈوں میں بے فائدہ کھیلنے کو دنے نہ دے۔ بلکہ اپنی خوشی یہ ہے کہ آداب لائق حضور کی خدمت کے سیکھے اور حاضر رہے۔ خواجہ سرا، موافق فرمانے کے، بجا لایا اور میری مرضی جو اُدھر دیکھی، نہایت اس کی خبر گیری کرنے لگا۔ تھوڑے دنوں میں فراغت اور خوش خوری کے سبب سے اس کا رنگ روغن کچھ سے کچھ ہو گیا اور کینچلی سی ڈال دی۔ میں اپنے دل کو ہر چند سنبھالتی پر اس کافر کی صورت دل میں ایسی کھب گئی تھی، یہی جی چاہتا کہ مارے پیار کے اُسے کلیجے میں ڈال رکھوں اور اپنی آنکھوں سے ایک پل جدا نہ کروں۔

"آخر اس کو مصاحبت میں داخل کیا۔ خلعتیں طرح بہ طرح کی، اور جواہر رنگ بہ رنگ کے پہنا کر دیکھا کرتی۔ بارے اس کے نزدیک رہنے سے آنکھوں کو سکھ، کلیجے کو ٹھنڈک ہوئی۔ ہر دم اس کی خاطرداری کرتی، آخر کو میری یہ حالت پہنچی کہ اگر ایک دم، کچھ ضروری کام کو، میرے سامنے سے جاتا تو چین نہ آتا۔ بعد کئی برس کے وہ بالغ ہوا، مسیں بھیگنے لگیں، چھب تختی درست ہوئی۔ تب اس کا چرچا باہر درباریوں میں ہونے لگا۔ دربان اور روتنے، میوڑے، باری دار، اور لیا دلے، چوب دار اُس کو محل کے اندر آنے جانے سے منع کرنے لگے۔ آخر اس کا آنا موقوف ہوا۔ مجھے تو

اُس بغیر کل نہ پڑتی تھی، ایک دم پہاڑ تھا۔ جب یہ احوال نا اُمیدی کا سنا، ایسی بدحواس ہوگئی گویا مجھ پر قیامت ٹوٹی۔ اور یہ حالت ہوئی کہ نہ کچھ کہہ سکتی ہوں، نہ اس بن رہ سکتی ہوں۔ کچھ بس نہیں چل سکتا، الٰہی کیا کروں! عجب طرح کا قلق ہوا، مارے بے قراری کے اسی محلی کو (جو میرا بھید دار تھا) بلا کر کہا کہ "مجھے عزیز داری پرداخت اُس لڑکے کی منظور ہے، بالفعل صلاح وقت یہ ہے کہ ہزار اشرفی پونجی دے کر، چوک کے چوراہے میں دکان جوہری کی کرا دو، تو تجارت کرکے اس کے نفع سے اپنی گزران فراغت سے کیا کرے، اور میرے محل کے قریب ایک حویلی اچھے نقشے کی رہنے کے لئے بنوا دو۔ لونڈی غلام نوکر چاکر، جو ضرور ہوں، مول لے کر، اور درماہا مقرر کر کر، اس کے پاس رکھوا دو کہ کسی طرح بے آرام نہ ہو۔ خواجہ سرا نے بود و باش کی، اور جوہری بنے، اور تجارت کی، سب کی تیاری کر دی۔ تھوڑے عرصے میں اس کی دکان ایسی چمکی اور نمود ہوئی کہ جو خلعتیں فاخرہ اور جواہر بیش قیمت سرکار میں بادشاہ کی، اور امیروں کی درکار مطلوب ہوتے، اسی کے یہاں بہم پہنچتے آہستہ آہستہ یہ دکان ہی کہ جو تحفہ ہر ایک ملک کو چاہیئے، وہیں ملے۔ سب جوہریوں کا روزگار اس کے آگے مندا ہو گیا۔ غرض اس شہر میں کوئی برابری اس کی نہ کر سکتا۔ بلکہ کسی ملک میں ویسا کوئی نہ تھا۔

" اسی کاروبار میں اُس نے تو لاکھوں روپے کمائے، پر جدائی اس کی روز بہ روز، نقصان میرے تن بدن کا، کرنے لگی۔ کوئی تدبیر نہ بن آئی کہ اس کو دیکھ کر اپنے دل کو تسلی کروں۔ ندان، صلاح کی خاطر واقف کار محلی کو بلایا اور کہا کہ کوئی صورت بن نہیں آتی کہ ذرا بھی صورت اس کی دیکھوں اور اپنے دل کو صبر دوں۔ مگر یہ طرح ہے کہ ایک سرنگ اس کی حویلی سے کھدوا کر محل میں ملوا دو۔ حکم کرتے ہی تھوڑے دنوں میں ایسی نقب تیار ہوئی کہ جب سانجھ ہوتی چپکے ہی وہ خواجہ سرا اُس جوان کو اسی راستے سے لے آتا، تمام شب شراب و کباب و عیش و عشرت میں کٹتی، میں اُس کے ملنے سے آرام پاتی، وہ میرے دیکھنے سے خوش ہوتا۔ جب فجر کا تارا نکلتا اور موذن اذان دیتا، محلی اسی راہ سے اُس جوان کو اس کے گھر پہنچا دیتا۔ ان باتوں سے سوائے اس خوجے کے اور دو دائیوں کے (جنہوں نے مجھے دودھ پلایا اور پالا تھا) چوتھا آدمی کوئی واقف نہ تھا۔

" مدت تک اسی طرح سے گزری۔ ایک روز یہ اتفاق ہوا کہ موافق معمول کے، خواجہ سرا جو اُس کو بلانے گیا، دیکھے تو وہ جوان فکرمند سا چپکا بیٹھا ہے۔ محلی نے پوچھا "آج خیر ہے کیوں ایسے دل گیر ہو رہے ہو؟ چلو حضور میں یاد فرمایا ہے۔" اُس نے ہرگز کچھ جواب نہ دیا، مارے زبان نہ

بلائی۔ خواجہ سرا اپنا سا منہ لے کر اکیلا پھر آیا اور احوال اس کا عرض کیا۔ میرے تئیں، شیطان جو خراب کرے، اس پر بھی محبت اس کی دل سے نہ بھولی، اگر یہ جانتی کہ عشق اور چاہ، ایسے نمک حرام بے وفا کی، آخر کو بدنام اور رسوا کرے گی اور ننگ و ناموس سب ٹھکانے لگے گا تو اسی دم اس کام سے باز آتی اور توبہ کرتی۔ پھر اس کا نام نہ لیتی نہ اپنا دل بے حیا کو دیتی۔ پر ہونا تو یوں تھا۔ اس لئے حرکت بے جا اس کی خاطر میں نہ لائی اور اس کے نہ آنے کو معشوقوں کا چوچلا اور ناز سمجھا۔ اس کا نتیجہ یہ دیکھا کہ اس سرگزشت سے، بغیر دیکھے بھالے، تو بھی واقف ہوا، نہیں تو میں کہاں اور تو کہاں؟ خیر جو ہوا سو ہوا۔ اس خرد ماغی پر اس گدھے کی، خیال نہ کر۔ دوبارہ خوجے کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ "اگر تو اس وقت نہیں آوے گا تو میں کسو نہ کسو ڈھب سے وہیں آتی ہوں، لیکن میرے آنے میں بڑی قباحت ہے اگر یہ راز فاش ہوا تو تیرے حق میں بہت برا ہے۔ تب ایسا کام نہ کر جس میں سوائے رسوائی کے اور کچھ پھل نہ ملے۔ بہتر یہی ہے کہ جلد چلا آ نہیں تو مجھے پہنچا جان۔" جب یہ سندیسا گیا اور اشتیاق میرا نپٹ دیکھا، بھونڈی سی صورت بنائے ہوئے ناز نخرے سے آیا۔

"جب میرے پاس بیٹھا تب میں نے اس سے پوچھا کہ "آج رکاوٹ اور خفگی کا کیا باعث ہے؟ اتنی شوخی اور گستاخی تو نے کبھو نہ کی تھی، ہمیشہ بلا عذر حاضر ہوتا تھا۔" تب اس نے کہا کہ "میں گم نام غریب، حضور کی توجہ سے اور دامن دولت کے باعث، اس مقدور کو پہنچا۔ بہت آرام سے زندگی کٹتی ہے، آپ کی جان و مال کو دعا کرتا ہوں۔ یہ تقصیر، پادشاہ زادی کے معاف کرنے کے بھروسے، اس گنہ گار سے سرزد ہوئی، امیدوار عفو کا ہوں۔" میں تو جان و دل سے اُسے چاہتی تھی اس کی بناوٹ کی باتوں کو مان لیا اور شرارت پر نظر نہ کی، ملکہ پھر دلداری سے پوچھا کہ "کیا تجھ کو ایسی مشکل کٹھن پیش آئی جو ایسا متفکر ہو رہا ہے؟ اُس کو عرض کر، اس کی بھی تدبیر ہو جائے گی۔"

"غرض اُس نے اپنی خاکساری کی راہ سے یہی کہا کہ "مجھ کو سب مشکل ہے، آپ کے روبرو سب آسان ہے۔" آخر اس کے فحوائے کلام اور رمز کنایہ سے یہ کھلا کہ "ایک باغ نہایت سرسبز اور عمارت عالی اور حوض تالاب کنوئیں پختہ سمیت، غلام کی حویلی کے نزدیک، نخاس شہر میں بکاؤ ہے۔ اور اس باغ کے ساتھ ایک لونڈی بھی گائن، کہ علم موسیقی میں خوب سلیقہ رکھتی ہے۔ یہ دونوں باہم بکتے ہیں نہ اکیلا باغ، جیسے اونٹ کے گلے میں بلی۔ جو کوئی وہ باغ لیوے اس کنیز کی بھی قیمت دلیوے اور تماشا یہ ہے کہ باغ کا مول پانچ ہزار روپے اور باندی کا بہا پانچ لاکھ۔ فدوی سے اتنے روپے بالفعل سرانجام نہیں ہو سکتے۔" میں نے اس کا دل بہت بے اختیار شوق ہے ان کی خریداری کے

پایا کر اسی واسطے دل حیران اور خاطر پریشان تھا۔ باوجودیکہ روبرو میرے بیٹھا تھا۔ تب بھی اس کا چہرہ ملین اور جی اُداس تھا مجھے تو خاطر داری اس کی ہر گھڑی اور ہر پل منظور تھی، اسی وقت خواجہ سرا کو حکم کیا کہ کل صبح کو قیمت اس باغ کی، لونڈی سمیت چکا کر قبالہ باغ کا، اور خط کنیزک کا، لکھوا کر اس شخص کے حوالے کر دو اور مالک کو زرِ قیمت خزانۂ عامرہ سے دلوا دو۔

"اس پروانگی کے سنتے ہی، جوان نے آداب بجا لایا اور منہ پر رونق آئی۔ ساری رات اسی قاعدے سے جیسے ہمیشہ گزرتی تھی، ہنسی خوشی سے کٹی۔ فجر ہوتے ہی وہ رخصت ہو گیا۔ خوجے نے موافق فرمانے کے اسی باغ اور لونڈی کو خرید کر دیا۔ پھر وہ جوان رات کو موافق معمول کے آیا جایا کرتا۔ ایک روز بہار کے موسم میں مکان بھی دلچسپ تھا، بدلی گھمنڈ رہی تھی، پھوئیاں پڑ رہی تھیں، بجلی بھی کوند رہی تھی، اور ہوا نرم نرم بہتی تھی۔ غرض عجب کیفیت اس دم تھی۔ جونہی رنگ بہ رنگ کے حباب اور گلابیاں، طاقوں پر چنی ہوئی، نظر پڑیں، دل للچایا کہ ایک گھونٹ لوں۔ جب دو تین پیالوں کی نوبت پہنچی وونہیں خیال اُس باغ نو خرید کا گزرا۔ کمال شوق ہوا کہ ایک دم، اس عالم میں، وہاں کی سیر کیا چاہیئے۔ کم بختی جو آوے، اونٹ چڑھے کتا کاٹے اچھی طرح بیٹھے بٹھائے ایک دائی کو ساتھ لے کر سرنگ کی راہ سے اس جوان کے مکان کو گئی وہاں سے باغ کی طرف چلی۔ دیکھا تو ٹھیک اُس باغ کی بہار، بہشت کی برابری کر رہی ہے۔ قطرے مینہ کے، درختوں کے سبز سبز پتوں پر، جو پڑے ہیں، گویا زمرد کی پٹڑیوں پر موتی جڑے ہیں، اور سرخی پھولوں کی، اُس ابر میں، ایسی بھلی لگتی ہے جیسے شام کو شفق پھولے ہے اور نہریں لبالب، مانند فرش آئینے کے، نظر آتی ہیں اور موجیں لہراتی ہیں۔

"غرض اس باغ میں ہر طرف سیر کرتی پھرتی تھی کہ دن ہو چکا، سیاہی شام کی نمود ہوئی۔ اتنے میں وہ جوان ایک روش پر نظر آیا، اور مجھے دیکھ کر بہت ادب اور گرم جوشی سے آگے بڑھ کے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ پر دھر کر، بارہ دری کی طرف لے چلا۔ جب میں وہاں گئی تو وہاں کے عالم نے سارے باغ کی کیفیت کو دل سے بھلا دیا۔ یہ روشنی کا ٹھاٹھ تھا۔ جا بجا قمقمے، سرو چراغاں کنول اور فانوس خیال، شمع محلس حیران۔ اور نافوسیں روشن تھیں کہ شب برات، باوجود چاندنی اور چراغاں کے، اس کے آگے اندھیری لگتی۔ ایک طرف آتش بازی، پھلجھڑی، انار، داؤدی، ہتھ پھول، مرواریدہ، مہتابی، ہوائی، چرخی، منہ پھول، جاہی جوہی، پٹاخے، ستارے چھٹتے تھے۔

"اس عرصے میں بادل پھٹ گیا اور چاند نکل آیا بعینہ جیسے نافرمانی جوڑا پہنے ہوئے کوئی

معشوق نظر آجاتا ہے۔ بڑی کیفیت ہوئی۔ چاندنی چھٹکتے ہی جوان نے کہا کہ 'اب چل کر باغ کے بالاخانے پر بیٹھیے'۔ میں ایسی احمق ہو گئی تھی کہ جو وہ نگوڑا کہتا، سو میں مان لیتی۔ اب یہ ناچ نچایا کہ مجھ کو اوپر لے گیا۔ وہ کوٹھا ایسا بلند تھا کہ تمام شہر کے مکان اور بازار کے چراغاں گویا اس کے پائیں باغ تھے۔ میں اس جوان کے گلے میں باہنہ ڈالے ہوئے، خوشی کے عالم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اتنے میں ایک رنڈی نہایت بھونڈی سی، صورت نہ شکل، چولھے میں سے نکلی شراب کا شیشہ ہاتھ میں لیے ہوئے آپہنچی۔ مجھے اس وقت اس کا آنا نپٹ برا لگا اور اس کی صورت دیکھنے سے دل میں ہول اٹھی۔

"تب میں نے گھبرا کر جوان سے پوچھا کہ 'یہ تحفہ علت کون ہے؟ تو نے کہاں سے پیدا کی؟' وہ جوان ہاتھ باندھ کر کہنے لگا کہ 'یہ وہی رنڈی ہے جو اس باغ کے ساتھ حضور کی عنایت سے خرید ہوئی' میں نے معلوم کیا کہ اس احمق نے بڑی خواہش سے اس کو لیا ہے، شاید اس کا دل اس پر مائل ہے۔ اسی خاطر سے پیچ و تاب کھا کر میں چپکی ہو رہی۔ لیکن دل اسی وقت سے مکدر ہوا اور ناخوشی مزاج پر چھا گئی۔ تس پر قیامت، اس ایسے تیسے نے، یہی کی کہ ساقی اسی چھنال کو بنایا۔ اس وقت میں اپنا لہو پیتی تھی اور جیسے طوطی کو کوئی کوے کے ساتھ ایک پنجرے میں بند کرتا ہے، نہ جانے کی فرصت پاتی تھی اور نہ بیٹھنے کو جی چاہتا تھا۔ قصہ مختصر وہ شراب، بوند کی بوند تھی جس کے پینے سے دمی حیوان ہو جاوے ور چار جام، پے در پے، اسی تیز آب کے، جوان کو دیے اور آدھا پیالہ، جوان کی منت سے، میں نے زہر مار کیا۔ آخر وہ بہشت بے حیا بھی، بدمست ہوکر، اس مردود سے بے ہودہ ادائیں کرنے لگی اور وہ چیلا بھی لٹنے میں بے لحاظ ہو چلا اور نامعقول حرکتیں کرنے لگا۔

"مجھے یہ غیرت آئی، اگر اس وقت زمین پھاٹے تو میں سما جاؤں۔ لیکن اس کی دوستی کے باعث میں بلی اس پر بھی چپ ہو رہی۔ پر وہ تو اصل کا پاجی تھا، میرے اس درگزر کرنے کو نہ سمجھا۔ نشے کی لہر میں اور بھی دو پیالے چڑھا گیا کہ رہا سہا ہوش جو تھا، وہ بھی گم ہوا اور میری طرف سے مطلق دھڑکا جی سے اٹھا دیا۔ بے شرمی سے، شہوت کے غلبے میں، میرے روبرو اس بے حیا نے اس بندڑ سے صحبت کی۔ اور وہ بھی کھیل پائی تھی، اس حالت میں بیچھے پڑی ہوئی، نخرے تلے کرنے لگی اور دونوں میں جوما چاٹی ہونے لگی۔ نہ اس بے وفا میں وفا، نہ اس بے حیا میں حیا، جیسی روح ویسے فرشتے۔ میری اس وقت یہ حالت تھی جیسے اوسر چوکی ڈومنی گاوے تال بے تال۔ اپنے اوپر لعنت کرتی تھی کہ کیوں تو یہاں آئی جس کی یہ سزا پائی! آخر کہاں تک سہوں، میرے سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی اور

انگاروں پر لوٹنے لگی، غصّے اور اس طیش میں یہ کہاوت "بیل نہ کودا کودی گون، یہ تماشہ دیکھے کون" کہتی ہوئی وہاں سے اُٹھی۔

"وہ شرابی اپنی خرابی دل میں سوچا کہ "اگر بادشاہ زادی اس وقت ناخوش ہوئی تو کل میرا کیا حال ہوگا اور صبح کو کیا قیامت مچے گی؟ اب یہ بہتر ہے کہ شاہ زادی کو مار ڈالوں، یہ ارادہ، اس غیبانی کی صلاح سے، جی میں ٹھہرا کر، گلے میں پٹکا ڈال، میرے پاؤں آپڑا، اور پگڑی سر سے اتار کر منت و زاری کرنے لگا۔ میرا دل تو اس پر لٹو ہو رہا تھا، جیدھر لیے پھرتا تھا، پھرتی تھی اور چکی کی طرح میں اُس کے اختیار میں تھی۔ جو کہتا تھا سو کرتی تھی، جوں توں مجھے پھسلا پٹھلا کر پھر بٹھا یا اور اُسی شراب دو آتشہ کے دو چار پیالے بھر بھر کر آپ بھی پیے اور مجھے بھی دیئے۔ ایک تو غصّے کے مارے جل بھن کر کباب ہو رہی تھی، دوسرے ایسی شراب پی۔ جلد بے ہوش ہو گئی، کچھ حواس باقی نہ رہے۔ تب اُس بے رحم، نمک حرام، کٹر، سنگ دل نے تلوار سے مجھے گھائل کیا بلکہ اپنی دانست میں مار چکا۔ اُس دم میری آنکھ کھلی تو منہ سے یہی نکلا۔۔۔ "خیر، جیسا ہم نے کیا، ویسا پایا لیکن تو، اپنے تئیں میرے اس خون سے بچائیو:

مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر
مرے لہو کو تو دامن سے دھو، ہُوا سو ہُوا

کسی سے یہ بھید ظاہر نہ کیجیو۔ ہم نے تجھ سے جان تک بھی دریغ نہ کی۔" پھر اُس کو خدا کے حوالے کر کر، میرا جی ڈوب گیا، مجھے اپنی سدھ بدھ کچھ نہ رہی شاید اس قصائی نے مجھے مردہ خیال کر، اُس صندوق میں ڈال کر، قلعے کی دیوار تلے لٹکا دیا سو تو نے دیکھا، میں کسو کا بُرا نہ چاہتی تھی لیکن یہ خرابیاں قسمت میں لکھی تھیں۔ مٹتی نہیں کرم کی ریکھا، ان آنکھوں کے سبب یہ کچھ دیکھا۔ اگر خوبصورتوں کے دیکھنے کا دل میں شوق نہ ہوتا، تو وہ بدبخت میرے گلے کا طوق نہ ہوتا۔ اللہ نے یہ کام کیا کہ تجھ کو وہاں پہنچا دیا اور سبب میری زندگی کا کیا۔ اب حیا جی میں آتی ہے کہ یہ رسوائیاں کھینچ کر اپنے تئیں جیتا نہ رکھوں، یا کسو کو منہ نہ دکھاؤں، پر کیا کروں، مرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں نہیں، خدا نے مار کر پھر جلایا، آگے دیکھیے کہ کیا قسمت میں بدا ہے۔ ظاہر میں تو تیری دوڑ دھوپ اور خدمت کام آئی جو ویسے زخموں سے شفا پائی۔ تو نے جان و مال سے میری خاطر کی اور جو اپنی بساط تھی، حاضر کی۔ اُن دنوں تجھے بے خرچ اور دو دلا دیکھ کر وہ شقہ سیدی بہار کو (جو میرا خزانچی ہے) لکھا، اس میں یہی مضمون تھا کہ میں خیر و عافیت سے اب فلانے مکان میں ہوں، مجھ بد طالع کی خبر والدہ شریفہ کی

خدمت میں پہنچائیو۔

"اس نے تیرے ساتھ دہ کشتیاں نقد کی، خرچ کی خاطر بھیج دیں۔ اور جب تجھے خلعت اور جواہر خریدنے کو یوسف سوداگر بچے کی دکان کو بھیجا، مجھے یہ بھروسا تھا کہ وہ کم حوصلہ ہر ایک سے جلد آشنا ہو بیٹھتا ہے، تجھے بھی اجنبی جان کر غالب ہے کہ دوستی کرنے کے لیے اتارا کر، دعوت اور ضیافت کرے گا۔ سو میرا منصوبہ ٹھیک بیٹھا، جو کچھ میرے دل میں خیال آیا تھا اُس نے ویسا ہی کیا۔ تو جب اس سے قول اقرار، پھر آنے کا کر کر، میرے پاس آیا اور مہمانی کی حقیقت اور اس کا بجد ہونا مجھ سے کہا، میں دل میں خوش ہوئی کہ جب تو اُس کے گھر جا کر کھاوے پیوے گا، تب اگر تو بھی اس کو مہمانی کی خاطر بلاوے گا، وہ دوڑا چلا آوے گا۔ اس لیے تجھے جلد رخصت کیا۔ تین دن کے پیچھے جب تو وہاں سے فراغت کر کے آیا اور میرے روبرو عذر، غیر حاضری کا، شرمندگی سے لایا، میں نے تیری تشفی کے لیے فرمایا، کچھ مضائقہ نہیں، جب اس نے رضا دی تب تو آیا، لیکن بے شرمی خوب نہیں کہ دوسرے کا احسان اپنے سر رکھیے اور اس کا بدلہ نہ کیجیے، اب تو جا کر اس کی استدعا کر اور اپنے ساتھ ہی ساتھ لے آ۔ جب تو اس کے گھر گیا تب میں نے دیکھا کہ یہاں کچھ اسباب مہمان داری کا تیار نہیں، اگر وہ آ جاوے تو کیا کروں؟ لیکن یہ فرصت پائی کہ اس ملک میں قدیم پادشاہوں کا یہ معمول ہے کہ آٹھ مہینے کاروبار ملکی اور مالی کے واسطے ملک گیری میں باہر رہتے ہیں اور چار مہینے موسم برسات کے قلعۂ مبارک میں جلوس فرماتے ہیں۔ ان دنوں دو چار مہینے سے بادشاہ یعنی ولی نعمت مجھ بدبخت کے، بندوبست کی خاطر، ملک میں تشریف لے گئے تھے۔

"جب تک تو اُس جوان کو ساتھ لے کر آوے، کہ بیدی بہار نے میرا احوال خدمت بادشاہ بیگم کی (کہ والدہ مجھ ناپاک کی ہیں) عرض کیا۔ پھر میں اپنی تقصیر اور گناہ سے خجل ہو کر اُن کے روبرو جا کر کھڑی ہوئی اور جو سرگزشت تھی، سب بیان کی۔ ہر چند انھوں نے میرے غائب ہونے کی کیفیت، دور اندیشی اور مہر اور ممتا سے چھپا رکھی تھی کہ خدا جانے اس کا انجام کیا ہو، ابھی یہ رسوائی ظاہر کرنی خوب نہیں، میرے بدلے میرے عیبوں کو، اپنے پیٹ میں رکھ چھوڑا تھا لیکن میری تلاش میں تھیں۔ جب مجھے اس حال میں دیکھا اور سب ماجرا سنا، آنسو بھر لائیں اور فرمایا "اے کم بخت ناشدنی! تو نے جان بوجھ کر نام و نشان، بادشاہت کا، سارا کھویا۔ ہزار افسوس اور اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی، کاش کہ تیرے عوض میں پتھر جنتی تو صبر آتا! اب بھی توبہ کر جو قسمت میں تھا سو ہوا، اب آگے کیا کرے گی؟ جیوے گی یا مرے گی؟" میں نے نہایت شرمندگی سے کہا کہ

مجھ بے حیا کے نصیبوں میں یہی لکھا تھا جو اس بدنامی اور خرابی میں، ایسی ایسی آفتوں سے بچ کر، جیتی رہوں اس سے مرنا ہی بھلا تھا۔ اگرچہ کلنک کا ٹیکہ میرے ماتھے پر لگا، پر ایسا کام نہیں کیا جس میں ماں باپ کے نام کو عیب لگے۔ اب یہ بڑا دکھ ہے کہ دَے دونوں بے حیا، میرے ہاتھ سے بچ جاویں اور آپس میں رنگ رلیاں منادیں اور میں اُن کے ہاتھوں سے یہ دکھ دیکھوں۔ حیف ہے کہ مجھ سے کچھ نہ ہو سکے۔ یہ امیدوار ہوں کہ خان سامان کو پردانگی ہو، تو اسباب ضیافت کا، بخوبی تمام، اس کم بخت کے مکان میں تیار کرے تو میں دعوت کے بہانے سے اُن دونوں بدبختوں کو بلوا کر اُن کے عملوں کی سزا دوں اور اپنا عوض لوں۔ جس طرح اُس نے مجھ پر ہاتھ چھوڑا اور گھائل کیا، میں بھی دونوں کے پُرزے پُرزے کروں۔ تب میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو۔ نہیں تو اس غصّے کی آگ میں پھک رہی ہوں۔ آخر جل بل کر بھوبھل ہو جاؤں گی۔" یہ سن کر اماں نے، آتما کے درد سے مہربان ہو کر میری عیب پوشی کی اور سارا لوازمہ ضیافت کا اسی خواجہ کے ساتھ (جو میرا محرم ہے) کر دیا سب اپنے اپنے کارخانے میں آکر حاضر ہوئے۔ شام کے وقت تو اُس موئے کو لے کر آیا، مجھے اُس قحبہ بانڈی کا بھی آنا منظور تھا۔

"چنانچہ پھر تجھ کو تقید کر کر، اسے بھی بلوایا۔ جب وہ بھی آئی اور مجلس جمی، شراب پی پی کر سب بدمست اور بے ہوش ہوئے اور اُن کے ساتھ تو بھی کیفی ہو کر مردہ سا پڑا۔ میں نے قلماقنی کو حکم کیا کہ ان دونوں کا ستر تلوار سے کاٹ ڈال۔ اُس نے دو نہیں ایک دم، شمشیر نکال کر دونوں کے سر کاٹ، بدن لال کر دیئے اور تجھ پر غصّے کا یہ باعث تھا کہ میں نے اجازت ضیافت کی دی تھی، نہ دو دن کی دوستی پر اعتماد کر کے شریک، مے خوری کا، ہو۔ البتہ یہ تیری حماقت اپنے تئیں پسند نہ آئی، اس واسطے کہ جب تو پی پا کر بے ہوش ہوا، تب توقع رفاقت کی تجھ سے کیا رہی؟ پر تیری خدمت کے حق، ایسے میری گردن پر ہیں کہ تجھ سے ایسی حرکت ہوتی ہے تو معاف کرتی ہوں۔ لے، میں نے اپنی حقیقت ابتدا سے انتہا تک کہہ سنائی اب بھی دل میں کچھ اور ہو سس باقی ہے؟ جیسے میں نے تیری خاطر کر کے تیرے کہنے کو سب طرح قبول کیا، تو بھی میرا فرمانا اسی صورت سے عمل میں لا۔ صلاح وقت یہ ہے کہ اب اس شہر میں رہنا میرے اور تیرے حق میں بھلا نہیں۔ آگے تو مختار ہے۔"

یا معبود اللہ! شہزادی اتنا فرما کر چپ رہی۔ فقیر تو دل و جان سے اس کے حکم کو سب چیز پر مقدم جانتا تھا، اور اس کی محبت کے جال میں پھنسا تھا، بولا "جو مرضی مبارک میں

آوے سو بہتر ہے، یہ فدوی بے عذر بجا لاوے گا۔" جب شہزادی نے میرے تئیں، فرماں بردار، خدمت گار اپنا، پورا سمجھا، فرمایا "دو گھوڑے چالاک اور جانباز (کہ چلنے میں ہوا سے باتیں کریں) بادشاہ کے خاص اصطبل سے منگوا کے تیار رکھ۔" میں نے ویسے ہی پری زاد، چار گردے کے گھوڑے چن کر، زین بندھوا کر منگوائے۔ جب تھوڑی سی رات باقی رہی، بادشاہ زادی مردانہ لباس پہن اور پانچوں ہتھیار باندھ کر، ایک گھوڑے پر سوار ہوئی، اور دوسرے مرکب پر میں مسلح ہو کر چڑھ بیٹھا اور ایک طرف کی راہ لی۔

جب شام تمام ہوئی اور پو پھٹا ہونے لگا، تب ایک پوکھر کے کنارے پہنچے۔ اتر کر منہ ہاتھ دھوئے۔ جلدی جلدی کچھ ناشتہ کر کے پھر سوار ہو کر چلے۔ کبھو ملکہ کچھ کچھ باتیں کرتی، اور یوں کہتی کہ "ہم نے تیری خاطر، شرم حیا، ملک مال، ماں باپ ۔۔ سب چھوڑا۔ ایسا نہ ہو کہ تو بھی، اس ظالم بے وفا کی طرح سلوک کرے۔" کبھو میں کچھ احوال، ادھر اُدھر کا، راہ کٹنے کے لیے کہتا، اور اُس کا جواب بھی دیتا کہ "بادشاہ زادی! سب آدمی ایک سے نہیں ہوتے۔ اُس پاجی کے نطفے میں کچھ خلل ہو گا جو اس سے ایسی حرکت واقع ہوئی اور میں نے تو جان و مال تم پر تصدق کیا اور تم نے مجھے ہر طرح سے سرفرازی بخشی۔ اب میں بندہ، بغیر داموں کا ہوں۔ میرے چمڑے کی اگر جوتیاں بنوا کر پہنو تو بھی آہ نہ کروں۔" ایسی ایسی باتیں باہم ہوتی تھیں۔ اور رات دن چلنے سے کام تھا۔ کبھو جو، ماندگی کے سبب، کہیں اترتے تو جنگل کے چرند پرند شکار کرتے، حلال کر کے نمک دان سے لون نکال، چقمق سے آگ جھاڑ، بھون بھان کر کھا لیتے اور گھوڑوں کو چھوڑ دیتے وے اپنے منہ سے گھاس پات چر چگ کر اپنا پیٹ بھر لیتے۔

ایک روز ایسے کف دست میدان میں جا نکلے کہ جہاں بستی کا نام نہ تھا اور آدمی کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس پر بھی، بادشاہ زادی کی رفاقت کے سبب سے، دن عید اور رات شب برات معلوم ہوتی تھی۔ جاتے جاتے، ان چیت، ایک دریا (کہ جس کے دیکھنے سے کلیجہ پانی ہو) راہ میں ملا۔ کنارے پر کھڑے ہو کر جو دیکھا تو جہاں تلک نگاہ نے کام کیا، پانی ہی تھا، کچھ تھل بیڑا نہ پایا۔ یا الٰہی! اب اس سمندر سے کیوں کر پار اتریں! ایک دم اسی سوچ میں کھڑے رہے۔ آخر یہ دل میں لہر آئی کہ ملکہ کو یہیں بٹھا کر میں تلاش میں، ناؤ نواڑے کی جاؤں۔ جب تلک اسباب گزارے کا ہاتھ آوے، تب تلک وہ نازنین بھی آرام پاوے۔ تب میں نے کہا کہ "اے ملکہ! اگر حکم ہو تو گھاٹ باٹ اس دریا کا ڈھونڈوں۔" فرمانے لگی "میں بہت تھک گئی ہوں اور بھوکی پیاسی ہو رہی ہوں، میں ذرا دم لے لوں

جب تئیں تو پار چلنے کی کچھ تدبیر کر۔"

اس جگہ ایک درخت پیپل کا تھا، بڑا چھتر باندھے ہوئے کہ اگر ہزار سوار آوے تو، دھوپ اور مینہ میں، اُس کے تلے آرام پاوے۔ وہاں اُس کو بٹھا کر، میں چلا اور چاروں طرف دیکھتا تھا کہ کہیں بھی زمین پر، یا دریا میں، نشان انسان کا پاؤں۔ بہتیرا سر مارا پر کہیں نہ پایا۔ آخر مایوس ہو کر وہاں سے پھر آیا تو اس پری کو پیڑ کے نیچے نہ پایا۔ اُس وقت کی حالت کیا کہوں کہ سُرت جاتی رہی۔ دیوانہ، باؤلا ہو گیا۔ کبھو درخت پر چڑھ جاتا اور ڈال ڈال، پات پات پھرتا۔ کبھو ہاتھ پاؤں چھوڑ کر زمین پر گرتا اور اس درخت کی جڑ کے آس پاس تصدق ہوتا۔ کدھو چنگھاڑ مار کر اپنی بے بسی پر روتا۔ کبھو پچھم سے پورب کو دوڑا جاتا، کدھو اُتر سے دکھن کو پھر آتا۔ غرض بہتیری خاک چھانی لیکن اُس گوہرِ نایاب کی نشانی نہ پائی۔ جب میرا کچھ بس نہ چلا، تب روتا اور خاک سر پر اُڑاتا ہوا تلاش ہر کہیں کرنے لگا۔

دل میں یہ خیال آیا کہ شاید کوئی جن اُس پری کو اُٹھا کر لے گیا اور مجھے یہ داغ دے گیا، یا اُس کے ملک سے کوئی اس کے پیچھے لگا چلا آیا تھا، اس وقت اکیلا پا کر، منا منو کر، پھر شام کی طرف لے اُبھرا۔ ایسے خیالوں میں گھبرا کر، کپڑے وپڑے پھینک پھانک دیئے۔ ننگا منگا فقیر بن کر شام کے ملک میں صبح سے شام تلک ڈھونڈتا پھرتا اور رات کو کہیں پڑ رہتا۔ سارا جہان روند مارا، پر اپنی بادشاہ زادی کا نام ونشان، کسی سے نہ سنا۔ نہ سبب غائب ہونے کا، معلوم ہوا۔ تب دل میں یہ آیا کہ جب اس جان کا تو نے کچھ پتہ نہ پایا تو اب جینا بھی حیف ہے۔ کسی جنگل میں ایک پہاڑ نظر آیا، تب اُس پر چڑھ گیا اور یہ ارادہ کیا کہ اپنے تئیں گرا دوں کہ ایک دم میں، سر منہ پتھروں سے ٹکراتے ٹکراتے پھوٹ جاوے گا، تو ایسی مصیبت سے جی چھوٹ جاوے گا۔

یہ دل میں کہہ کر چاہتا ہوں کہ اپنے تئیں گراؤں، بلکہ پاؤں بھی اٹھ چکے تھے کہ کسو نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اتنے میں ہوش آ گیا، دیکھتا ہوں تو ایک سوار سبز پوش، منہ پر نقاب ڈالے، مجھے فرماتا ہے کہ "کیوں تو، اپنے مرنے کا قصد کرتا ہے؟ خدا کے فضل سے نا اُمید ہونا کفر ہے۔ جب تک سانس ہے، تب تلک آس ہے۔ اب تھوڑے دنوں میں، روم کے ملک میں تین درویش تجھ سا رکے۔ ایسی ہی مصیبت میں پھنسے ہوئے، اور ایسے ہی تماشے دیکھے ہوئے، تجھ سے ملاقات کریں گے اور وہاں کے بادشاہ کا آزاد بخت نام ہے، اُس کو بھی ایک بڑی مشکل درپیش ہے۔ جب وہ بھی تم چاروں فقیروں کے ساتھ ملے گا، تو ہر ایک کے دل کا مطلب اور مراد جو ہے، بخوبی

حاصل ہو گی۔"

میں نے رکاب پکڑ کر بوسہ دیا، اور کہا "اے خدا کے ولی! تمہارے اتنے ہی فرمانے سے میرے دل پڑا اضطرار کو تسلی ہوئی، لیکن خدا کے واسطے یہ فرمائیے کہ آپ کون ہیں اور اسم شریف کیا ہے؟" تب انہوں نے فرمایا کہ "مرتضیٰ علی میرا نام ہے، اور میرا یہی کام ہے کہ جس کو جو مشکل کٹھن پیش آوے تو میں اُس کو آسان کر دوں۔" اتنا فرما کر نظروں سے پوشیدہ ہو گئے۔ بارے اس فقیر نے، اپنے مولا مشکل کشا کی بشارت سے، خاطر جمع کر، قصد قسطنطنیہ کا کیا۔ راہ میں جو کچھ مصیبتیں قسمت میں لکھی تھیں، کھینچتا ہوا اُس پادشاہ زادی کی ملاقات کے بھروسے، خدا کے فضل سے یہاں تک آ پہنچا اور اپنی خوش نصیبی سے تمہاری خدمت میں مشرف ہوا۔ ہمارے تمہارے آپس میں ملاقات تو ہوئی، باہم صحبت اور بات چیت میسّر آئی، اب چاہیئے کہ پادشاہ آزاد بخت سے بھی روشناس اور جان پہچان ہو۔ بعد اس کے، مقرر، ہم پانچوں اپنے مقصد دلی کو پہنچیں گے۔ تم بھی دعا مانگو اور آمین کہو۔

یا ہادی! اس حیران، سرگردان کی سرگزشت یہ تھی، جو حضوری میں درویشوں کی، کہہ سنائی۔ اب آگے دیکھیے، کب یہ محنت اور غم ہمارا، پادشاہ زادی کے ملنے سے، خوشی و خرمی سے بدل ہو!"

آزاد بخت ایک کونے میں چھپا ہوا چپکا دھیان لگائے، پہلے درویش کا ماجرا سُن کر خوش ہوا۔ پھر دوسرے درویش کی حقیقت کو سننے لگا۔

سیر دوسرے درویش کی

جب دوسرے درویش کے کہنے کی نوبت پہنچی، وہ چار زانو ہو بیٹھا، اور بولا:

"اے یارو! اس فقیر کا ٹک ماجرا سنو!
میں ابتدا سے کہتا ہوں تا انتہا سنو!
جس کا علاج کر نہیں سکتا کوئی حکیم
ہیگا ہمارا درد نپٹ لا دوا سنو!

اے دلق پوشو! یہ عاجز، بادشاہ زادہ فارس کے ملک کا ہے، ہر فن کے آدمی وہاں پیدا ہوتے ہیں، چنانچہ اصفہان نصف جہان مشہور ہے۔ ہفت اقلیم میں، اس اقلیم کے برابر، کوئی ولایت نہیں کہ وہاں کا ستارہ آفتاب ہے اور وہ ساتوں کواکب میں نیر اعظم ہے۔ آب و ہوا وہاں کی خوش اور لوگ روشن طبع اور صاحبِ سلیقہ ہوتے ہیں۔ میرے قبلہ گاہ نے (جو بادشاہ اس ملک کے تھے) لڑکپن سے قاعدے اور قانون سلطنت کی تربیت کرنے کے واسطے بڑے بڑے دانا اُستاد، ہر ایک علم اور کسب کے، چن کر میری اتالیقی کے لئے مقرر کئے تھے، تو تعلیم کامل، ہر نوع کی پاکر قابل ہوں۔ خدا کے فضل سے، چودہ برس کے سن و سال میں، سب علم سے ماہر ہوا۔ گفتگو معقول، نشست و برخاست پسندیدہ، اور جو کچھ بادشاہوں کو لائق اور درکار ہے، سب حاصل کیا۔ اور یہی شوق شب و روز تھا کہ قابلوں کی صحبت میں، قصے ہر ایک ملک کے، اور احوال اُولوالعزم بادشاہوں اور نام آوروں کا، سنا کروں۔

ایک روز ایک مصاحب دانا نے، کہ خوب تاریخ داں اور جہاں دیدہ تھا، مذکور کیا کہ اگرچہ آدمی کی زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں، لیکن اکثر وصف ایسے ہیں کہ اُن کے سبب سے انسان کا نام قیامت تک زبانوں پہ بخوبی چلا جائے گا۔ میں نے کہا "اگر تھوڑا سا احوال اس کا مفصل بیان کرو تو میں بھی سنوں اور اس پر عمل کروں۔" تب وہ شخص حاتم طائی کا ماجرا اس طرح کہنے لگا کہ "حاتم کے وقت میں، ایک بادشاہ عرب کا، نوفل نام تھا، اس کو حاتم کے ساتھ، بہ سبب نام آوری کے، دشمنی کمال ہوئی۔ بہت سا لشکر فوج جمع کر کر، لڑائی کی خاطر چڑھ آیا۔ حاتم تو خدا ترس اور نیک مرد تھا، یہ سمجھا کہ اگر

میں بھی جنگ کی تیاری کروں تو خدا کے بندے مارے جائیں گے اور بڑی خوں ریزی ہو گی۔ اس کا عذاب میرے نام لکھا جائے گا؛ یہ بات سوچ کر تن تنہا، اپنی جان لے کر، ایک پہاڑی کی کھوہ میں جا چھپا۔ جب حاتم کے غائب ہونے کی خبر نوفل کو معلوم ہوئی، سب اسباب گھر بار حاتم کا، قرق کیا اور منادی کروا دی کہ جو کوئی ڈھونڈ ڈھانڈ کر، پکڑ لاوے، پان سے اشرفی، پادشاہ کی سرکار سے انعام پاوے۔ یہ سن کر سب کو لالچ آیا اور جستجو حاتم کی کرنے لگے۔

"ایک دن ایک بوڑھا اور اس کی بڑھیا، دو تین بچے چھوٹے چھوٹے ساتھ لئے ہوئے، لکڑیاں توڑنے کے واسطے اُس غار کے پاس، جہاں حاتم پوشیدہ تھا، پہنچے اور لکڑیاں اُس جنگل سے چننے لگے۔ بڑھیا بولی، اگر ہمارے دن کچھ بھلے آتے تو حاتم کو کہیں دیکھ پاتے اور اس کو پکڑ کر نوفل کے پاس لے جاتے تو وہ پانچ سو اشرفی دیتا اور ہم آرام سے کھاتے، اس دکھ دھندے سے چھوٹ جاتے؛ بوڑھے نے کہا، کیا بڑ بڑ کرتی ہے؛ ہمارے طالع میں یہی لکھا ہے کہ روز لکڑیاں توڑیں اور سر پر دھر کر بازار میں بیچیں، تب لون روٹی میسّر آوے، یا ایک روز جنگل سے باگھ لے جاوے۔ لے اپنا کام کر۔ ہمارے ہاتھ حاتم کہاں سے آوے گا اور بادشاہ اتنے روپے دلاوے گا؛ عورت نے ٹھنڈی سانس بھری اور چپکی ہو رہی۔

"یہ دونوں کی باتیں حاتم نے سنیں۔ مردمی اور مروت سے بعید جانا کہ اپنے تئیں چھپائے اور جان کو بچائے اور ان دونوں بے چاروں کو مطلب تک نہ پہنچائے۔ سچ ہے اگر آدمی میں رحم نہیں تو وہ انسان نہیں۔ اور جس کے جی میں درد نہیں وہ قصائی ہے:

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

غرض حاتم کی جواں مردی نے نہ قبول کیا کہ اپنے کانوں سے سن کر چپکا ہو رہے۔ وہ نہیں باہر نکل آیا اور اس بوڑھے سے کہا کہ "اے عزیز! حاتم میں ہی ہوں، میرے تئیں نوفل کے پاس لے چل، وہ مجھے دیکھے گا اور جو کچھ روپے دینے کا اقرار کیا ہے، تجھے دیوے گا۔" پیر مرد نے کہا "سچ ہے کہ اس صورت میں بھلائی اور بہبودی میری، البتہ ہے۔ لیکن وہ کیا جانے، تجھ سے کیا سلوک کرے؛ اگر مار ڈالے تو میں کیا کروں؛ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہو سکے گا کہ تجھ کو، اپنی طمع کی خاطر، دشمن کے حوالے کروں وہ مان کے دن کھاؤں گا اور کب تک جیوں گا؛ آخر مر جاؤں گا، تب خدا کو کیا جواب دوں گا؛" حاتم نے بہتیری منت کی کہ "مجھے لے چل، میں اپنی خوشی سے کہتا ہوں اور ہمیشہ اسی آرزو میں رہتا ہوں

کہ میرا جان و مال، کسو کے کام آوے، تو بہتر ہے؛ لیکن وہ بوڑھا کسی طرح راضی نہ ہوا کہ حاتم کو لے جاوے اور انعام پاوے۔ آخر لاچار ہو کر حاتم نے کہا "اگر تو مجھے یوں نہیں لے جاتا تو میں آپ سے آپ بادشاہ پاس جا کر کہتا ہوں کہ اس بوڑھے نے مجھے جنگل میں، ایک پہاڑ کی کھوہ میں، چھپا رکھا تھا؛ وہ بوڑھا ہنسا اور بولا "بھلائی کے بدلے بُرائی ملی تو یا نصیب! اس رد و بدل کے سوال و جواب میں، آدمی اور بھی آ پہنچے۔ بھیڑ لگ گئی۔ انہوں نے معلوم کیا کہ حاتم یہی ہے۔ ترت پکڑ لیا اور حاتم کو لے چلے۔ وہ بوڑھا بھی افسوس کرتا ہوا پیچھے پیچھے ہو لیا۔ جب نوفل کے روبرو لے گئے، اُس نے پوچھا کہ "اس کو کون پکڑ کر لایا؟" ایک بدذات سنگ دل بولا کہ "ایسا کام سوائے ہمارے اور کون کر سکتا ہے؟ یہ فتح ہمارے نام ہے، ہم نے عرش پر جھنڈا گاڑا" ہے؛ ایک اور لن ترانی والا ڈینگ مارنے لگا کہ "میں کئی دن سے دوڑ دھوپ کر جنگل سے پکڑ لایا ہوں؛ میری محنت پر نظر کیجیے اور جو قرار ہے سو دیجیے"؛ اسی طرح اشرفیوں کے لالچ سے ہر کوئی کہتا تھا کہ یہ کام مجھ سے ہوا۔ وہ بوڑھا، چپکا ایک کونے میں لگا ہوا، سب کی شیخیاں سن رہا تھا اور حاتم کی خاطر کھڑا رو رہا تھا۔ جب اپنی اپنی دلاوری اور مردانگی سب کہہ چکے، تب حاتم نے بادشاہ سے کہا "اگر سچ بات پوچھو تو یہ ہے کہ وہ بوڑھا جو الگ سب سے کھڑا ہے مجھ کو لایا ہے اگر قیافہ پہچان جانتے ہو تو دریافت کرو اور میرے پکڑنے کی خاطر جو قول کیا ہے، پورا کرو کہ سارے ڈیل میں زبان حلال ہے؛ مرد کو چاہیئے جو کہے سو کرے۔ نہیں تو جیبھ حیوان کو بھی خدا نے دی ہے، پھر حیوان اور انسان میں کیا تفاوت ہے؟"

نوفل نے، اُس لکڑہارے بوڑھے کو پاس بلا کر، پوچھا کہ "سچ کہہ، اصل کیا ہے؟ حاتم کو کون پکڑ لایا؟" اُس بے چارے نے، سر سے پاؤں تک جو گزرا تھا، راست کہہ سنایا اور کہا کہ "حاتم میری خاطر آپ چلا آیا ہے"؛ نوفل، یہ ہمت حاتم کی سن کر، متعجب ہوا کہ "دل بلے تیری سخاوت! اپنی جان کا بھی خطرہ نہ کیا؟" جتنے، جھوٹ دعوے، حاتم کے پکڑ لانے کے کرتے تھے، حکم کیا کہ اُن کی ٹنڈیاں کس کر، پان سو اشرفی کے بدلے، پان سو جوتیاں اُنکے سر پر لگاؤ کہ اُن کی بھی جان نکل پڑے"؛ وہ نہیں تڑ تڑ پیزاریں پڑنے لگیں کہ ایک دم میں، سر اُن کے گنجے ہو گئے "سچ ہے، جھوٹ بولنا ایسا ہی گناہ ہے کہ کوئی گناہ اس کو نہیں پہنچتا۔ خدا سب کو اس بلا سے محفوظ رکھے اور جھوٹ بولنے کا چسکا نہ دے۔ بہت آدمی جھوٹ موٹ کہے جاتے ہیں لیکن آزمائش کے وقت سزا پاتے ہیں۔

"غرض اُن سب کو، موافق اُن کے انعام دے کر، نوفل نے اپنے دل میں خیال کیا کہ حاتم جیسے شخص سے (کہ ایک عالم کو اس سے فیض پہنچتا ہے اور محتاجوں کی خاطر جان اپنی دریغ نہیں کرتا، اور خدا کی راہ میں سر تا پا حاضر ہے) دشمنی رکھنی اور اُس کا مدعی ہونا، مرد آدمیت اور جواں مردی سے بعید ہے۔ وونہیں حاتم کا ہاتھ بڑی دوستی اور گرم جوشی سے پکڑ لیا اور کہا کیوں نہ ہو، جب ایسے ہو تب ایسے ہو؛ تواضع تعظیم کر کر، پاس بٹھلایا اور حاتم کا ملک و املاک اور مال و اسباب جو کچھ ضبط کیا تھا، وونہیں چھوڑ دیا۔ نئے سر سے سرداری قبیلۂ طے کی اُسے دی اور بوڑھے کو پانچ سو اشرفیاں اپنے خزانے سے دلوا دیں۔ وہ دعا دیتا ہوا چلا گیا۔"

جب یہ ماجرا حاتم کا، میں نے تمام سنا، جی میں غیرت آئی اور یہ خیال گزرا کہ حاتم اپنی قوم کا فقط رئیس تھا، جس نے ایک سخاوت کے باعث یہ نام پیدا کیا کہ آج تک مشہور ہے۔ میں خدا کے حکم سے، بادشاہ تمام ایران کا ہوں، اگر اس نعمت سے محروم رہوں تو بڑا افسوس ہے۔ فی الواقع دنیا میں کوئی کام، بڑا داد و دہش سے نہیں، اس واسطے کہ آدمی جو کچھ دنیا میں دیتا ہے، اس کا عوض عاقبت میں لیتا ہے۔ اگر کوئی ایک دانہ بوتا ہے تو اس سے کتنا کچھ پیدا ہوتا ہے! یہ بات دل میں ٹھہرا کر، میر عمارت کو بلوا کر حکم کیا کہ ایک مکان عالی شان جس کے چالیس دروازے، بلند اور بہت کشادہ ہوں، باہر شہر سے جلد بنواؤ۔ تھوڑے عرصے میں، ویسی ہی عمارت وسیع، جیسا دل چاہتا تھا، بن کر تیار ہوئی اور اُس مکان میں ہر روز، ہر وقت، فجر سے شام تک، محتاجوں اور بیکسوں کے تئیں، روپے اشرفیاں دیتا، اور جو کوئی جس چیز کا سوال کرتا، میں اُسے مالا مال کرتا۔

غرض چالیسوں دروازے سے، حاجت مند آتے اور جو چاہتے، سو لے جاتے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک فقیر سامنے کے دروازے سے آیا اور سوال کیا۔ میں نے اُسے ایک اشرفی دی۔ پھر وہی دوسرے دروازے سے ہو کر آیا، دو اشرفیاں مانگیں۔ میں نے پہچان کر درگزر کی اور دیں۔ اسی طرح اُس نے، ہر ایک دروازے سے آنا اور ایک ایک اشرفی بڑھانا شروع کیا اور میں بھی جان بوجھ کر انجان ہوا، اور اس کے سوال کے موافق دیا گیا۔ آخر چالیسویں دروازے کی راہ سے آ کر چالیس اشرفیاں مانگیں۔ وہ بھی میں نے دلوا دیں۔ اتنا کچھ لے کر، وہ درویش پھر پہلے دروازے سے گھس آیا اور سوال کیا۔ مجھے بہت برا معلوم ہوا، میں نے کہا "سن اے لالچی! تو کیسا فقیر ہے کہ ہرگز فقر کے تینوں حرفوں سے بھی واقف نہیں؟ فقیر کا عمل ان پر چاہیئے۔" فقیر بولا "بھلا داتا! تمہیں بتاؤ؟" میں نے کہا "ف سے فاقہ، ق سے قناعت، ر سے ریاضت نکلتی ہے۔ جس میں یہ باتیں نہ ہوں

وہ فقیر نہیں۔ اتنا جو تجھے ملا ہے، اس کو کھا پی کر پھر آئیو اور جو مانگے گا لے جائیو۔ یہ خیرات احتجاج رفع کرنے کے واسطے ہے، نہ جمع کرنے کے لئے۔ اے حرلیں! چالیس دروازوں سے تو نے ایک اشرفی سے چالیس اشرفیوں تک لیں، اس کا حساب تو کر کہ ریوڑی کے پھیر کی طرح کتنی اشرفیاں ہوتیں، اس پر بھی حرص تجھے پہلے دروازے سے لے آئی۔ اتنا مال جمع کر کر، کیا کرے گا؟ فقیر کو چاہیئے کہ ایک روز کی فکر کرے۔ دوسرے دن پھر نئی روزی، رزاق دینے والا موجود ہے اب حیا و شرم پکڑ، اور صبر و قناعت کو کام فرما۔ یہ کیسی فقیری ہے جو تجھے مرشد نے بتائی ہے؟"

یہ میری بات سن کر خفا اور بد دماغ ہوا اور جتنا مجھ سے لے کر جمع کیا تھا، سب زمین پر ڈال دیا اور بولا "بس بابا! اتنے گرم مت ہو۔ اپنی کائنات لے کر رکھ چھوڑو۔ پھر سخاوت کا نام نہ لیجیو۔ سخی ہونا بہت مشکل ہے۔ تم سخاوت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے، اس منزل کو کب پہنچو گے ابھی دلی دور ہے۔ سخی کے بھی تین حرف ہیں، پہلے اُن پر عمل کرو، تب سخی کہلاؤ۔" تب تو میں ڈرا اور کہا "بھلا داتا! اس کے معنے مجھے سمجھاؤ۔" کہنے لگا، "س سے سمائی، اور خ سے خوف الٰہی، اور ی سے یاد رکھنا اپنی پیدائش اور مرنے کو۔ جب تلک اتنا نہ ہو لے تو سخاوت کا نام نہ لے اور سخی کا یہ درجہ ہے کہ اگر بدکار ہو، تو بھی دوست خدا کا ہے۔ اس فقیر نے بہت سے ملکوں کی سیر کی ہے، لیکن سوائے بصرے کی بادشاہ زادی کے کوئی سخی دیکھنے میں نہ آیا۔ سخاوت کا جامہ خدا نے اس عورت پر قطع کیا ہے۔ اور سب، نام چاہتے ہیں، پر ویسا کام نہیں کرتے۔"

یہ سن کر میں نے بہت منت کی اور قسمیں دیں کہ "میری تقصیر معاف کرو اور جو چاہیئے سو لو۔" میرا دیا ہرگز نہ لیا، اور یہ بات کہتا ہوا چلا "اب اگر اپنی ساری بادشاہت مجھے دے تو اُس پر بھی نہ تھوکوں اور نہ دھر ماروں۔" وہ تو چلا گیا پر بصرے کی بادشاہ زادی کی یہ تعریف سننے سے دل بے کل ہوا، کسی طرح کل نہ تھی۔ اب یہ آرزو ہوئی کہ کسو صورت سے بصرے چل کر اُس کو دیکھا چاہیئے۔

اس عرصے میں بادشاہ نے وفات پائی، اور تخت پر میں بیٹھا۔ سلطنت ملی، پر وہ خیال نہ گیا۔ وزیر اور امیروں سے (جو پائے تخت سلطنت کے، اور ارکان مملکت کے تھے) مشورت کی کہ "سفر بصرے کا کیا چاہتا ہوں، تم اپنے کام میں مستعد رہو۔ اگر زندگی ہے تو سفر کی عمر کوتاہ ہوتی ہے، جلد پھر آتا ہوں۔" کوئی میرے جانے پر راضی نہ ہوا۔ لاچار دل تو اُداس ہو رہا تھا

ایک دن، بغیر سب کے کہے سنے، چپکے وزیر باتدبیر کو بلا کر، مختار اور وکیل مطلق اپنا کیا اور سلطنت کا مدار المہام بنایا۔ پھر میں نے گیروا لبستر پہن، فقیری بھیس کر، اکیلے، راہ بصرے کی لی۔ تھوڑے دنوں میں اُس کی سرحد میں جا پہنچا۔ تب سے یہ تماشا دیکھنے لگا کہ جہاں رات کو جا کر مقام کرتا، نوکر چاکر اُسی ملکہ کے استقبال کر کر، ایک مکان معقول میں اتارتے اور جتنا لوازمہ ضیافت کا ہوتا ہے، بخوبی موجود کرتے اور خدمت میں دست بستہ تمام رات حاضر رہتے، دوسرے دن، دوسری منزل میں یہی صورت پیش آتی۔ اس آرام سے مہینوں کی راہ طے کی۔ آخر بصرے میں داخل ہوا۔ دو نہیں ایک جوان شکیل، خوش لباس، نیک خو، صاحب مروّت (کہ دانائی اس کے قیافے سے ظاہر تھی) میرے پاس آیا اور نپٹ شیریں زبانی سے کہنے لگا کہ "میں فقیروں کا خادم ہوں، ہمیشہ اسی فکر میں رہتا ہوں کہ جو کوئی مسافر، فقیر یا دنیادار اس شہر میں آوے، میرے گھر میں قدم رنجہ فرما دے۔ سوائے ایک مکان کے یہاں اور بدلسی کے رہنے کی جگہ نہیں ہے، آپ تشریف لے چلیے اور اُس مقام کو زینت بخشیے اور مجھے سرفراز کیجیے۔"

فقیر نے پوچھا "صاحب کا اسم شریف کیا ہے؟" بولا "اس گمنام کا نام، بیدار بخت کہتے ہیں اس کی خوبی اور تملق دیکھ کر، یہ عاجز اُس کے ساتھ چلا اور اُس کے مکان میں گیا۔ دیکھا تو ایک عمارت عالی، لوازم شاہانہ سے تیار ہے۔ ایک دالان میں، اُس نے لے جا کر، بٹھایا اور گرم پانی منگوا کر ہاتھ پاؤں دھلوائے اور دسترخوان بچھوا کر، مجھ تن تنہا کے روبرو، بکاول نے ایک تورے کا نورا چن دیا۔ چار مشقاب: ایک میں یخنی پلاؤ، دوسری میں قورمہ پلاؤ، تیسری میں متنجن پلاؤ اور چوتھی میں کوکو پلاؤ، اور ایک قاب زردے کی۔ اور کئی طرح کے قلیے: دو پیازہ، زرگسی، بادامی، روغن جوش۔ اور روٹیاں ہر قسم کی: باقرخانی، تنکی، شیرمال، گاؤدیدہ، گاؤزبان، نان نغمت، پراٹھے اور کباب: کوفتے کے، تلے کے، مرغ کے۔ خاگینہ، ملغوبہ، شب دیگ دم پخت، حلیم، ہریسہ سموسے، ورق قبولی، فرنی، شیربرنج، ملائی، حلوہ، فالودہ، پن بھتا، نمش، آب شورہ، ساق عروس، لوزیات، مربّہ، اچار دان، دہی کی قلفیاں۔ یہ نعمتیں دیکھ کر روح بھر گئی۔ جب ایک ایک نوالہ ہر ایک سے لیا، پیٹ بھر گیا تب ہاتھ کھانے سے کھینچا۔

وہ شخص مجوز ہوا کہ "صاحب نے کیا کھایا؟ کھانا تو سب امانت دھرا ہے، بے تکلف اور نوش جان فرمایئے۔" میں نے کہا "کھانے میں شرم کیا ہے؟ خدا تمہارا خانہ آباد رکھے، جو کچھ میرے پیٹ میں سمایا، سو میں نے کھایا اور ذائقے کی اس کے کیا تعریف کروں؟ کہ اب تک

زبان چاٹتا ہوں، اور جوڈکار آتی ہے سو معطر۔ لو اب مزید کرو" جب دسترخوان اٹھا، زیر انداز، کاشانی مخمل کا، منقش بچھا کر، چلمچی آفتابہ طلائی لا کر، بیسن دان میں سے خوشبو بیسن دے کر، گرم پانی سے میرے ہاتھ دھلائے۔ پھر پان دان جڑاؤ میں گلوریاں، سونے کے بچھوڑوں میں بندھی ہوئی، اور چوگھڑوں میں کھلوریاں اور چکنی سپاریاں اور لونگ الاچیاں، روپے کے ورقوں میں مڑھی ہوئیں، لاکر رکھیں۔ جب میں نے پانی پینے کو مانگا، تب صراحی برف میں لگی ہوئی آبدار لے آتا۔ جب شام ہوئی، فانوسوں میں کافوری شمعیں روشن ہوئیں۔ وہ عزیز بیٹھا ہوا باتیں کرتا رہا۔ جب پہر رات گزر گئی، بولا "اب اس چھپر کھٹ میں کہ جس کے آگے دلدا پیش گیر کھڑا ہے، آرام کیجئے" فقیر نے کہا "اے صاحب! ہم فقیروں کو، ایک بوریا، مرگ چھالا، بستر کے لئے بہت ہے، یہ خدا نے تم دنیا داروں کے واسطے بنایا ہے۔"

کہنے لگا "یہ سب اسباب درویشوں کی خاطر ہے، کچھ میرا مال نہیں" اس کے بجد ہونے پر اُن بچھونوں پر کہ پھولوں کی سیج سے بھی نرم تھے، جا کر لیٹا۔ دونوں پٹیوں کی طرف گلدان اور چنگیریں، پھولوں کی، چنی ہوئیں، اور عود سوز اور لخلخے روشن تھے۔ جدھر کی کروٹ لیتا، دماغ معطر ہو جاتا۔ اس عالم میں سو رہا۔ جب صبح ہوئی، ناشتے کو بھی بادام، پستے، انگور، انجیر، ناشپاتی، انار، کشمش، چھوہارے اور میوے کا شربت، لا حاضر کیا۔ اسی طور سے تین دن رات رہا۔ چوتھے روز میں نے رخصت مانگی۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا "شاید اس گنہگار سے صاحب کی خدمت گاری میں کچھ قصور ہوا کہ جس کے باعث مزاج تمہارا مکدر ہوا!" میں نے حیران ہو کر کہا "برائے خدا! یہ کیا مذکور ہے! لیکن مہمانی کی شرط تین دن تک ہے، سو میں رہا۔ زیادہ رہنا خوب نہیں۔ اور علاوہ یہ فقیر واسطے سیر کے نکلا ہے، اگر ایک ہی جگہ رہ جاوے تو مناسب نہیں۔ اس لئے اجازت چاہتا ہے، نہیں تو تمہاری خوبیاں ایسی نہیں کہ جدا ہونے کو جی چاہے۔"

تب وہ بولا "جیسی مرضی، لیکن ایک ساعت توقف کیجئے کہ بادشاہ زادی کے حضور میں جا کر عرض کروں۔ اور تم جو جایا چاہتے ہو تو جو کچھ اسباب اوڑھنے بچھانے کا، اور کھانے کے باسن، روپے سونے کے، اور جڑاؤ کے اس مہمان خانے میں ہیں، یہ سب تمہارا مال ہے۔ اس کے ساتھ لے جانے کی خاطر جو فرماؤ، تدبیر کی جائے۔" میں نے کہا "لاحول پڑھو، ہم فقیر نہ ہوئے بھاٹ ہوئے۔ اگر یہی حرص دل میں ہوتی تو فقیر کاہے کو ہوتے، دنیا داری کیا بری تھی؟" اس عزیز نے کہا "اگر یہ احوال ملکہ سنے تو خدا جانے مجھے اس خدمت سے تغیر کر کے، کیا سلوک کرے! اگر تمہیں ایسی ہی بے پروائی

ہے تو ان سب کو ایک کوٹھڑی میں امانت بند کر کر، دروازے کو سر بمہر کر دو۔ پھر جو چاہو سو کیجو۔"

میں نہ قبول کرتا تھا، اور وہ بھی نہ مانتا تھا، لاچار یہی صلاح ٹھہری کہ سب اسباب کو بند کر کر قفل کر دیا اور منتظر رخصت کا ہوا۔ اتنے میں ایک خواجہ سرا معتبر، سر پر سر پیچ اور گوش پیچ اور کمر میں بندی باندھے، ایک عصا سونے کا جڑاؤ ہاتھ میں، اور ساتھ اس کے کئی خدمت گار، معقول عہدے لیے ہوئے اس شان و شوکت سے میرے نزدیک آیا، ایسی ایسی مہربانگی اور ملائمت سے گفتگو کرنے لگا جس کا بیان نہیں کر سکتا۔ پھر بولا کہ "اے میاں، اگر توجہ اور کرم کر کر، اس مشتاق کے غریب خانے کو اپنے قدم کی برکت سے رونق بخشو، تو بندہ نوازی اور غریب پروری سے بعید نہیں۔ شاید شہزادی سنے کہ کوئی مسافر یہاں آیا تھا، اس کی تواضع مدارت کسو نے نہ کی، وہ یوں ہی چلا گیا۔ اس واسطے، واللہ اعلم، مجھ پر کیا آفت لاوے اور کیسی قیامت اٹھاوے، بلکہ حرف زندگی پر ہے"

میں نے ان باتوں کو نہ مانا تب خواہ مخواہ منتیں کر کے، میرے تئیں اور ایک حویلی میں (کہ پہلے مکان سے بہتر تھی) لے گیا، اسی پہلے میزبان کی مانند تین دن رات، دونوں وقت، ویسے ہی کھانے، اور صبح اور تیسرے پہر شربت اور تنقل کی خاطر میوے کھلائے، اور باسن، نقرئی و طلائی اور فرش فروش اور اسباب، جو کچھ وہاں کا تھا، مجھ سے کہنے لگا کہ ان سب کے تم مالک مختار ہو جو چاہو سو کرو۔

میں یہ باتیں سن کر حیران ہوا اور چاہا کہ کسی نہ کسی طرح، یہاں سے رخصت ہو کر بھاگوں، میرے بشرے کو دیکھ کر وہ محلی بولا "اے خدا کے بندے! جو تیرا مطلب یا آرزو ہو سو مجھ سے کہہ، تو حضور میں ملکہ کے جا کر عرض کروں۔" میں نے کہا "میں فقیری کے لباس میں دنیا کا مال کیا مانگوں کہ تم بغیر مانگے دیتے ہو اور میں انکار کرتا ہوں؟" تب وہ کہنے لگا کہ حرص دنیا کی کسی کے جی سے نہیں گئی۔ چنانچہ کسو کب نے یہ کبت کہا ہے:

نکھ بن کٹا دیکھے، سیس دھاری جٹا دیکھے،
جوگی کن پھٹا دیکھے، چھار لائے تن میں
منی ان بول دیکھے، سیوڑا سر چھول دیکھے،
کرت کلول دیکھے، بن کھنڈی بن میں
بیر دیکھے، سور دیکھے، سب گنی اور کوڑھ دیکھے
مایا کے پور دیکھے، بھول رہے دھن میں

ادی انت سکھی دیکھے، جنم ہی کے دکھی دیکھے،
پردے نہ دیکھے، جن کے رہے نہیں من میں

میں نے یہ سن کر جواب دیا کہ "وہ یہ سچ ہے، پر میں کچھ نہیں چاہتا۔ اگر فرماؤ تو ایک رقعہ سر بہ مہر، اپنے مطلب کا، لکھ کر دوں، جو حضور ملکہ کے پہنچا دو تو بڑی مہربانی ہے، گویا تمام دنیا کا مال مجھ کو دیا۔" بولا "بسر و چشم! کیا مضائقہ؟" میں نے ایک رقعہ لکھا، پہلے شکر خدا کا پھر احوال کہ:

"یہ بندہ خدا کا کئی روز سے اس شہر میں وارد ہے اور سرکار سے سب طرح کی خبر گیری ہوتی ہے۔ جیسی خوبیاں اور نیک نامیاں، ملکہ کی سُن کر، اشتیاق دیکھنے کا ہوا تھا، اُس سے چار چند پایا۔ اب حضور کے ارکان دولت یوں کہتے ہیں کہ جو مطلب اور تمنا تیری ہو، سو ظاہر کر۔ اس واسطے بے حجابانہ، جو دل کی آرزو ہے، سو عرض کرتا ہوں کہ میں دنیا کے مال کا محتاج نہیں۔ اپنے ملک کا میں بھی پادشاہ ہوں۔ فقط یہاں تلک آنا اور محنت اٹھانا، آپ کے اشتیاق کے سبب سے ہوا جو تن تنہا اس صورت میں آ پہنچا ہوں۔ اب اُمید ہے کہ حضور کی توجہ سے، یہ خاک نشین، مطلب دلی کو پہنچے تو لائق ہے۔ آگے جو مرضی مبارک۔ لیکن اگر یہ التماس خاکسار کا قبول نہ ہوگا، تو اسی طرح خاک چھانتا پھرے گا اور اس جانِ بے قرار کو آپ کے عشق میں نثار کرے گا۔ مجنوں اور فرہاد کی مانند جنگل میں یا پہاڑ پر مر رہے گا۔"

یہی مدعا لکھ کر اُس خوجے کو دیا۔ اُس نے پادشاہ زادی تلک پہنچایا۔ بعد ایک دم کے پھر آیا اور میرے تئیں بلایا اور اپنے ساتھ محل کی ڈیوڑھی پر لے گیا۔ وہاں جا کر دیکھا تو ایک بوڑھی سی عورت، صاحب لیاقت، سنہری کرسی پر، گہنا پاتا پہنے ہوئے، بیٹھی ہے اور کئی خوجے خدمت گار تکلف کے لباس پہنے ہوئے، ہاتھ باندھے سامنے کھڑے ہیں۔ میں اُسے مختار کار جان کر اور دیر ینہ سمجھ کر دست بسر ہوا۔ اُس ماما نے بہت مہربانی سے سلام کیا اور حکم کیا کہ "آؤ بیٹھو، خوب ہوا، تم آئے۔ تمہیں نے ملکہ کے اشتیاق کا، رقعہ لکھا تھا؟" میں شرم کھا کر چپ ہو رہا اور سر نیچا کر کے بیٹھا۔

ایک ساعت کے بعد بولی کہ "اے جوان! پادشاہ زادی نے سلام کہا ہے اور فرمایا ہے کہ مجھ کو خاوند کرنے سے عیب نہیں، تم نے میری درخواست کی، لیکن اپنی پادشاہت کا بیان کرنا اور اس فقیری میں، اپنے تئیں پادشاہ سمجھنا اور اس کا غرور کرنا، نپٹ بے جا ہے، اس واسطے کہ سب آدمی، آپس میں فی الحقیقت ایک ہیں لیکن فضیلت دین اسلام کی البتہ ہے۔ اور

میں بھی ایک مدت سے شادی کرنے کی آرزو مند ہوں اور جیسے تم دولت دنیا سے بے پروا ہو میرے تئیں بھی حق تعالیٰ نے اتنا مال دیا ہے کہ جس کا کچھ حساب نہیں۔ پر ایک شرط ہے کہ پہلے مہر ادا کرلو؛ اور مہر شہزادی کا ایک بات ہے جو تم سے ہو سکے۔" میں نے کہا "میں سب طرح حاضر ہوں جان و مال سے دریغ نہیں کرنے کا، وہ بات کیا ہے؟ کہو تو میں سنو۔" تب اس نے کہا "آج کے دن رہ جاؤ، کل تمہیں کہہ دوں گی۔" میں نے خوشی سے قبول کیا اور رخصت ہو کر باہر آیا۔

دن تو گزرا، جب شام ہوئی مجھے ایک خواجہ سرا محل میں بلا کر لے گیا۔ جا کر دیکھا تو اکابر عالم اور فاضل، صاحب شرع حاضر ہیں۔ میں بھی اسی جلسے میں جا کر بیٹھا کہ اتنے میں دسترخوان بچھایا گیا اور کھانے اقسام اقسام کے، شیریں اور نمکین چنے گئے۔ وے سب کھانے لگے اور مجھے بھی تواضع کر کر شریک کیا۔ جب کھانے سے فراغت ہوئی، ایک دائی اندر سے آئی اور بولی کہ "بہرور۔ کہاں ہے؟ اسے بلاؤ۔" لیساولوں نے دو نہیں حاضر کیا۔ اس کی صورت بہت مرد آدمی کی سی اور بہت سی کنجیاں روپے سونے کی کمر میں لٹکتیں ہوئیں، سلام علیک کر کر میرے پاس آکر بیٹھا۔ وہی دائی کہنے لگی کہ "اے بہرور! تو نے جو کچھ دیکھا ہے، مفصل اس کا بیان کر۔"

بہرور نے یہ داستان کہنی شروع کی اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "اے عزیز! ہماری پادشاہ زادی کی سرکار میں ہزاروں غلام ہیں کہ سوداگری کے کام میں متعین ہیں، ان میں سے ایک میں بھی ادنیٰ خانہ زاد ہوں۔ ہر ایک ملک کی طرف لاکھوں روپے کا اسباب اور جنس دیکر رخصت فرماتی ہیں، جب وہ وہاں سے پھر آتا ہے، تب اس سے اس دیس کا احوال اپنے حضور میں پوچھتی ہیں اور سنتی ہیں۔ ایک بار یہ اتفاق ہوا کہ یہ کم ترین تجارت کی خاطر چلا اور شہر نیم روز میں پہنچا۔ وہاں کے باشندوں کو دیکھا تو سب کا لباس سیاہ ہے، اور ہر دم نالہ و آہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان پر کچھ بڑی مصیبت پڑی ہے۔ اس کا سبب جس سے میں پوچھتا، کوئی جواب میرا نہ دیتا۔ اسی حیرت میں کئی روز گزرے۔ ایک روز جو نہیں صبح ہوئی، تمام آدمی چھوٹے بڑے، لڑکے بوڑھے، غریب غنی شہر کے باہر چلے۔ ایک میدان میں جا کر جمع ہوئے، اور اس ملک کا پادشاہ بھی سب امیروں کو ساتھ لے کر سوار ہوا، اور وہاں گیا۔ تب، سب برابر قطار باندھ کر کھڑے ہوئے۔

"میں بھی ان کے درمیان کھڑا تماشا دیکھتا تھا۔ پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وے سب، کسو کا انتظار کھینچ رہے ہیں۔ ایک گھڑی کے عرصے میں، دور سے ایک جوان پری زاد، صاحب جمال، پندرہ سولہ برس کا سن و سال، غل اور شور کرتا ہوا اور کف منہ سے جاری، زرد بیل کی سواری، ایک ہاتھ

میں کچھ لئے مقابل خلق اللہ کے آیا اور اپنے بیل پر سے اُترا۔ ایک ہاتھ میں ناتھ اور ایک ہاتھ میں ننگی تلوار لے کر، دو زانو بیٹھا۔ ایک گل اندام پری چہرہ اس کے ہمراہ تھا، اُس کو اس جوان نے وہ چیز جو ہاتھ میں تھی، دی۔ وہ یتیم لے کر ایک سرے سے ہر ایک کو دکھاتا جاتا تھا۔ لیکن یہ حالت تھی کہ جو کوئی دیکھتا تھا، بے اختیار داڑھ مار کر روتا تھا۔ اسی طرح سب کو دکھاتا اور رلاتا ہوا سب کے سامنے سے ہو کر اپنے خاوند کے پاس پھر گیا۔

"اُس کے جاتے ہی وہ جوان اٹھا اور اس غلام کا سر شمشیر سے کاٹ کر، اور سوار ہو کر، جدھر سے آیا تھا، اُدھر کو چلا۔ سب کھڑے دیکھا کئے۔ جب نظروں سے غائب ہوا، لوگ شہر کی طرف پھرے۔ میں ہر ایک سے اس ماجرے کی حقیقت پوچھتا تھا بلکہ روپوں کا لالچ دیتا اور خوشامد منت کرتا کہ مجھے ذرا بتا دو کہ یہ جوان کون ہے؟ اور اس نے یہ کیا حرکت کی؟ اور کہاں سے آیا اور کہاں گیا؟ ہرگز کسی نے نہ بتلایا اور نہ کچھ میرے خیال میں آیا۔ یہ تعجب دیکھ کر، جب میں یہاں آیا اور ملکہ کے روبرو اظہار کیا، تب سے بادشاہ زادی بھی حیران ہو رہی ہے اور اس کے تحقیق کرنے کی خاطر دلی ہو رہی ہے۔ لہٰذا مہر اپنا یہی مقرر کیا ہے کہ جو شخص اس عجوبے کی، کماحقہٗ، خبر لاوے اس کو پسند فرما دے اور وہی مالک، سارے ملک کا اور ملکہ کا، ہو دے۔

یہ ماجرا تم نے سب سنا۔ اپنے دل میں غور کرو، اگر تم اس جوان کی خبر لاسکو تو قصد، ملک نیم روز کا، کرو اور جلد روانہ ہو۔ نہیں تو انکار کر کر، اپنے گھر کی راہ لو۔" میں نے جواب دیا کہ "اگر خدا چاہے تو جلد اس کا احوال، سر سے پاؤں تک دریافت کر کر، بادشاہ زادی کے پاس آ پہنچتا ہوں اور کامیاب ہوتا ہوں اور جو میری قسمت بد ہے تو اس کا کچھ علاج نہیں۔ لیکن ملکہ اس کا قول قرار کریں کہ اپنے کہنے سے نہ پھریں اور بالفعل، ایک اندیشہ مشکل میرے دل میں خلش کر رہا ہے، اگر ملکہ غریب نوازی اور مسافر پروری سے حضور میں بلا دیں اور پردے کے باہر بٹھلا دیں اور میرا التماس اپنے کانوں سنیں اور اس کا جواب اپنی زبان سے فرما دیں تو میری خاطر جمع ہو اور مجھ سے سب کچھ ہو سکے۔" یہ میرے مطلب کی بات ماما نے روبرو اُس پری پیکر کے عرض کی، بارے قدر دانی کی راہ سے حکم کیا کہ انہیں بلا لو۔

دائی پھر باہر آئی اور مجھے اپنے ساتھ جس محل میں بادشاہ زادی تھی، لے گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دو رویہ صف باندھے، دست بستہ سہیلیاں اور خواصیں اور اردابیگنیاں، تلماتنیاں، ترکنیاں، مشنیاں، اُذبکنیاں، کشمیرنیاں، جواہر میں جڑی، عہدے لئے کھڑی ہیں۔ اندر کا اکھاڑ کہوں یا پریاں

کا اُتارا۔ بے اختیار ایک آہ، بے خودی سے زبان تک آئی اور کلیجہ تھلکنے لگا، پر بزور اپنے تئیں تھانبا ان کو دیکھتا بھالتا اور سیر کرتا ہوا آگے چلا، لیکن پاؤں سو سو من کے ہو گئے۔ جس کو دیکھوں، پھر یہ نہ جی چاہے کہ آگے جاؤں۔ ایک طرف چلون پڑی تھی اور مونڈھا جڑاؤ بچھوا رکھا تھا اور ایک چوکی بھی صندل کی بچھی تھی۔ دائی نے مجھے بیٹھنے کی اشارت کی۔ میں مونڈھے پر بیٹھ گیا اور وہ چوکی پر۔ کہنے لگی "لو اب جو کہنا ہے، سوچی بھر کر کہو۔"

میں نے ملکہ کی خوبیوں کی اور عدل و انصاف، داد و دہش کی پہلے تعریف کی، پھر کہنے لگا "جب سے میں اس ملک کی سرحد میں آیا، ہر ایک منزل میں یہی دیکھا کہ جا بہ جا مسافر خانے اور عمارتیں عالی بنی ہوئی ہیں اور آدمی ہر ایک عہدے کے تعینات ہیں کہ خبر گیری، مسافروں اور محتاجوں کی کرتے ہیں۔ مجھے بھی تین تین دن ہر ایک مقام میں گزرے۔ چوتھے روز جب رخصت ہونے لگا تب بھی کسو نے خوشی سے نہ کہا کہ جاؤ، اور جتنا اسباب اس مکان میں تھا۔ شطرنجی، چاندنی، قالینیں، سیتل پاٹی، تمگل کوٹی، دیوار گیری، چھت پردے، چلونیں، سائبان، نم گیرے، چھپر کھٹ مع غلاف اوقچہ، توشک، بالاپوش، سیج بند، چادر، تکیے، تکیئی، گل تکیے، مسند، گاؤ تکیے، دیگ، دیگچی، پتیلی، طباق، رکابی، بادیے، تشتری، چمچے، بکاولی، کف گیر، طعام بخش، سرپوش، سینی، خوان پوش، زیرپوش، آب خورے، بجرے، صراحی، لگن، پان دان، چوگھرے، چنگیر، گلاب پاش، عود سوز، آفتابہ، چلمچی۔۔۔ سب میرے حوالے کیے کہ "یہ تمہارا مال ہے، چاہو اب لے جاؤ، نہیں تو ایک کوٹھری میں بند کر کے اپنی مہر کر دو، جب تمہاری خوشی ہو گی پھرتے ہوئے لے جائیو۔" میں نے یونہیں کیا۔ پر یہ حیرت ہے کہ مجھ سے فقیر تنہا سے یہ سلوک ہوا، تو ایسے غریب ہزاروں تمہارے ملکوں میں آتے جاتے ہوں گے۔ پس اگر ہر ایک سے یہی مہمان داری کا طور رہتا ہوگا، تو مبلغ بے حساب خرچ ہوتے ہوں گے۔ پس اتنی دولت کہ جس کا یہ صرف ہے، کہاں سے آئی اور کیسی ہے؟ اگر گنج قارون ہو تو بھی وفا نہ کرے اور ظاہر میں اگر ملکہ کی سلطنت پر نگاہ کیجیے تو اس کی آمدنی فقط باورچی خانے کے خرچ کو بھی کفایت نہ کرتی ہو گی، اور خرچوں کا تو کیا ذکر ہے! اگر اس کا بیان ملکہ کی زبان سے سنوں تو خاطر جمع ہو، قصد ملک نیمروز کا کروں، اور جوں توں وہاں جا پہنچوں۔ پھر سب احوال دریافت کر کے ملکہ کی خدمت میں، بہ شرطِ زندگی، بار دگر حاضر ہوں، اپنے دل کی مراد پاؤں۔"

یہ سن کر ملکہ نے اپنی زبان سے کہا کہ "اے جوان! اگر تجھے آرزو کمال ہے کہ یہ ماہیت

دریافت کرے تو آج کے دن بھی مقام کر، شام کو تجھے، حضور میں طلب کر کر، جو کچھ احوال اس دولت بے زوال کا ہے، بے کم و کاست کہا جائے گا۔" میں یہ تسلی پا کر اپنی استقامت کے مکان پر آ کر منتظر تھا کہ کب شام ہو جو میرا مطلب تمام ہو۔ اتنے میں خواجہ سرا، کئی چوگوشے، تورا پوش پڑے، بھوئیوں کے سر پر دھرے، آ کر موجود ہوا اور بولا کہ "حضور سے اُلش خاص عنایت ہوا ہے، اس کو تناول کرو۔" جس وقت میرے سامنے کھولے، بو باس سے دماغ معطر ہوا اور روح بھر گئی، جتنا کھا سکا کھا لیا، باقی ان سبھوں کو اٹھا دیا اور شکر نعمت کہہ بھجایا۔ بارے جب آفتاب، تمام دن کا مسافر، تھکا ہوا، گرتا پڑتا، اپنے محل میں داخل ہوا اور ماہتاب، دیوان خانے میں، مصاحبوں کو ساتھ لے کر، نکل بیٹھا، اُس وقت دائی آئی اور مجھ سے کہنے لگی کہ "چلو، پادشاہ زادی نے یاد فرمایا ہے۔"

میں اس کے ہمراہ ہو لیا، خلوت خاص میں لے گئی۔ روشنی کا یہ عالم تھا کہ شب قدر کو وہاں قدر نہ تھی اور پادشاہی فرش پر مسند مغرق بچھی، مرصع کا تکیہ لگا ہوا، اور اس پر ایک شمیانہ، موتیوں کی جھالر کا، جڑاؤ استادوں پر کھڑا ہوا، اور سامنے مسند کے، جواہر کے درخت، پھول پات لگے ہوئے، (گویا عین میں قدرتی ہے) سونے کی کیاریوں میں جمے ہوئے اور دونوں طرف دست راست اور دست چپ، شاگرد پیشے اور مجرائی، دست بستہ، با ادب، آنکھیں نیچے کیے ہوئے، حاضر تھے۔ اور طوائف اور گائنیں، سازوں کے سر بنائے، منتظر۔ یہ سماں اور یہ تیاری، کر و فر کی، دیکھ کر عقل ٹھکانے نہ رہی۔ دائی سے پوچھا کہ "دن کو وہ زیبائش اور رات کو یہ آرائش کہ دن عید اور رات شب رات کہا چاہیے بلکہ دنیا میں پادشاہ ہفت اقلیم کو یہ عیش میسر نہ ہوگا، ہمیشہ یہی صورت رہتی ہے؟" دائی کہنے لگی کہ "ہماری ملکہ کا جتنا کارخانہ تم نے دیکھا، یہ سب اسی دستور سے جاری ہے۔ اس میں ہرگز خلل نہیں بلکہ افزوں ہے۔ تم یہاں بیٹھو۔ ملکہ دوسرے مکان میں تشریف رکھتی ہیں۔ جا کر خبر کروں۔"

دائی یہ کہہ کر گئی اور اُنہیں پاؤں، پھر آئی کہ "چلو حضور میں۔" بہ مجرد اس مکان میں جاتے ہی بھچک رہ گیا۔ نہ معلوم ہوا کہ دروازہ کہاں اور دیوار کدھر ہے اس واسطے کہ حلبی آئینے، قد آدم چاروں طرف لگے ہوئے، اور ان کی پردازوں میں ہیرے اور موتی جڑے ہوئے تھے۔ ایک کا عکس ایک میں نظر آتا تو یہ معلوم ہوتا کہ جواہر کا سارا مکان ہے۔ ایک طرف پردہ پڑا ہوا تھا، اس کے پیچھے ملکہ بیٹھی تھیں۔ وہ دائی پردے سے لگ کر بیٹھی اور مجھ کو بھی بیٹھنے کو کہا۔ تب دائی ملکہ کے فرمانے

ے، اس طور بیان کرنے لگی کہ "سن اے جوان دانا! سلطان اس اقلیم کا، بڑا بادشاہ تھا۔ اُن کے گھر میں سات بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ایک روز بادشاہ نے جشن منایا۔ یہ ساتوں لڑکیاں، سولہ سنگار، بارہ ابھرن، بال بال گج موتی پرو کر، بادشاہ کے حضور میں کھڑی تھیں۔ سلطان کے کچھ جی میں آیا تو بیٹیوں کی طرف دیکھ کر فرمایا 'اگر تمہارا باپ بادشاہ نہ ہوتا اور کسی غریب کے گھر تم پیدا ہوتیں، تو تمہیں بادشاہ زادی اور ملکہ کون کہتا؟ خدا کا شکر کرو کہ شہزادیاں کہلاتی ہو۔ تمہاری یہ ساری خوبی میرے دم سے ہے!'

"چھ لڑکیاں ایک زبان ہو کر بولیں کہ 'جہاں پناہ جو فرماتے ہیں بجا ہے اور آپ ہی کی سلامتی سے ہماری بھلائی ہے'، لیکن یہ ملکہ جہاں، سب بہنوں سے چھوٹی تھیں، پر عقل و شعور میں اس عمر میں بھی گویا سب سے بڑی تھیں، چپکی کھڑی رہیں۔ اس گفتگو میں بہنوں کی شریک نہ ہوئیں، اس واسطے کہ یہ کلمہ کفر کا ہے۔ بادشاہ نے نظرِ غضب سے ان کی طرف دیکھا اور کہا 'کیوں بی بی! تم کچھ نہ بولیں، اس کا کیا باعث ہے؟' تب ملکہ نے دونوں ہاتھ اپنے، رومال سے باندھ کر، عرض کی کہ 'اگر جان کی امان پاؤں اور تقصیر معاف ہو تو یہ لونڈی اپنے دل کی بات گزارش کرے' حکم ہوا کہ 'کہہ، کیا کہتی ہے؟' تب ملکہ نے کہا کہ 'قبلہ عالم! آپ نے سنا ہے کہ سچی بات کڑوی لگتی ہے، سو اس وقت میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو کر عرض کرتی ہوں اور جو کچھ میری قسمت میں لکھنے والے نے لکھا ہے، اُس کا مٹانے والا کوئی نہیں، کسو طرح نہیں ٹلنے کا:

خواہ تم پاؤں گھسو یا کہ رکھو سر بسجود
بات پیشانی کی جو کچھ ہے سو پیش آتی ہے

'جس بادشاہ علی الاطلاق نے آپ کو بنایا، اُنہیں نے مجھے بھی بادشاہ زادی کہوایا۔ اس کی قدرت کے کارخانے میں کسو کا اختیار نہیں چلتا۔ آپ کی ذات، ہماری ولی نعمت اور قبلہ و کعبہ ہے، حضرت کے قدم مبارک کی خاک کو اگر سرمہ کروں تو بجا ہے، مگر نصیب ہر ایک کے ہر ایک کے ساتھ ہیں'۔ بادشاہ یہ سن کر طیش میں آئے اور یہ جواب دل پر سخت گراں معلوم ہوا، بیزار ہو کر فرمایا 'چھوٹا منہ بڑی بات، اب اس کی یہی سزا ہے کہ گہنا پاتا، جو کچھ اس کے ہاتھ گلے میں ہے، اُتار لو اور ایک سیانے میں چڑھا کر، ایسے جنگل میں کہ جہاں نام و نشان آدمی زاد کا ہو، پھینک آؤ۔ دیکھیں اس کے نصیبوں میں کیا لکھا ہے؟'

"بہ موجب حکم بادشاہ کے، اُس آدھی رات میں کہ (عین اندھیری تھی) ملکہ کو (جو جو نرے

بھونرے میں پلی تھیں اور سوائے اپنے محل کے، دوسری جگہ نہ دیکھی تھی) بھوتنی لے جا کر ایک میدان میں (کہ وہاں پرندہ پر نہ مارتا، انسان کا تو کیا ذکر ہے) چھوڑ کر چلے آئے۔ ملکہ کے دل پر عجب حالت گزرتی تھی کہ ایک دم میں کیا تھا اور کیا ہو گیا؟ پھر اپنے خدا کی جناب میں شکر کرتیں اور کہتیں "تو ایسا ہی بے نیاز ہے! جو چاہا سو کیا، اور جو چاہتا ہے سو کرتا ہے، اور جو چاہے گا سو کرے گا۔ جب تلک نتھنوں میں دم ہے، تجھ سے ناامید نہیں ہوتی"۔ اسی اندیشے میں آنکھ لگ گئی۔ جب وقت صبح ہونے لگی، ملکہ کی آنکھ کھل گئی۔ پکاریں کہ وضو کو پانی لانا، پھر ایک بارگی رات کی بات چیت یاد آئی کہ تو کہاں اور یہ بات کہاں؟ یہ کہہ کر اٹھ کر تیمم کیا اور دوگانہ شکر کا پڑھا۔ اے عزیز! ملکہ کی اس حالت کے سننے سے چھاتی پھٹتی ہے۔ اس بھولے بھالے جی سے پوچھا چاہیئے کہ کیا کہتا ہوگا۔

"غرض اس بیابانے میں بیٹھی ہوئی، خدا سے لو لگائے رہتی تھیں، اور یہ کبت اس دم پڑھتی تھیں:

جب دانت نہ تھے، تب دودھ دیو،
جب دانت دیئے، کہا: ان نہ دیئے ہے
جو جل میں، تھل میں، پنچھی لپشو،
کی سُدھ لیت، سو تیری بھی لئے ہے
کاہے کو سوچ کرے، من مورکھ،
سوچ کرے کچھ ہاتھ نہ آئے ہے
جان کو دیت، اجان کو دیت
جہان کو دیت، سو تو کو بھی دیئے ہے

"سچ ہے جب کچھ بن نہیں آتا، تب خدا ہی یاد آتا ہے، نہیں تو اپنی اپنی تدبیریں، ہر ایک لقمان اور بوعلی سینا ہے۔ اب خدا کے کارخانے کا تماشا سنو۔ اسی طرح تین دن رات صاف گزر گئے کہ منہ میں، ایک کھیل بھی اڑ کر نہیں گئی۔ وہ پھول سا بدن، سوکھ کر کانٹا ہو گیا اور وہ رنگ جو کندن سا دمکتا تھا۔ ہلدی سا بن گیا۔ منہ میں پھپھڑی بندھ گئی، آنکھیں پتھرا گئیں مگر ایک دم اٹک رہا تھا کہ وہ آتا جاتا تھا۔ جب تلک سانس تب تلک آس۔ چوتھے روز صبح کو، ایک درویش خضر کی سی صورت، نورانی چہرہ، روشن دل آ کر پیدا ہوا۔ ملکہ کو اس حالت میں دیکھ کر بولا "اے بیٹی! اگرچہ تیرا باپ بادشاہ ہے لیکن تیری قسمت میں یہ بھی بدا تھا۔ اب اس فقیر بوڑھے کو اپنا خادم

سمجھ، اور اپنے پیدا کرنے والے کا رات دن دھیان رکھ، خدا خوب کرے گا۔" اور فقیر کے کشکول میں جو
ٹکڑے بھیک کے موجود تھے، ملکہ کے روبرو رکھے اور پانی کی تلاش میں پھرنے لگا۔ دیکھے تو ایک کنواں
تو ہے، پر ڈول رسی کہاں، جس سے پانی بھرے؛ تھوڑے پتے درخت سے توڑ کر، دونا بنایا اور اپنی
سیلی کھول کر، اُس میں باندھ کر نکالا اور ملکہ کو کچھ کھلایا پلایا۔ بارے ٹک ہوش آیا۔ اُس مرد خدا
نے بے کس اور بے بس جان کر، بہت سی تسلی دی، خاطر جمع کی اور آپ بھی رونے لگا۔ ملکہ نے جب،
غم خواری، اور دل داری اس کی بے حد دیکھی، تب ان کے مزاج کو بھی استقلال ہوا۔ اُس روز سے
اُس پیر مرد نے یہ مقرر کیا کہ صبح کو بھیک مانگنے کے لئے شہر میں نکل جاتا۔ جو ٹکڑا پارچہ پاتا، ملکہ
کے پاس لے آتا اور کھلاتا۔

"اس طرح سے تھوڑے روز گزرے۔ ایک دن ملکہ نے، تیل سر میں ڈالنے اور کنگھی چوٹی کرنے
کا قصد کیا۔ جونہیں مباف کھولا، چٹلے میں سے ایک موتی کا دانہ، گول آبدار نکل پڑا۔ ملکہ نے اُس
درویش کو دیا اور کہا، "شہر میں سے اس کو بیچ لاؤ۔" وہ فقیر اس گوہر کو بیچ کر، اُس کی قیمت
پادشاہ زادی کے پاس لے آیا۔ تب ملکہ نے حکم کیا کہ "ایک مکان، موافق گزران کے، اس جگہ
بنواؤ۔" فقیر نے کہا کہ "اے بیٹی! نیو دیوار کی، کھود کر تھوڑی سی مٹی جمع کرو۔ ایک دن میں پانی
لا کر، گارا کر کر، گھر کی بنیاد درست کر دوں گا۔" ملکہ نے اُس کے کہنے سے مٹی کھودنی شروع کی۔
جب ایک گز عمیق گڑھا کھودا گیا، زمین کے نیچے سے ایک دروازہ نمودار ہوا۔ ملکہ نے اس در کو
صاف کیا۔ ایک بڑا گھر جواہر اور اشرفیوں سے معمور نظر آیا۔ ملکہ نے پانچ چار لپ، اشرفیوں کی لے کر
پھر بند کیا، اور مٹی دے کر اوپر سے ہموار کر دیا۔ اتنے میں فقیر آیا۔ ملکہ نے فرمایا کہ "راج اور معمار
کاریگر اور اپنے کام کے استاد اور مزدور جلد دست، بلاؤ جو اس مکان پر ایک عمارت پادشاہانہ کہ
طاق کسریٰ کا جفت ہو، اور قصر نعمان سے سبقت لے جائے اور شہر پناہ، اور قلعہ، باغ اور
باؤلی، اور ایک مسافر خانہ کہ لاثانی ہو، جلد تیار کریں۔ لیکن پہلے نقشہ ان کا، ایک کاغذ پر درست کر
کے حضور میں لاویں جو پسند کیا جائے۔"

"فقیر نے ایسے ہی کارکن، کارکردہ، ذی ہوش لا کر حاضر کئے۔ موافق فرمانے کے، تعمیر
عمارت کی ہونے لگی اور نوکر چاکر ہر ایک کارخانہ جات کی خاطر، چن چن کر، فہمیدہ اور بادیانت
ملازم ہونے لگے۔ اس عمارت عالی شان کی تیاری کی خبر، رفتہ رفتہ پادشاہ ظل سبحانی کو، جو
ملکہ کے تھے، پہنچی۔ سن کر بہت متعجب ہوئے، اور ہر ایک سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے

نے یہ محلات بنانے شروع کئے ہیں؟ اس کی کیفیت سے کوئی واقف نہ تھا جو عرض کرے۔ سبھوں نے کانوں پر ہاتھ رکھے کہ کوئی غلام نہیں جانتا کہ اس کا بانی کون ہے۔ تب بادشاہ نے ایک امیر کو بھیجا اور پیغام دیا کہ 'میں ان مکانوں کے دیکھنے کو آیا چاہتا ہوں، اور یہ بھی معلوم نہیں کہ تم کہاں کی بادشاہزادی ہو اور کس خاندان سے ہو۔ یہ سب کیفیت دریافت کرنی اپنے تئیں منظور ہے۔'

"جونہی ملکہ نے یہ خوش خبری سنی، دل میں بہت شاد ہو کر عرضی لکھی کہ:

'جہاں پناہ، سلامت! حضور کے تشریف لانے کی خبر، طرف غریب خانے کی، سن کر نہایت خوشی حاصل ہوئی اور سبب حرمت اور عزت، اس کم ترین کا ہوا۔ زہے طالع اس مکان کے! کہ جہاں قدم مبارک کا نشان پڑے اور وہاں کے رہنے والوں پر دامن دولت سایہ کرے اور نظر توجہ سے دونوں سرفراز ہو دیں۔ یہ لونڈی امیدوار ہے کہ کل روز پنج شنبہ روز مبارک ہے اور میرے نزدیک، بہتر روز نوروز سے ہے، آپ کی ذات مشابہ آفتاب کے ہے، تشریف فرما کر اپنے نور سے اس ذرہ بے مقدار کو قدر و منزلت بخشیے اور جو کچھ اس عاجزہ سے میسر ہو سکے، نوش جان فرمائیے۔ یہ عین غریب نوازی اور مسافر پروری ہے، زیادہ حد ادب!' اور اس عمدہ کو بھی، کچھ تواضع کر کر، رخصت کیا۔

"بادشاہ نے عرضی پڑھی اور کہلا بھیجا کہ 'ہم نے تمہاری دعوت قبول کی، البتہ آویں گے۔' ملکہ نے نوکروں اور سب کار باریوں کو حکم کیا کہ 'لوازم ضیافت کا، ایسے سلیقے سے تیار ہو کہ بادشاہ، دیکھ کر اور کھا کر، بہت محظوظ ہوں۔ اور ادنیٰ اعلیٰ، جو بادشاہ کی رکاب میں آویں، سب کھا پی کر خوش ہو کر جاویں۔' ملکہ کے فرمانے اور تاکید کرنے سے، سب قسم کے کھانے، سلونے اور میٹھے، اس ذائقے کے تیار ہوئے کہ اگر برہمن کی بیٹی کھاتی تو کلمہ پڑھتی۔ جب شام ہوئی، بادشاہ منڈے تخت پر سوار ہو کر ملکہ کے مکان کی طرف تشریف لائے۔ ملکہ، اپنی خاص خواص سہیلیوں کو لے کر، استقبال کے واسطے چلیں۔ جوں بادشاہ کے تخت پر نظر پڑی، اس آداب سے مجرا شاہانہ کیا کہ یہ قاعدہ دیکھ کر بادشاہ کو اور بھی حیرت نے لیا اور اسی انداز سے، جلوہ کر کر، بادشاہ کو تخت مرصع پر لا بٹھایا۔ ملکہ نے سوا لاکھ روپے کا، چبوترہ تیار کروا رکھا تھا اور ایک سو ایک کشتی جواہر اور اشرفی۔ اور پشمینہ اور نور بافی۔ اور ریشمی اور طلا بافی اور زردوزی کی لگا رکھی تھی۔ اور دو زنجیر فیل، اور دس راس اسپ، عراقی اور یمنی مرصع کے ساز سے تیار کر رکھے تھے۔ نذر گزرانے اور آپ، دونوں ہاتھ باندھے روبرو کھڑی مہربانی سے فرمایا کہ 'تم کس ملک کی شہزادی ہو اور یہاں کس

صورت سے آنا ہوا؟

"ملکہ نے آداب بجا لا کر التماس کیا کہ "یہ لونڈی وہی گنہ گار ہے جو غضب سلطانی کے باعث اس جنگل میں پہنچی اور یہ سب تماشے خدا کے ہیں جو آپ دیکھتے ہیں!" یہ سنتے ہی بادشاہ کے لہو نے جوش مارا، اُٹھ کر محبت سے گلے لگا لیا اور ہاتھ پکڑ کے، اپنے تخت کے پاس کرسی بچھوا کر، حکم بیٹھنے کا کیا۔ لیکن بادشاہ حیران اور متعجب بیٹھے تھے۔ فرمایا کہ "بادشاہ بیگم کو کہو کہ بادشاہ زادیوں کو اپنے ساتھ لے کر جلد آویں۔" جب وے آئیں، بہنوں نے پہچانا، اور گلے مل کر روئیں اور شکر کیا۔ ملکہ نے، اپنی والدہ اور چھیوں ہمشیروں کے روبرو، اتنا کچھ نقد اور جواہر رکھا کہ خزانہ تمام عالم کا، اس کے پاسنگ میں نہ چڑھے۔ پھر بادشاہ نے سب کو ساتھ بٹھا کر خاصہ نوش جان فرمایا۔

"جب تک جہاں پناہ جیتے رہے، اسی طرح گزری۔ کبھو کبھو آپ آتے اور کبھی ملکہ کو بھی اپنے ساتھ محلوں میں لے جاتے۔ جب بادشاہ نے رحلت فرمائی، سلطنت اس اقلیم کی، ملکہ کو پہنچی کہ ان کے سوا دوسرا کوئی، لائق اس کام کے نہ تھا۔ اے عزیز! سرگزشت یہ ہے جو تو نے سنی۔ پس دولت خدا داد کو ہرگز زوال نہیں ہوتا۔ مگر آدمی کی نیت درست چاہیے بلکہ جتنی خرچ کرو اس میں اتنی ہی برکت ہوتی ہے۔ خدا کی قدرت میں تعجب کرنا کسی مذہب میں روا نہیں!"

دائی نے یہ بات کہہ کر کہا "اب اگر، قصد وہاں کے جانے کا اور اُس کی خبر لانے کا، دل میں مقرر رکھتے ہو تو جلد روانہ ہو۔" میں نے کہا "اسی وقت میں جاتا ہوں اور خدا چاہے تو جلد پھر آتا ہوں۔" آخر رخصت ہو کر، فضل الٰہی پر نظر رکھ کر، اُس سمت کو چلا۔

برس دن کے عرصے میں، ہرج مرج کھینچتا ہوا، شہر نیم روز میں جا پہنچا۔ جتنے وہاں کے آدمی ہزاری اور بزاری نظر پڑے، سیاہ پوش تھے، جیسا احوال سنا تھا، اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کئی دنوں کے بعد چاند رات ہوئی۔ پہلی تاریخ، سارے لوگ اُس شہر کے، چھوٹے بڑے لڑکے بالے، اُمرا، بادشاہ عورت مرد، ایک میدان میں جمع ہوئے۔ میں بھی اپنی حالت میں حیران و سرگرداں اس کثرت کے ساتھ، اپنے مال ملک سے جدا، فقیر کی صورت بنا ہوا، کھڑا دیکھتا تھا کہ دیکھیے پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ اتنے میں ایک نوجوان گاؤ سوار، منہ میں کف بھرے، جوش خروش کرتا ہوا جنگل سے باہر نکلا۔ یہ عاجز جو اتنی محنت کرکے اُس کا احوال دریافت کرنے کی خاطر گیا تھا، دیکھتے ہی اُسے حواس باختہ ہو کر حیران کھڑا رہ گیا۔ وہ جوان مرد، قدیم قاعدے پر جو کام کرتا تھا، کر کر چلا گیا اور خلقت شہر کی، شہر کی طرف متوجہ ہوئی۔ جب مجھے ہوش آیا تب میں پچھتایا کہ یہ کیا تجھ سے حرکت ہوئی

اب مہینے بھر، پھر راہ دیکھنی پڑی۔ لاچار سب کے ساتھ چلا آیا اور اس مہینے کو، ماہِ رمضان کے مانند، ایک ایک دن گن گن کر کاٹا۔ بارے دوسری چاندرات آئی، مجھے گویا عید ہوئی۔ غرّے کو پھر پادشاہ، خلقت سمیت وہیں جا کر اکٹھے ہوئے۔ تب میں نے دل میں مصمّم ارادہ کیا کہ اب کی بار جو ہو سو ہو، اپنے تئیں سنبھال کر اس ماجرائے عجیب کو معلوم کیا چاہیئے۔

ناگاہ جوان بدستور، زرد بیل پر زین باندھے، سوار ہو آپہنچا، اور اُتر کر دوزانو بیٹھا۔ ایک ہاتھ میں ننگی سیف اور ایک ہاتھ میں بیل کی ناتھ پکڑی اور مرتبان غلام کو دیا۔ غلام ہر ایک کو دکھا کر لے گیا آدمی دیکھ کر رونے لگے، اُس جوان نے مرتبان پھوڑا اور غلام کو ایک تلوار ایسی ماری کہ سر جُدا ہو گیا اور آپ سوار ہو کر مڑا۔ میں اُس کے پیچھے قدم اٹھا کر چلنے لگا۔ شہر کے آدمیوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا "یہ کیا کرتا ہے، کیوں جان بوجھ کر مرتا ہے؟ اگر ایسا ہی تیرا دم ناک میں آیا ہے تو بہتیری طرحیں مرنے کی ہیں، مر رہیو"۔ ہر چند میں نے منت کی اور زور بھی کیا کہ کسو صورت سے ان کے ہاتھ سے چھوٹوں، چھٹکارا نہ ہوا۔ دو چار آدمی لپٹ گئے اور پکڑے ہوئے بستی کی طرف لے آئے۔ عجب طرح کا قلق پھر مہینے بھر گزرا۔

جب وہ بھی مہینہ تمام ہوا اور سلخ کا دن آیا، صبح کو اسی صورت سے سارے عالم، وہاں کا اژدحام ہوا، میں الگ سب سے، نماز کے وقت اُٹھ کر، آگے ہی جنگل میں دو جو عین اس جوان کی راہ پر تھا) گھس کر چھپ رہا کہ یہاں تو کوئی میرا مزاحم نہ ہوگا۔ وہ شخص اُسی قاعدے سے آیا اور وہی حرکتیں کر کر، سوار ہوا اور چلا۔ میں نے اُس کا پیچھا کیا اور دوڑتا دھوپتا، ساتھ ہو لیا۔ اس عزیز نے آہٹ سے معلوم کیا کہ کوئی چلا آتا ہے۔ ایک بارگی باگ موڑ کر ایک نعرہ مارا اور گھرکا، تلوار کھینچ میرے سر پر آپہنچا۔ چاہتا تھا کہ حملہ کرے، میں نے نہایت ادب سے جھک کر سلام کیا اور دونوں ہاتھ باندھ کر کھڑا رہ گیا۔ وہ قاعدہ دان متکلم ہوا کہ "اے فقیر! تو ناحق مارا گیا ہوتا، پر بچ گیا۔ تیری حیات کچھ باقی ہے۔ جا کہاں آتا ہے؟" اور جڑاؤ خنجر موتیوں کا اور آویزہ لگا ہوا، کمر سے نکال کر میرے آگے پھینکا اور کہا "اس وقت میرے پاس کچھ نقد موجود نہیں۔ یہ تجھے دوں۔ اس کو پادشاہ پاس لے جا۔ جو تو مانگے گا، دے گا"۔

ایسی ہیبت اور رعب اس کا مجھ پر غالب ہوا کہ نہ بولنے کی قدرت، نہ چلنے کی طاقت۔ منہ میں گھگی بندھ گئی اور پاؤں بھاری ہو گئے۔

اتنا کہہ کر وہ [illegible] تا ہوا چلا۔ میں نے دل میں کہا "ہر چہ بادا باد، اب رہ جانا [illegible]

تیرے حق میں بُرا ہے، پھر ایسا وقت نہ ملے گا۔" اپنی جان سے ہاتھ دھوکر میں بھی روانہ ہوا۔ پھر وہ پھرا اور بڑے غصّے سے ڈانٹا، اور مقرر ارادہ میرے قتل کا کیا۔ میں نے سر جھکا دیا اور سوگند دی کہ "اے رستمِ وقت کے! ایسی ہی ایک سیف مار کہ صاف دو ٹکڑے ہو جاؤں، ایک تسمہ باقی نہ رہے" اور اس حیرانی اور تباہی سے چھوٹ جاؤں! میں نے اپنا خون معاف کیا!" وہ بولا کہ "اے شیطان کی صورت کیوں اپنا خون ناحق میری گردن پر چڑھاتا ہے اور مجھے گنہگار بناتا ہے؟ جا اپنی راہ لے، کیا جان بھاری پڑی ہے؟" میں نے اُس کا کہا نہ مانا اور قدم آگے دھرا۔ پھر اُس نے دیدہ و دانستہ آنا کانی دی اور میں پیچھے لگ گیا۔ جاتے جاتے، دو کوس وہ جھاڑ جنگل طے کیا۔ ایک چار دیواری نظر آئی۔ وہ جوان دروازے پر گیا اور ایک نعرہ مہیب مارا۔ وہ در آپ سے آپ کھل گیا۔ وہ اندر بیٹھا، میں باہر کا باہر کھڑا رہ گیا۔ الٰہی اب کیا کروں! حیران تھا۔ بارے ایک دم کے بعد غلام آیا اور پیغام لایا کہ "چل تجھے روبرو بلایا ہے۔ شاید تیرے سر پر اجل کا فرشتہ آیا ہے۔ کیا تجھے کم بختی لگی تھی؟" میں نے کہا "زہے نصیب!" اور بے دھڑک اُس کے ساتھ اندر باغ کے گیا۔

آخر ایک مکان میں لے گیا، جہاں وہ بیٹھا تھا۔ میں نے اُسے دیکھ کر فراشی سلام کیا۔ اُس نے اشارت بیٹھنے کی کی۔ میں ادب سے دوزانو بیٹھا۔ کیا دیکھتا ہوں۔ کہ وہ مرد اکیلا مسند پر بیٹھا ہے اور ہتھیار زرگری کے آگے دھرے ہیں اور ایک جھاڑ زمرد کا تیار کر چکا ہے۔ جب اُس کے اٹھنے کا وقت آیا، جتنے غلام اُس شہ نشیں کے گرد و پیش حاضر تھے، حجروں میں چھپ گئے میں بھی، مارے وسواس کے، ایک کوٹھری میں جا گھسا۔ وہ جوان اُٹھ کر، سب مکانوں کی کنڈیاں چڑھا کر، باغ کے کونے کی طرف چلا اور اپنی سواری کے بیل کو مارنے لگا۔ اُس کے چلانے کی آواز میرے کان میں آئی۔ کلیجا کانپنے لگا، لیکن، اس ماجرے کی دریافت کرنے کی خاطر، یہ سب آفتیں سہیں تھیں۔ ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول کر، ایک درخت کے تنے کی آڑ میں جا کر کھڑا ہوا اور دیکھنے لگا۔ جوان نے وہ سونٹا جس سے وہ مارتا تھا، ہاتھ سے ڈال دیا اور ایک مکان کا قفل کنجی سے کھولا اور اندر گیا۔ پھر دو نہیں باہر نکل کر، نر گاؤ کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور منہ چوما، اور گھاس دانہ کھلا کر ادھر کو چلا۔ میں دیکھتے ہی جلد دوڑ کر پھر کوٹھری میں جا چھپا۔

اُس جوان نے زنجیریں، سب دروازوں کی، کھول دیں۔ سارے غلام باہر نکلے۔ زیر انداز اور سلیمچی آفتابہ لے کر، حاضر ہوئے۔ وہ وضو کر کر، نماز کی خاطر کھڑا ہوا۔ جب نماز ادا کر چکا، پکارا کہ "وہ درویش کہاں ہے؟" اپنا نام سنتے ہی، میں دوڑ کر روبرو جا کھڑا ہوا۔ فرمایا "بیٹھ"

میں تسلیم کر کر بیٹھا۔ خاصہ آیا، اُس نے تناول فرمایا، مجھے بھی عنایت کیا۔ میں نے بھی کھایا۔ جب دسترخوان بڑھایا اور ہاتھ دھوئے، غلاموں کو رخصت دی کہ جا کر سو رہو۔ جب کوئی اس مکان میں نہ رہا، تب مجھ سے ہم کلام ہوا اور پوچھا کہ "اے عزیز! تجھ پر کیا ایسی آفت آئی ہے جو تو اپنی موت کو ڈھونڈتا پھرتا ہے؟" میں نے اپنا احوال آغاز سے انجام تک جو گزرا تھا، تفصیل وار بیان کیا اور کہا "آپ کی توجہ سے امید ہے کہ اپنی مراد کو پہنچوں۔" اُس نے یہ سنتے ہی ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بے ہوش ہوا اور کہنے لگا "بارے خدایا! عشق کے درد سے تیرے سوا کون واقف ہے جس کی نہ پھٹی ہو بوائی، کیا جانے پیڑ پرائی۔ اس درد کی قدر، جو دردمند ہو سو جانے:

آفتوں کو عشق کی، عاشق سے پوچھا چاہیے
کیا خبر فاسق کو ہے؟ صادق سے پوچھا چاہیے"

بعد ایک دم کے، ہوش میں آ کر ایک آہ جگر سوز بھری، سارا مکان گونج گیا۔ تب مجھے یقین ہوا کہ یہ بھی اسی عشق کی بلا میں گرفتار ہے اور اسی مرض کا بیمار ہے۔ تب تو میں نے دل چلا کر کہا کہ "میں نے اپنا احوال سب عرض کیا۔ آپ توجہ فرما کر، اپنی سرگزشت سے بندے کو مطلع فرمائیے تو بہتر، اور اپنے، پہلے تمہارے واسطے سعی کروں اور دل کا مطلب کوشش کر کر، ہاتھ میں لاؤں۔" القصہ وہ عاشق صادق مجھ کو اپنا ہمراز اور ہمدرد جان کر، اپنا ماجرا اس صورت سے بیان کرنے لگا کہ "سن اے عزیز! میں بادشاہ زادہ جگرسوز، اس اقلیم نیم روز کا ہوں۔ بادشاہ یعنی قبلہ گاہ نے میرے پیدا ہونے کے بعد نجومی اور رمال اور پنڈت جمع کئے اور فرمایا کہ احوال شہزادے کے طالعوں کا دیکھو اور جانچو اور جنم پتری درست کرو اور جو جو کچھ ہونا ہے، ہر ساعت، پل پل، گھڑی گھڑی اور پہر پہر اور دن دن، مہینے مہینے اور برس برس کی، مفصل حضور میں عرض کرو۔" بہ موجب حکم بادشاہ کے سب نے متفق ہو، اپنے اپنے علم کی رو سے ٹھہرا اور سادھ کر التماس کیا کہ خدا کے فضل سے ایسی نیک ساعت اور شبھ لگن میں شہزادے کا تولد اور جنم ہوا ہے کہ چاہیے سکندر کی سی بادشاہت کرے اور نوشیروان سا عادل ہو اور جتنے علم و ہنر ہیں ان میں کامل ہو۔ اور جس کام کی طرف دل اس کا مائل ہو، وہ بخوبی حاصل ہو۔ سخاوت و شجاعت میں ایسا نام کرے کہ حاتم اور رستم کو لوگ بھول جاویں، لیکن چودہ برس تک، سورج اور چاند کے دیکھنے سے، ایک بڑا خطرہ نظر آتا ہے بلکہ یہ وسواس ہے کہ جنونی اور سودائی ہو جاوے، بہت آدمیوں کا خون کرے اور بستی سے گھبرا دے، جنگل میں نکل جاوے

اور چرند پرند کے ساتھ دل بہلا دے۔ اس کا تقید رہے دن رات۔ آفتاب ماہتاب کو نہ دیکھے، بلکہ آسمان کی طرف بھی نگاہ نہ کرنے پاوے، جو اتنی مدت خیر و عافیت سے کٹے تو پھر ساری عمر سکھ اور چین سے سلطنت کرے۔

"یہ سن کر بادشاہ نے، اسی لئے اُس باغ کی بنیاد ڈالی اور مکان متعدد ہر ایک نقشے کے بنوائے۔ میرے تئیں تہ خانے میں پلنے کا حکم کیا اور اُوپر ایک برج، مندے کا تیار کروا دیا تو دھوپ اور چاندنی اُس میں سے نہ چھنے رہیں۔ دائی، دودھ پلائی، اور انگا، چھوچھو اور کئی خواصوں کے ساتھ، اس محافظت سے اس مکان عالی شان میں پرورش پانے لگا اور ایک استاد دانا کارآزمودہ، واسطے میری تربیت کے متعین کیا، تو تعلیم ہر علم اور ہنر کی اور مشق ہفت قلم لکھنے کی کرے۔ اور جہاں پناہ ہمیشہ میرے خبر گیراں رہتے۔ دم بدم کی کیفیت، روز مرہ حضور میں عرض ہوتی۔ میں اُس مکان ہی کو عالم دنیا جان کر، کھلونوں اور رنگ برنگ پھولوں سے کھیلا کرتا اور سارے جہان کی نعمتیں، کھانے کے واسطے موجود رہتیں، جو چاہتا سو کھاتا۔ دس برس کی عمر تک تمام صنعتیں اور قابلیتیں تحصیل کیں۔

"ایک روز اُس گنبد کے نیچے، روشن دان سے ایک عجوبہ پھول چھینکے کا نظر پڑا کہ دیکھتے ہی دیکھتے بڑا ہوتا جاتا تھا۔ میں نے چاہا کہ ہاتھ سے پکڑوں۔ جوں جوں ہاتھ بڑھاتا تھا، اونچا ہوتا جاتا تھا۔ میں حیران ہو کر اُسے تک رہا تھا، کہ وہیں ایک آواز قہقہے کی میرے کان میں آئی۔ میں اس کے دیکھنے کو گردن اٹھائی۔ دیکھا تو مندا چیر کر ایک کھڑا چاند سا نکل رہا ہے۔ دیکھتے ہی اُس کے، میرے عقل و ہوش بجا نہ رہے۔ پھر اپنے تئیں سنبھال کر دیکھا تو ایک مرصع کا تخت پری زادوں کے کاندھے پر، معلق کھڑا ہے اور ایک تخت نشیں تاج جواہر کا سر پر، خلعت مطلا اور بدن میں پہنے، ہاتھ میں یاقوت کا پیالہ لئے اور شراب پئے ہوئے بیٹھی ہے۔ وہ تخت آہستہ آہستہ نیچے اُتر کر، اُس برج میں آیا۔ تب پری نے مجھے بلایا اور اپنے نزدیک بٹھا کر پیار کی کرنے لگی اور منہ سے منہ ملا کر ایک جام شراب گل گلاب کا میرے تئیں پلایا اور کہا آدمی زاد بے وفا ہوتا ہے لیکن دل ہمارا تجھے چاہتا ہے۔ ایک دم میں ایسی ایسی انداز و ناز کی باتیں کیں کہ دل محو ہو گیا اور ایسی خوشی حاصل ہوئی کہ زندگانی کا مزا پایا اور سمجھا کہ آج تو دنیا میں آیا۔

"حاصل یہ ہے کہ میں تو کیا سمجھوں؟ کسو نے یہ عالم نہ دیکھا ہوگا، نہ سنا ہوگا۔ آخر [illegible]

خاطر جمع سے، ہم دونوں بیٹھے تھے کہ کریاں میں علبلا لگا۔ اب اس حادثۂ ناگہانی کا ماجرا سن کہ وہ نہیں پارہ پری زاد، نے آسمان پر سے اتر کر، کچھ اس معشوقہ کے کان میں کہا۔ سنتے ہی اُس کا چہرہ تغیر ہو گیا اور مجھ سے بولی کہ "اے پیارے! دل تو یہ چاہتا تھا کہ کوئی دم تیرے ساتھ بیٹھ کر دل بہلاؤں اور اسی طرح ہمیشہ آؤں یا تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں، پر یہ آسمان، دو شخص کو ایک جگہ آرام سے اور خوشی سے رہنے نہیں دیتا۔ لے، جاناں! تیرا خدا نگہبان ہے۔" یہ سن کر میرے حواس جاتے رہے اور طوطے ہاتھ کے اُڑ گئے۔ میں نے کہا "اجی، اب پھر کب ملاقات ہوگی؟ یہ کیا تم نے غضب کی بات سنائی؟ اگر جلد آؤ گی تو مجھے جیتا پاؤ گی، نہیں تو پچھتاؤ گی۔ یا اپنا ٹھکانہ اور نام و نشان بتاؤ کہ میں ہی اُس پتے پر، ڈھونڈتے ڈھونڈتے، اپنے تئیں تمہارے پاس پہنچاؤں۔" یہ سن کر، بولی "دور پار، شیطان کے کان بہرے۔ تمہاری صد و بیست سال کی عمر ہووے۔ اگر زندگی ہے تو پھر ملاقات ہو رہے گی۔ میں جنوں کے بادشاہ کی بیٹی ہوں اور کوہ قاف میں رہتی ہوں۔" یہ کہہ کر تخت اٹھایا اور جس طرح اُترا تھا، وہ نہیں بلند ہونے لگا۔

"جب تلک سامنے تھا، میری اور اُس کی چار آنکھیں ہو رہی تھیں۔ جب نظروں سے غائب ہوا، یہ حالت ہو گئی جیسے پری کا سایہ ہوتا ہے۔ عجب طرح کی اُداسی دل پر چھا گئی، عقل و ہوش رخصت ہوا، دنیا آنکھوں کے تلے اندھیری ہو گئی۔ حیران و پریشان زار زار روتا اور سر پر خاک اڑاتا، کپڑے پھاڑتا، نہ کھانے کی سدھ، نہ بھلے بُرے کی بدھ۔

اس عشق کی بدولت، کیا کیا خرابیاں ہیں
دل میں اُداسیاں ہیں اور اضطرابیاں ہیں

"اس خرابی سے، دائی اور معلم خبردار ہوئے۔ ڈرتے ڈرتے بادشاہ کے روبرو گئے اور عرض کی کہ بادشاہ زادۂ عالمیان کا یہ حال ہے معلوم نہیں خود بخود کیا غضب ٹوٹا جو ان کا آرام اور کھانا پینا سب چھوٹا۔ تب بادشاہ، وزیر، اُمرائے صاحب تدبیر، اور طبیب حاذق، منجم صادق، ملا سیانے خوب، درویش، سالک اور مجذوب، اپنے ساتھ لے کر اس باغ میں رونق افزا ہوئے میری بے قراری اور نالہ و زاری دیکھ کر، ان کی بھی حالت اضطراب کی ہو گئی۔ آب دیدہ ہو کر بے اختیار گلے سے لگا لیا اور اس کی تدبیر کی خاطر حکم کیا۔ حکیموں نے، قوت دل اور خلل دماغ کے واسطے نسخے لکھے۔ ملاؤں نے نقش و تعویذ پلانے اور پاس رکھنے کو دیئے۔ دعائیں پڑھ پڑھ کر پھونکنے لگے۔ اور نجومی بولے کہ ستاروں کی گردش کے سبب سے یہ صورت پیش آئی ہے۔ اس کا صدقہ دیجئے ۔۔۔

ہر کوئی اپنے اپنے علم کی باتیں کہتا تھا پر مجھ پر جو گزرتی تھی میرا دل ہی سہتا تھا۔ کسو کی سعی اور تدبیر، میری تقدیر بد کے، کام نہ آئی۔ دن بہ دن دیوانگی کا زور ہوا اور میرا بدن، بے آب و دانے کمزور ہو چلا۔ رات دن چلّانا اور سر پٹکنا باقی رہا۔ اس حالت میں تین سال گزرے۔ چوتھے برس، ایک سوداگر سیر و سفر کرتا ہوا آیا، اور ہر ایک ملک کے تحفے تحائف، عجیب و غریب، جہاں پناہ کے حضور میں لایا، ملازمت حاصل کی۔

"بادشاہ نے بہت توجہ فرمائی اور احوال پرسی اس کی کر کے پوچھا کہ "تم نے بہت ملک دیکھے، کوئی حکیم قابل بھی نظر پڑا یا کسو سے مذکور اس کا سنا؟" اس نے التماس کیا کہ "قبلۂ عالم! غلام نے بہت سیر کی، لیکن ہندوستان میں دریا کے بیچ ایک پہاڑی ہے، وہاں ایک گسائیں جٹا دھاری نے بڑا مندھ مہادیو کا، اور سنگت اور باغ، بڑی بہار کا بنایا ہے۔ اس میں رہتا ہے اور اس کا یہ قاعدہ ہے کہ برسویں دن شیو رات کے روز، اپنے استھان سے نکل کر، دریا میں پیرتا ہے اور خوشی کرتا ہے۔ اشنان کے بعد جب اپنے آسن پر جانے لگتا ہے، تب بیمار اور دردمند، دیس دیس اور ملک کے، جو دور دور سے آتے ہیں، دروازے پر جمع ہوتے ہیں۔ انکی بڑی بھیڑ ہوتی ہے وہ مہنت، (جسے اس زمانے کا افلاطون کہا چاہیے) قارورہ اور نبض دیکھتا ہوا، اور ہر ایک کو نسخہ لکھ کر دیتا ہوا، چلا جاتا ہے۔ خدا نے ایسا دستِ شفا اس کو دیا ہے کہ دوا پیتے ہی اثر ہوتا ہے اور وہ مرض بالکل جاتا رہتا ہے۔ یہ ماجرا میں نے بچشمِ خود دیکھا اور خدا کی قدرت کو یاد کیا کہ ایسے ایسے بندے پیدا کیے ہیں۔ اگر حکم ہو تو شہزادۂ عالمیاں کو اس کے پاس لے جاویں۔ اس کو ایک نظر دکھاویں، امید قوی ہے کہ جلد شفا کامل ہو۔ اور ظاہر میں بھی یہ تدبیر اچھی ہے کہ ہر ایک ملک کی ہوا کھانے سے، اور جابجا کے آب و دانے سے، مزاج میں فرحت آتی ہے۔"

بادشاہ کو اس کی صلاح پسند آئی اور خوش ہو کر فرمایا "بہت بہتر شاید اس کا ہاتھ راس آوے اور میرے فرزند کے دل سے وحشت جاوے۔" ایک امیر معتبر، جہاں دیدہ، کار آزمودہ کو اور اس تاجر کو، میری رکاب میں تعینات کیا اور اسباب ضروری ساتھ کر دیا۔ نواڑے بجرے، مورپنکھی، پلوار، لچکے، کھیلنے، اُلاق، پٹیلیوں پر، مع سرانجام، سوار کر کر رخصت کیا۔ منزل منزل چلتے چلتے اس ٹھکانے پر جا پہنچے۔ نئی ہوا اور نیا دانہ پانی کھانے پینے سے کچھ مزاج ٹھہرا لیکن خاموشی کا وہی عالم اور رونے سے کام۔ دم بہ دم یاد اس پری کی دل سے بھولتی نہ تھی، اگر کبھو بھولتا، تو یہ بیت پڑھتا:

نہ جانوں کس پری رو کی نظر ہوئی
ابھی تو تھا بھلا چنگا مرا دل!

"بارے جب دو تین مہینے گزرے، اُس پہاڑ پر، قریب چار ہزار مریض کے جمع ہوئے لیکن سب یہی کہتے تھے کہ 'اب خدا چاہے تو گسائیں اپنی مٹھ سے نکلیں گے اور سب کو ان کے فرمانے سے شفا کلی ہوگی۔' القصہ جس دن وہ دن آیا، صبح کو، جوگی مانند آفتاب کے نکل آیا اور دریا میں نہایا اور پیرا۔ پار جاکر پھر آیا اور بھبھوت بھسم، تمام بدن میں لگایا۔ وہ گورا بدن، مانند انگارے کے راکھ میں چھپایا اور ماتھے پر ملاگیر کا ٹیکا دیا۔ لنگوٹ باندھ کر، انگوچھا کاندھے پر ڈالا۔ بالوں کا جوڑا باندھا مونچھوں پر تاؤ دے کر، چڑھواں جوتا اڑایا۔ اُس کے چہرے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا اس کے نزدیک کچھ قدر نہیں رکھتی۔ ایک قلم دان جڑاؤ بغل میں لے کر، ایک ایک طرف دیکھتا اور نسخہ دیتا ہوا میرے نزدیک آ پہنچا۔ جب میری اور اس کی چار نظریں ہوئیں، کھڑا رہ کر غور میں گیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ 'ہمارے ساتھ آؤ'؛ میں ہم راہ ہولیا۔

"جب سب کی نوبت ہو چکی، میرے تئیں باغ کے اندر لے گیا اور ایک تمتّع خوش نقشے خلوت خانے میں مجھے فرمایا کہ 'یہاں تم رہا کرو' اور آپ اپنے استھان میں گیا۔ جب ایک چلّہ گزرا تو میرے پاس آیا اور آگے کی نسبت مجھے خوش پایا۔ تب مسکرا کر فرمایا کہ 'اس باغیچے میں سیر کیا کرو، جس میوے پر جی چلے، کھایا کرو' اور ایک قلفی چینی کی معجون سے بھری ہوئی دی کہ 'اس میں سے چھ ماشے ہمیشہ بلاناغہ نہار نوش جان فرمایا کرو'۔ یہ کہہ کر وہ تو چلا گیا۔ اور میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔ ہر روز، قوت بدن میں، اور فرحت دل کو معلوم ہونے لگی۔ لیکن حضرت عشق کو کچھ اثر نہ کیا، اُس پری کی صورت نظروں کے آگے پھرتی رہتی تھی۔

"ایک روز طاق میں ایک جلد کتاب کی نظر آئی، اُتار کر دیکھا تو سارے علم دین و دنیا کے اُس میں جمع کئے تھے، گویا دریا کو کوزے میں بھر دیا تھا۔ ہر گھڑی اس کا مطالعہ کیا کرتا، علم حکمت اور تسخیر میں نہایت قوت بہم پہنچائی۔ اس عرصے میں برس دن گزر گیا۔ پھر وہی خوشی کا دن آیا۔ جوگی اپنے آسن پر سے اُٹھ کر باہر نکلا۔ میں نے سلام کیا۔ اس نے قلم دان مجھے دے کر کہا، 'ساتھ چلو'۔ میں بھی ساتھ ہولیا۔ جب دروازے سے باہر نکلا، ایک عالم دعا دینے لگا۔ وہ امیر اور سوداگر مجھے ساتھ دیکھ کر، گسائیں کے قدموں پر گرے اور ادائے شکر کرنے لگے کہ 'آپ کی توجہ سے بلا سے آرام تو ہوا'۔ وہ اپنی عادت پر دریا کے گھاٹ تک گیا اور اشنان پوجا جس طرح ہر

سال کرتا تھا، کی۔ پھرتی بار، بیماروں کو دیکھتا بھالتا، چلا آتا تھا۔

"اتفاقاً سودائیوں کے غول میں ایک جوان، خوبصورت، شکیل کہ ضعف سے کھڑے ہونے کی طاقت اُس میں نہ تھی، نظر پڑا۔ مجھ کو کہا کہ اس کو ساتھ لے آؤ۔ سب کی دارو درمن کر کے جب خلوت خانے میں تھوڑی سی کھوپڑی اُس جوان کی تراش کر، چاہا کہ کنکھجورا جو مغز پر بیٹھا تھا، زنبور سے اُٹھا لیوے۔ میرے خیال میں گزرا اور بول اٹھا کہ 'اگر دست پناہ، آگ میں گرم کر کر، اُس کی پیٹھ پر رکھیے تو خوب ہے۔ آپ سے آپ نکل آوے گا۔ اور جو یوں کھینچیے گا تو مغز کے گودے کو نہ چھوڑے گا، پھر خوف زندگی کو ہے۔' یہ سن کر میری طرف دیکھا اور چپکا اُٹھ، باغ کے کونے میں ایک درخت کو لے میں پکڑ، جٹا کی لٹ کی، گلے میں پھانسی لگا کر رہ گیا۔ میں نے پاس جا کر جو دیکھا تو واہ واہ یہ تو مر گیا! یہ اچنبھا دیکھ کر نہایت افسوس ہوا، لاچار جی میں آیا اُسے گاڑ دوں۔ جوں درخت سے جُدا کرنے لگا دو کنجیاں اُس کی لٹوں میں سے گر پڑیں۔ میں نے اُن کو اٹھا لیا اور اُس گنج خوبی کو زمین میں دفن کیا۔ وے دونوں کنجیاں لے کر، سب قفلوں میں لگانے لگا۔ اتفاقاً دو حجرے کے تالے اُن کنجیوں سے کھلے، دیکھا تو زمین سے چھت تلک جواہر بھرا ہوا ہے اور ایک پیٹی مخمل سے مڑھی، سونے کے پتر لگی، قفل دی ہوئی، ایک طرف دھری ہے۔ اُس کو جو کھولا تو ایک کتاب دیکھی کہ اس میں اسمِ اعظم، اور حاضرات جن و پری کے، اور روحوں کی ملاقات اور تسخیر آفتاب کی ترکیب لکھی ہے۔

"ایسی دولت کے ہاتھ لگنے سے نہایت خوشی حاصل ہوئی اور ان پر عمل کرنا شروع کیا۔ دروازہ باغ کا کھول دیا، اپنے اُس امیر کو اور ساتھ والوں کو کہا کہ کشتیاں منگوا کر، یہ سب جواہر و نقد و جنس اور کتابیں بار کرو، اور ایک نواڑے پر سوار ہو کر وہاں سے بحر کو روانہ کیا۔ آتے آتے جب نزدیک اپنے ملک کے پہنچا، جہاں پناہ کو خبر ہوئی، سوار ہو کر استقبال کیا اور اشتیاق سے بے قرار ہو کر کلیجے سے لگا لیا۔ میں نے قدم بوسی کر کر کہا کہ 'اس خاکسار کو قدیم باغ میں رہنے کا حکم ہو۔' بولے کہ 'اے برخوردار! وہ مکان میرے نزدیک منحوس ٹھہرا۔ لہٰذا اُس کی مرمت اور تیاری موقوف کی۔ اب وہ مکان، لائق انسان کے رہنے کے، نہیں رہا۔ اور جس محل میں جی چاہے اُترو۔ بہتر یوں ہے کہ قلعے میں کوئی جگہ پسند کر کے میری آنکھوں کے روبرو رہو اور پائیں باغ، جیسا چاہو تیار کر دو، کہ سیر تماشا دیکھا کرو۔' میں نے، بہت ضد اور ہٹ کر کر، اُس باغ کو نئے سرے سے تعمیر کروایا اور بہشت کے مانند آراستہ کر، داخل ہوا۔ پھر فراغت سے 'جنوں کی

تسخیر کی خاطر چلے بیٹھا اور ترک حیوانات کر کر، حاضرات کرنے لگا۔

"جب چالیس دن پورے ہوئے، تب آدھی رات کو ایسی آندھی آئی کر بڑی بڑی عمارتیں گر پڑیں اور درخت جڑ سے اُکھڑ کر، کہیں سے کہیں جا پڑے، اور پری زادوں کا لشکر نمود ہوا۔ ایک تخت ہوا سے اُترا۔ اُس پر ایک شخص، شاندار موتیوں کا تاج اور خلعت پہنے ہوئے، بیٹھا تھا۔ میں نے دیکھتے ہی بہت مؤدب ہو کر سلام کیا۔ اُس نے میرا سلام لیا اور کہا کہ 'اے عزیز! یہ کیا تو نے ناحق دند مچایا؟ ہم سے تجھے کیا مدعا ہے؟' میں نے التماس کیا کہ 'یہ عاجز بہت مدت سے تمہاری بیٹی پر عاشق ہے اور اسی لئے کہاں سے کہاں خراب و خستہ ہوا اور جیتے جی موا۔ اب زندگی سے بہت تنگ آیا ہوں اور اپنی جان پر کھیلا ہوں، جو یہ کام کیا ہے۔ اب آپ کی ذات سے امیدوار ہوں کہ مجھ حیران و سرگرداں کو اپنی توجہ سے سرفراز کرو، اور اُس کے دیدار سے زندگی اور آرام بخشو تو بڑا ثواب ہوگا؟'

"یہ میری آرزو سن کر بولا کہ 'آدمی خاکی اور ہم آتشی، ان دونوں میں موافقت آنی مشکل ہے۔' میں نے قسم کھائی کہ 'میں اُن کے دیکھنے کا مشتاق ہوں اور کچھ مطلب نہیں۔' پھر اس تخت نشین نے جواب دیا کہ 'انسان اپنے قول و قرار پر نہیں رہتا۔ غرض کے وقت سب کچھ کہتا ہے لیکن یاد نہیں رکھتا۔ یہ بات میں تیرے بھلے کے لئے کہہ سنتا ہوں کہ اگر تو نے کبھو قصد کچھ اور کیا تو وہ بھی اور تو بھی دونوں خراب خستہ ہو گے بلکہ خوف جان کا ہے۔' میں نے پھر دوبارہ سوگند یاد کی کہ 'جس میں طرفین کی برائی ہووے، ویسا کام ہرگز نہ کروں گا، مگر ایک نظر دیکھتا رہوں گا۔' یہ باتیں ہوتیاں تھیں کہ ناگہاں وہ پری (کہ جس کا مذکور تھا) نہایت ٹھسے سے بناؤ کئے ہوئے آ پہنچی اور بادشاہ کا تخت وہاں سے چلا گیا۔ تب میں نے بے اختیار اس پری کو جان کی طرح بغل میں لے لیا اور یہ شعر پڑھا:

> کمان ابرو، مرے گھر کیوں نہ آوے
> کہ جس کے واسطے کھینچے ہیں چلے

"اسی خوشی کے عالم میں، ما ہم اُس باغ میں رہنے لگے۔ مارے ڈر کے کچھ اور خیال نہ کرتا، بالائی مزے لیتا اور فقط دیکھا کرتا۔ وہ پری میرے قول و قرار کے نباہنے پر دل میں حیران رہتی اور بعضے وقت کہتی کہ 'پیارے! تم بھی اپنی بات کے بڑے پکے ہو، لیکن ایک نصیحت میں دوستی کی راہ سے کرتی ہوں، اپنی کتاب سے خبردار رہیو کہ جن کسی نہ کسی دن تمہیں غافل پا کر، چُرا لے جائیں گے۔' میں نے کہا 'اس کو میں اپنی جان کے برابر رکھتا ہوں۔'

"اتفاقاً ایک روز رات کو شیطان نے ورغلایا۔ شہوت کی حالت میں یہ دل میں آیا کہ جو کچھ

ہوسو ہو، کہاں تلک اپنے تئیں تھانبوں؟ اُسے چھاتی سے لگا لیا اور بوس و کنار کیا۔ دو نہیں ایک آواز آئی "یہ کتاب مجھ کو دے کہ اس میں اسم اعظم ہے۔ بے ادبی نہ کر؛ اُس مستی کے عالم میں کچھ ہوش نہ رہا، کتاب بغل سے نکال کر، بغیر جانے پہچانے، حوالے کر دی اور اپنے کام میں لگا۔ وہ نازنین یہ میری نادانی کی حرکت دیکھ کر، بولی کہ "ہے ظالم! آخر چوکا اور نصیحت بھولا؟"

"یہ کہہ کر بے ہوش ہو گئی اور میں نے اُس کے سرہانے ایک دیو دیکھا کہ کتاب لئے کھڑا ہے چاہا کہ پکڑ کر خوب ماروں اور کتاب چھین لوں۔ اتنے میں اُس کے ہاتھ سے کتاب دوسرا لے بھاگا میں نے جو افسوں یاد کئے تھے پڑھنے شروع کئے۔ وہ جن جو کھڑا تھا بیل بن گیا، لیکن افسوس کہ پری ذرا بھی ہوش میں نہ آئی اور وہی حالت بے خودی کی رہی۔ تب میرا دل گھبرایا، سارا عیش تلخ ہو گیا۔ اُس روز سے آدمیوں سے نفرت ہوئی۔ اس باغ کے گوشے میں پڑا رہتا ہوں اور دل کے بہلانے کی خاطر، یہ مرتبان زمرد کا، جھاڑ دار بنایا کرتا ہوں اور ہر مہینے، اُس میدان میں اُسی بیل پر سوار ہو کر، جایا کرتا ہوں۔ مرتبان کو توڑ کر غلام کو مار ڈالتا ہوں، اس اُمید پر کہ سب میری یہ حالت دیکھیں اور افسوس کھاویں۔ شاید کوئی، ایسا خدا کا بندہ مہربان ہو کہ میرے حق میں دعا کرے تو میں بھی اپنے مطلب کو پہنچوں۔ اے رفیق! میرے جنون اور سودا کی یہ حقیقت ہے جو میں نے تجھے کہہ سنائی۔"

میں سن کر آب دیدہ ہوا اور بولا کہ "شہزادے! تو نے واقعی عشق کی بڑی محنت اٹھائی۔ لیکن قسم خدا کی کھاتا ہوں کہ میں اپنے مطلب سے درگزرا۔ اب تیری خاطر، جنگل پہاڑ میں پھروں گا اور جو مجھ سے ہو سکے گا سو کروں گا۔" یہ وعدہ کر کر، میں اُس جوان سے رخصت ہوا، اور پانچ برس تک سودائی سا ویرانے میں خاک چھانتا پھرا، سراغ نہ ملا۔ آخر اکتا کر ایک پہاڑ پر چڑھ گیا اور چاہا کہ اپنے تئیں گرا دوں کہ ہڈی پسلی کچھ ثابت نہ رہے، وہی سوار برقعہ پوش آ پہنچا اور بولا کہ "اپنی جان مت کھو۔ تھوڑے دنوں کے بعد، تو اپنے مقصد سے کامیاب ہوگا۔"

یا سائیں اللہ! تمہارے دیدار تو میسّر ہوئے۔ اب خدا کے فضل سے اُمیدوار ہوں کہ خوشی اور خرمی ہو، اور سب نامراد اپنی مُراد کو پہنچیں۔"

سرگزشت آزاد بخت پادشاہ کی

جب دوسرا درویش بھی اپنی سیر کا قصہ کہہ چکا، رات آخر ہوگئی اور وقت صبح کا شروع ہونے پر آیا۔ آزاد بخت، چپکے، اپنے دولت خانے کی طرف روانہ ہوا۔ محل میں پہنچ کر نماز ادا کی پھر غسل خانے میں جا، خلعت فاخرہ پہن کر، دیوان عام میں تخت پر نکل بیٹھا اور حکم کیا کہ "لیسا دل جا دے، چار فقیر فلانے مکان پر وارد ہیں، اُن کو بہ عزت اپنے ساتھ حضور میں لے آوے"۔ بموجب حکم کے، چوبدار وہاں گیا۔ دیکھا تو چار بے نوا، جھاڑا جھٹکا پھر، ہاتھ منہ دھو کر، چاہتے ہیں کہ دسا کریں اور اپنی اپنی راہ لیں۔ چیلے نے کہا "شاہ جی! بادشاہ نے چاروں صورتوں کو طلب فرمایا ہے۔ میرے ساتھ چلیئے"۔ چاروں درویش، آپس میں، ایک ایک کو تکنے لگا اور چوب دار سے کہا "بابا! ہم اپنے دل کے بادشاہ ہیں، ہمیں دنیا کے بادشاہ سے کیا کام ہے!" اس نے کہا "میاں اللہ! مضائقہ نہیں، اگر چلو تو اچھا ہے"۔

اتنے میں چاروں کو یاد آیا کہ مولا مرتضیٰ نے جو فرمایا تھا، سو اب پیش آیا۔ خوش ہوئے اور لیسا دل کے ہم راہ چلے۔ جب قلعے میں پہنچے اور روبرو بادشاہ کے گئے، چاروں قلندروں نے دعا دی کہ "بابا! تیرا بھلا ہو"۔ بادشاہ دیوان خاص میں جا بیٹھے، اور دو چار خاص امیروں کو بلا یا اور فرمایا کہ "چاروں گدڑی پوشوں کو بلاؤ"۔ جب وہاں گئے، حکم بیٹھنے کا کیا۔ احوال پرسی فرمائی کہ "تمہارا کہاں سے آنا ہوا، اور کہاں کا ارادہ ہے؟ مکان مرشدوں کے کہاں ہیں؟"

انہوں نے کہا کہ "بادشاہ کی عمر و دولت زیادہ رہے! ہم فقیر ہیں۔ ایک مدت سے اسی طرح سیر و سفر کرتے پھرتے ہیں، خانہ بدوش ہیں۔ وہ مثل ہے: فقیر کو جہاں شام ہوئی، وہ نہیں گھر ہے اور جو کچھ اس دنیائے ناپائدار میں دیکھا ہے، کہاں تک بیان کریں؟"

آزاد بخت نے بہت تسلی اور تشفی کی اور کھانے کو منگوا کر، اپنے روبرو ناشتہ کروایا۔ جب فارغ ہوئے، پھر فرمایا کہ "اپنا ماجرا، تمام، بے کم و کاست، مجھ سے کہو۔ جو مجھ سے تمہاری خدمت ہو سکے گی، قصور نہ کروں گا"۔ فقیروں نے جواب دیا کہ "ہم پر جو کچھ بیتا ہے، نہ ہمیں بیان کرنے کی طاقت ہے اور نہ بادشاہ کو سننے سے فرحت ہوگی۔ اس کو معاف کیجیے"۔ تب بادشاہ نے تبسم کیا اور کہا "شب کو جہاں تم بستروں پر بیٹھے، اپنا اپنا احوال کہہ رہے تھے، وہاں میں بھی موجود تھا۔

چنانچہ دو درویش کا احوال سُن چکا ہوں۔ اب چاہتا ہوں کہ دونوں جو باقی ہیں، وے بھی کہیں اور چند روز، بہ خاطر جمع، میرے پاس رہیں کہ قدم درویشاں رد بلا ہے۔" پادشاہ سے یہ بات سنتے ہی یار، خوف کے کانپنے لگے اور سر نیچے کر کے چپ ہو رہے، طاقت گویائی کی نہ رہی۔

آزاد بخت نے جب دیکھا کہ اب ان میں، مارے رعب کے، حواس نہیں رہے جو کچھ بولیں، فرمایا کہ "اس جہان میں کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جس پر ایک نہ ایک واردات عجیب و غریب نہ ہوئی ہوگی، باوجودیکہ میں پادشاہ ہوں لیکن میں نے بھی ایسا تماشا دیکھا ہے کہ پہلے میں ہی اس کا بیان کرتا ہوں، تم بہ خاطر جمع سنو۔" درویشوں نے کہا "پادشاہ سلامت! آپ کا الطاف فقیروں کے حال پر ایسا ہے، ارشاد فرمائیے۔" آزاد بخت نے اپنا احوال شروع کیا، اور کہا:

"اے شاہو! پادشاہ کا اب ماجرا سنو!
جو کچھ کہ میں نے دیکھا ہے، اور ہے سُنا، سنو!
کہتا ہوں میں، فقیروں کی خدمت میں سربسر،
احوال میرا، خوب طرح دل لگا، سنو!

میرے قبلہ گاہ نے جب وفات پائی اور میں اس تخت پر بیٹھا، عین عالم شباب کا تھا اور سارا یہ ملک روم کا، میرے حکم میں تھا۔ اتفاقاً ایک سال، کوئی سوداگر بدخشاں کے ملک سے آیا اور اسباب تجارت کا بہت سا لایا۔ خبرداروں نے میرے حضور میں خبر کی کہ ایسا بڑا تاجر آج تک شہر میں نہیں آیا۔

میں نے اُس کو طلب فرمایا۔

وہ تحفے ہر ایک ملک کے، لائق میری نذر کے، لے کر آیا۔ فی الواقع، ہر ایک جنس بے بہا نظر آئی۔ چنانچہ ایک ڈبیہ میں لعل تھا، نہایت خوش رنگ اور آب دار، قد و قامت درست، اور وزن میں پانچ مثقال کا۔ میں نے، باوجود سلطنت کے، ایسا جواہر کبھو نہ دیکھا تھا اور نہ کسو سے سنا تھا۔ پسند کیا۔ سوداگر کو بہت سا انعام و اکرام دیا اور سند راہداری کی، لکھ دی کہ اُس سے ہمارے تمام قلمرو میں کوئی مزاحم محصول کا نہ ہو، اور جہاں جاوے اُس کو آرام سے رکھیں۔ چوکی پہرے میں حاضر رہیں۔ اس کا نقصان اپنا نقصان سمجھیں۔ وہ تاجر، حضور میں دربار کے وقت حاضر رہتا، اور آداب سلطنت سے خوب واقف تھا، اور تقریر و خوش گوئی اُس کی، لائق سننے کے تھی، اور میں اس لعل کو ہر روز جواہر خانے سے منگوا کر سر دربار دیکھا کرتا۔

ایک روز دیوانِ عام کئے بیٹھا تھا، اور اُمرا ارکان دولت اپنے پائے پر کھڑے تھے اور ہر ملک کے بادشاہوں کے ایلچی مبارک باد کی خاطر جو آئے تھے، وہ بھی سب حاضر تھے۔ اُس وقت میں نے موافق معمول کے، اُس لعل کو منگوایا۔ جواہر خانے کا داروغہ لے کر آیا، میں ہاتھ میں لے کر تعریف کرنے لگا اور فرنگ کے ایلچی کو دیا۔ اُس نے دیکھ کر تبسم کیا اور زمانہ سازی سے صفت کی۔ اسی طرح ہاتھوں ہاتھ ہر ایک نے لیا اور دیکھا اور ایک زبان ہو کر بولے کہ "قبلۂ عالم کے اقبال کے باعث، یہ میسّر ہوا ہے، والّا کسو بادشاہ کے ہاتھ آج تک ایسا رتن بے بہا نہیں لگا۔" اُس وقت میرے قبلہ گاہ کا وزیر کہ مرد دانا تھا اور اُسی خدمت پر سرفراز تھا، وزارت کی چوکی پر کھڑا تھا، آداب بجالایا اور التماس کیا کہ "کچھ عرض کیا چاہتا ہوں، اگر جان بخشی ہو۔"

میں نے حکم کیا کہ "کہہ"، وہ بولا "قبلۂ عالم! آپ بادشاہ ہیں اور بادشاہوں سے بہت بعید ہے کہ ایک پتھر کی اتنی تعریف کریں۔ اگرچہ رنگ ڈھنگ، سنگ میں لاثانی ہے لیکن سنگ ہے۔ اور اس دم سب ملکوں کے ایلچی، دربار میں حاضر ہیں، جب اپنے اپنے شہر میں جاویں گے البتہ یہ نقل کریں گے کہ عجب بادشاہ ہے کہ ایک لعل کہیں سے پایا ہے، اُسے ایسا تحفہ بنایا ہے کہ ہر روز روبرو منگواتا ہے اور آپ، اُس کی تعریف کر کر، سب کو دکھاتا ہے۔ پس جو بادشاہ یا راجہ یہ احوال سُنے گا، اپنی مجلس میں ہنسے گا۔ خداوندا! ایک ادنیٰ سوداگر، نیشاپور میں ہے، اُس نے بارہ دانے لعل کے کہ ہر ایک سات سات مثقال کا ہے، پٹے میں نصب کر کر، کتے کے گلے میں ڈال دیئے ہیں۔" مجھے سنتے ہی غصہ چڑھ آیا اور کھسیانے ہو کر فرمایا کہ "اس وزیر کی گردن مارو۔"

جلّادوں نے، دو نہیں اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور چاہا کہ باہر لے جاویں، فرنگ کے بادشاہ کا ایلچی، دست بستہ روبرو آ کھڑا ہوا۔ میں نے پوچھا کہ "تیرا کیا مطلب ہے؟" اس نے عرض کی "اُمیدوار ہوں کہ تقصیر سے وزیر کی واقف ہوں۔" میں نے فرمایا کہ "جھوٹ بولنے سے اور بڑا گناہ کون سا ہے، خصوصاً بادشاہوں کے روبرو؟" اُس نے کہا "اُس کا دروغ ثابت نہیں ہوا۔ شاید جو کچھ کہ عرض کی ہے، سچ ہو۔ ابھی بے گناہ کا قتل کرنا درست نہیں۔" اُس کا میں نے یہ جواب دیا کہ "ہرگز عقل میں نہیں آتا، ایک تاجر کہ نفع کے واسطے شہر بہ شہر اور ملک بہ ملک خراب ہوتا پھرتا ہے اور کوڑی کوڑی جمع کرتا ہے، بارہ دانے لعل کے، جو وزن میں سات سات مثقال کے ہوں، کتے کے پٹے میں لگا دے۔" اُس نے کہا "خدا کی قدرت سے تعجب نہیں۔ شاید کہ باشد۔ ایسے تحفے، اکثر سوداگروں اور فقیروں کے ہاتھ آتے ہیں۔ اس واسطے کہ یہ دونوں ہر ایک ملک میں جاتے ہیں اور

یہاں سے جو کچھ پاتے ہیں، لے آتے ہیں۔ صلاح دولت ہے کہ اگر وزیر ایسا ہی تقصیر وار ہے تو حکم قید کا ہو اس لئے کہ وزیر پادشاہوں کی عقل ہوتے ہیں اور یہ حرکت سلاطینوں سے بدنما ہے کہ ایسی بات پر، کہ جھوٹ سچ، اس کا ابھی ثابت نہیں ہوا، حکم قتل کا فرمائیں اور اس کی تمام عمر کی خدمت اور نمک حلالی بھول جائیں۔ پادشاہ سلامت! اگلے شہر یاروں نے بندی خانہ اسی سبب سے ایجاد کیا ہے کہ پادشاہ یا سردار اگر کسو پر غضب ہوں، تو اُسے قید کریں۔ کئی دن میں غصہ جاتا رہے گا اور بے تقصیری اس کی ظاہر ہو گی۔ پادشاہ خونِ ناحق سے محفوظ رہیں گے۔ کل کو روز قیامت میں ماخوذ نہ ہوں گے۔" میں نے جتنا اُس کو قائل کرنے کو چاہا، اُس نے ایسی معقول گفتگو کی کہ مجھے لاجواب کیا۔ تب میں نے کہا کہ "خیر تیرا کہنا پذیرہ ہُوا۔ میں خون سے اُس کے درگزرا لیکن زندان میں مقید رہے گا۔ اگر ایک سال کے عرصے میں، اُس کا سخن راست ہُوا کہ ایسے لعل، کتے کے گلے میں ہیں تو اس کی نجات ہو گی اور نہیں تو، بڑے عذاب سے مارا جائے گا۔" فرمایا کہ "وزیر کو پنڈت خانے میں لے جاؤ۔" یہ حکم سن کر ایلچی نے زمین، خدمت کی، چومی اور تسلیمات کی۔

جب یہ خبر وزیر کے گھر میں گئی، آہ و واویلا مچا اور ماتم سرا ہو گیا۔ اُس وزیر کی ایک بیٹی تھی، برس چودہ پندرہ کی، نہایت خوبصورت اور قابل، نوشت و خواند میں درست۔ وزیر اس کو بیٹ پیار کرتا تھا اور عزیز رکھتا تھا۔ چنانچہ اپنے دیوان خانے کے پچھواڑے، ایک رنگ محل اُس کی خاطر بنوا دیا تھا اور لڑکیاں، عمدوں کی، اُس کی مصاحبت میں، اور خواصیں شکیل، خدمت میں رہتیں، اُن سے ہنسی خوشی کھیلا کودا کرتی۔

اتفاقاً جس دن، وزیر کو محبوس خانے میں بھیجا، وہ لڑکی اپنی ہم جولیوں میں بیٹھی تھی اور خوشی سے گڑیا کا بیاہ رچایا تھا، اور ڈھولک پکھاوج لئے ہوئے، رت جگے کی تیاری کر رہی تھی۔ اور کڑاہی چڑھا کر گلگلے اور رحم تلے، بنا رہی تھی کہ ایک بارگی اُس کی ماں، روتی پیٹتی، سر کھلے، پاؤں ننگے، بیٹی کے گھر میں گئی۔ اور دو ہتڑ اُس لڑکی کے سر پہ ماری اور کہنے لگی "کاش کہ! تیرے بدلے خدا اندھا بیٹا دیتا تو میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا اور باپ کا رفیق ہوتا۔" وزیر زادی نے پوچھا "اندھا بیٹا تمہارے کس کام آتا؟ جو کچھ بیٹا کر سکتا ہے میں بھی کر سکتی ہوں۔" اماں نے جواب دیا "خاک تیرے سر پہ، یہ بیٹا بیتی ہے کہ پادشاہ کے روبرو کچھ ایسی بات کہی کہ بندی خانے میں قید ہوا۔" اُس نے پوچھا "وہ کیا بات تھی؟ ذرا میں بھی سنوں۔" تب وزیر کے قبیلے نے کہا کہ تیرے باپ نے شاید یہ کہا کہ نیشاپور میں کوئی سوداگر ہے اُس نے بارہ عدد لعل بے بہا، کتے کے پٹے میں ٹانکے ہیں۔ پادشاہ کو

باور نہ ہوا، اُسے جھوٹا سمجھا اور اسیر کیا۔ اگر آج کے دن بیٹا ہوتا تو ہر طرح سے کوشش کر کر اس بات کو تحقیق کرتا، اور اپنے باپ کا اُپرالا کرتا، اور پادشاہ سے عرض معروض کر کے میرے خاوند کو بندی خانے سے مخلصی دلواتا۔"

وزیرزادی بولی "اماں جان! تقدیر سے لڑا نہیں جاتا۔ چاہیئے، انسان بلائے ناگہانی میں صبر کرے اور امیدوار فضلِ الٰہی کا رہے۔ وہ کریم ہے، مشکل کسو کی اٹکی نہیں رکھتا اور رونا دھونا خوب نہیں۔ مبادا، دشمن اور طرح سے پادشاہ کے پاس لگادیں اور لترے چغلی کھادیں کہ باعث زیادہ خفگی کا ہو۔ بلکہ جہاں پناہ کے حق میں دعا کرو۔ ہم اس کے خانہ زاد ہیں، وہ ہمارا خداوند ہے۔ وہی غضب ہوا ہے وہی مہربان ہوگا۔" اس لڑکی نے عقل مندی سے ایسی ایسی طرح ماں کو سمجھایا کہ کچھ اُس کو صبر و قرار آیا۔ تب اپنے محل میں گئی اور چپکی ہو رہی۔ جب رات ہوئی، وزیرزادی نے دادا کو بلایا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پڑی۔ بہت سی منت کی اور رونے لگی اور کہا "میں یہ ارادہ رکھتی ہوں کہ اماں جان کا طعنہ مجھ پر نہ رہے اور میرا باپ مخلصی پاوے۔ جو تو میرا رفیق ہو، تو میں نیشاپور کو چلوں اور اس تاجر کو (جس کے کتے کے گلے میں ایسے لعل ہیں) دیکھ کر، جو بن آوے، کر آؤں، اور اپنے باپ کو چھڑاؤں۔"

پہلے تو اس مرد نے انکار کیا۔ آخر، بہت کہنے سننے سے، راضی ہوا۔ تب وزیرزادی نے فرمایا "چپکے چپکے، اسباب سفر کا درست کر اور جنس تجارت کی، لائق نذر پادشاہوں کے، خرید کر اور غلام نوکر چاکر جتنے ضرور ہوں، ساتھ لے۔ لیکن یہ بات کسو پر نہ کھلے۔" دادا نے قبول کیا اور اس کی تیاری میں لگا۔ جب سب اسباب مہیا کیا، اونٹوں اور خچروں پر بار کر کر، روانہ ہوا۔ اور وزیرزادی بھی، لباس مردانہ پہن کر، ساتھ جا ملی۔ ہرگز کسو کو گھر میں نہ خبر ہوئی۔ جب صبح ہوئی وزیر کے محل میں چرچا ہوا کہ وزیرزادی غائب ہے، معلوم نہیں کیا ہوئی۔

آخر بدنامی کے ڈر سے، ماں نے بیٹی کا گم ہونا چھپایا، اور وزیرزادی نے وہاں اپنا نام سوداگر بچہ رکھا۔ منزل بہ منزل چلتے چلتے نیشاپور میں پہنچی۔ خوشی بہ خوشی کارواں سرا میں جا اتری اور سب اپنا اسباب اُتار اور رات کو رہی۔ فجر کو حمام میں گئی اور پوشاک پاکیزہ جیسے روم کے باشندے پہنتے ہیں، پہنی اور شہر کی سیر کے واسطے نکلی۔ آتے آتے جب چوک میں پہنچی، چوراہے پر کھڑی ہوئی۔ ایک طرف دکان جوہری کی نظر پڑی کہ بہت سے جواہر کا ڈھیر لگ رہا ہے اور غلام لباس فاخرہ پہنے ہوئے دست بستہ کھڑے ہیں اور ایک شخص جو سوداگر ہے

برس پچاس ایک کے اس کی عمر ہے، طالع مندوں کی سی خلعت، اور نیمہ آستین پہنے ہوتے اور کئی مصاحب باوضع، نزدیک اُس کے کرسیوں پر بیٹھے ہیں اور آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔

وہ وزیر زادی (جس نے اپنے تئیں، سوداگر بچہ مشہور کیا تھا) اُسے دیکھ کر متعجب ہوئی اور دل میں سمجھ کر خوش ہوئی کہ "خدا جھوٹ نہ کرے، جس سوداگر کا میرے باپ نے بادشاہ سے مذکور کیا ہے، اغلب ہے کہ یہی ہو۔ بارے خدایا! اُس کا احوال مجھ پر ظاہر کر۔" اتفاقاً ایک طرف جو دیکھا تو ایک دکان ہے، اس میں دو پنجرے آہنی لٹکے ہیں اور اُن دونوں میں دو آدمی قید ہیں۔ اُن کی مجنوں کی سی صورت ہو رہی ہے کہ چرم و استخواں باقی ہے اور سر کے بال اور ناخن بڑھ گئے ہیں۔ سر اوندھائے بیٹھے ہیں اور دو حبشی بدہیئت، مسلح دونوں طرف کھڑے ہیں۔ سوداگر بچے کو اچنبھا آیا۔ لاحول پڑھ کر دوسری طرف جو دیکھا، تو ایک دکان میں تالیچے بچھے ہیں۔ اُن پر ایک چوکی، ہاتھی دانت کی، اس پر گدیلا مخمل کا پڑا ہوا، ایک کتا جواہر کا پٹا گلے میں اور سونے کی زنجیر سے بندھا ہوا بیٹھا ہے اور دو غلام امرد، خوبصورت اس کی خدمت کر رہے ہیں۔ ایک تو مورچھل، جڑاؤ دستے کا، لئے جھلتا ہے، اور دوسرا رومال، تارکشی کا، ہاتھ میں لے کر، منہ اور پاؤں اُس کا پونچھ رہا ہے۔ سوداگر بچے نے خوب غور کر کر جو دیکھا تو پٹے میں کتے کے، بارھوں دانے لعل کے، جیسے سنے تھے، موجود ہیں۔ شکر خدا کا کیا اور فکر میں گیا کہ کس صورت سے اُن لعلوں کو بادشاہ پاس لے جاؤں اور دکھا کر اپنے باپ کو چھڑاؤں؟ یہ تو اس حیرانی میں تھا اور تمام خلقت، چوک اور راستے کی، اُس کا حسن و جمال دیکھ کر حیران تھی اور ہکا بکا ہو رہی تھی۔ سب آدمی آپس میں چرچا یہ کرتے تھے کہ آج تلک، اس صورت و شبیہ کا انسان نظر نہ آیا۔ اُس خواجہ نے بھی دیکھا، ایک غلام کو بھیجا کہ تو جا کر، بمنت اُس سوداگر بچے کو میرے پاس بلا لا۔

وہ غلام آیا اور خواجہ کا پیام لایا، کہ "اگر مہربانی فرمائیے تو ہمارا خداوند، صاحب کا مشتاق ہے۔ چل کر ملاقات کیجئے۔" سوداگر بچہ تو چاہتا ہی تھا بولا "کیا مضائقہ؟" جونہیں خواجہ کے نزدیک آیا اور اس پر خواجہ کی نظر پڑی، ایک برچھی عشق کی سینے میں گڑی۔ تعظیم کی خاطر سرو قد اٹھا لیکن حواس باختہ۔ سوداگر بچے نے دریافت کیا کہ اب یہ دام میں آیا۔ آپس میں بغل گیری ہوئی خواجہ نے سوداگر بچے کی پیشانی کو چوما اور اپنے برابر بٹھایا۔ بہت سا تملق کر کے پوچھا کہ "اپنے نام و نسب سے مجھے آگاہ کرو۔ کہاں سے آنا ہوا اور کہاں کا ارادہ ہے؟" سوداگر بچہ بولا کہ "اس کم ترین کا وطن روم ہے اور قدیم سے استنبول زاد بوم ہے۔ میرے قبلہ گاہ سوداگر ہیں۔ اب

بسبب پیری کے، طاقت سیر و سفر کی نہیں رہی۔ اس واسطے مجھے رخصت کیا ہے کہ کاروبار تجارت کا سیکھوں۔ آج تک ملک میں نے، قدم گھر سے باہر نہ نکالا تھا۔ یہ پہلا ہی سفر درپیش ہوا۔ دریائی راہ ہواؤ نہ پڑا، خشکی کی طرف سے قصد کیا۔ لیکن اس عجم کے ملک میں، آپ کے اخلاق اور خوبیوں کا جو شور ہے، محض صاحب کی ملاقات کی آرزو میں یہاں تک آیا ہوں۔ بارے فضل الٰہی سے، خدمت شریف میں مشرف ہوا، اور اس سے زیادہ پایا۔ تمنا دل کی بر آئی۔ خدا سلامت رکھے۔ اب یہاں سے کوچ کروں گا۔"

یہ سنتے ہی خواجہ کے عقل و ہوش جاتے رہے۔ بولا کہ "اے فرزند! ایسی بات مجھے نہ سناؤ۔ کوئی دن غریب خانے میں کرم فرماؤ۔ بھلا یہ تو بتاؤ کہ تمہارا اسباب اور نوکر چاکر کہاں ہیں؟" سوداگر بچے نے کہا کہ "مسافر کا گھر سرا ہے۔ انہیں وہاں چھوڑ کر میں آپ کے پاس آیا ہوں۔" خواجہ نے کہا کہ "بھٹیار خانے میں رہنا مناسب نہیں۔ میرا اس شہر میں اعتبار ہے اور بڑا نام ہے۔ جلد انہیں بلوا لو۔ میں ایک مکان، تمہارے اسباب کے لئے خالی کر دیتا ہوں۔ جو کچھ جنس لاتے ہو، میں دیکھوں۔ ایسی تدبیر کروں گا کہ یہیں تمہیں بہت سا منافع ملے۔ تم بھی خوش ہو گے اور سفر کے ہرج مرج سے بچو گے اور مجھے بھی چند روز رہنے سے، اپنا احسان مند کرو گے۔" سوداگر بچے نے اوپری دل سے عذر کیا لیکن خواجہ نے پذیرا نہ کیا، اور اپنے گماشتے کو فرمایا کہ باربردار جلد بھیجو، اور کارواں سرا سے ان کا اسباب منگوا کر، فلانے مکان میں رکھواؤ۔

سوداگر بچے نے، ایک زنگی غلام کو، اُن کے ساتھ کر دیا کہ سب مال متاع لدوا کر لے آ، اور آپ شام تک خواجہ کے ساتھ بیٹھا رہا۔ جب گزری کا وقت ہو چکا اور دکان بڑھائی، خواجہ گھر کو چلا۔ تب دونوں غلاموں میں سے، ایک نے کتے کو بغل میں لیا، دوسرے نے کرسی اور قالیچہ اٹھا لیا۔ اور اُن دونوں حبشی غلاموں نے، اُس پنجرے کو، مزدوروں کے سر پہ دھر دیا، اور آپ، پانچوں ہتھیار پہنے، ساتھ ہوئے۔ خواجہ سوداگر بچے کا ہاتھ، ہاتھ میں لئے، باتیں کرتا ہوا، حویلی میں آیا۔

سوداگر بچے نے دیکھا کہ مکان عالی شان، لائق بادشاہوں یا امیروں کے ہے۔ لب نہر، فرش چاندنی کا بچھا ہے اور مسند کے روبرو، اسباب عیش کا چنا ہے۔ کتے کی صندلی بھی، اسی جگہ بچھائی اور خواجہ، سوداگر بچے کو لے کر، بیٹھا۔ بے تکلف، تواضع شراب کی، کی۔ دونوں پینے لگے۔ جب سرخوش ہوئے تب خواجہ نے کھانا مانگا۔ دسترخوان بچھا اور دنیا کی نعمت چنی گئی۔ پہلے ایک لنگری میں، کھانا لے کر، سرپوش طلائی ڈھانپ کر، کتے کے واسطے لے گئے اور ایک دسترخوان

زربفت کا بچھا کر، اس کے آگے دھر دی۔ کتا صندلی سے نیچے اُتر، جتنا چاہا، آتا کھایا اور سونے کی لگن میں پانی پیا۔ پھر چوکی پر جا بیٹھا۔ غلاموں نے رومال سے ہاتھ منہ اُس کا پاک کیا۔ پھر اُس طباق اور لگن کو، غلام پنجرے کے نزدیک لے گئے اور خواجہ سے کنجی مانگ کر، قفل قفس کا کھولا۔

ان دونوں انسانوں کو باہر نکال کر، کئی سونٹے مار کر کتے کا جھوٹا انہیں کھلایا اور وہی پانی پلایا پھر تالا بند کر کر، تالی خواجہ کے حوالے کی۔ جب یہ سب ہو چکا، تب خواجہ نے آپ کھانا شروع کیا۔ سوداگر بچے کو یہ حرکت پسند نہ آئی، گھن کھا کر ہاتھ کھانے میں نہ ڈالا۔ ہر چند خواجہ نے منت کی پر اُس نے انکار ہی کیا۔ تب خواجہ نے سبب پوچھا اُس کا کہ "تم کیوں نہیں کھاتے؟" سوداگر بچے نے کہا "یہ حرکت تمہاری، اپنے تئیں، بدنما معلوم ہوئی۔ اس لئے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور کتا نجس العین ہے۔ پس خدا کے دو بندوں کو کتے کا جھوٹا کھلانا، کس مذہب و ملت میں روا ہے؟ فقط یہ غنیمت نہیں جانتے کہ دے تمہاری قید میں ہیں؟ نہیں تو تم اور وے برابر ہیں۔ اب میرے تئیں شک آئی کہ تم مسلمان نہیں۔ کیا جانوں کون ہو کہ کتے کو پوجتے ہو؟ مجھے تمہارا کھانا کھانا، مکروہ ہے جب تلک یہ شبہ دل سے دور نہ ہو۔"

خواجہ نے کہا "اے بابا! جو کچھ تو کہتا ہے، میں یہ سب سمجھتا ہوں۔ اور اسی خاطر بدنام ہوں کہ اس شہر کی خلقت نے میرا نام خواجہ سگ پرست رکھا ہے۔ اسی طرح پکارتے ہیں اور مشہور کیا ہے۔ لیکن خدا کی لعنت کافروں اور مشرکوں پر ہو جو یہ کلمہ پڑھا اور سوداگر بچے کی خاطر جمع کی۔ تب سوداگر بچے نے پوچھا کہ "اگر مسلمان بہ دل ہو تو اس کا کیا باعث ہے؟ ایسی حرکت کر کے اپنے تئیں بدنام کیا ہے؟" خواجہ نے کہا "اے فرزند! نام میرا بدنام ہے اور دگنا محصول اس شہر میں بھرتا ہوں۔ اسی واسطے کہ یہ بھید کسو پر ظاہر نہ ہو۔ عجب یہ ماجرا ہے کہ جو کوئی سنے، سوائے غم اور غصے کے، اُسے کچھ اور حاصل نہ ہو۔ تو بھی مجھے معاف رکھ کہ نہ مجھ میں قدرت کہنے کی، اور نہ تجھ میں طاقت سننے کی، رہے گی۔" سوداگر بچے نے اپنے دل میں غور کی کہ مجھے اپنے کام سے کام ہے، کیا ضرور ہے جو ناحق میں زیادہ مجوز ہوں؟ بولا "خیر، اگر لائق کہنے کے، نہیں تو نہ کہیے۔" کھانے میں ہاتھ ڈالا، اور نوالہ اٹھا کر کھانے لگا۔ دو مہینے تک اس ہوشیاری اور عقلمندی سے، سوداگر بچے نے خواجہ کے ساتھ گزران کی کہ کسو پر ہرگز نہ کھلا کہ یہ عورت ہے۔ سب یہی جانتے تھے کہ مرد ہے اور خواجہ سے روز بروز ایسی محبت زیادہ ہوئی کہ ایک دم اپنی آنکھوں سے جُدا نہ کرتا۔

ایک دن، عین مے نوشی کی صحبت میں، سوداگر بچے نے رونا شروع کیا۔ خواجہ نے دیکھتے ہی

خاطر داری کی اور رومال سے آنسو پونچھنے لگا اور سبب گریہ کا پوچھا۔ سوداگر بچے نے کہا "اے قبلہ! کیا کہوں کاش کہ تمہاری خدمت میں بندگی پیدا نہ کی ہوتی اور بہ شفقت، جو صاحب میرے حق میں کرتے ہیں نہ کرتے! اب دو مشکلیں میرے پیش آئی ہیں، نہ تمہاری خدمت سے جدا ہونے کو جی چاہتا ہے اور نہ رہنے کا اتفاق یہاں ہو سکتا ہے۔ اب جانا ضرور ہوا، لیکن آپ کی جدائی سے، اُمید زندگی کی نظر نہیں آتی۔"

یہ بات سن کر، خواجہ بے اختیار ایسا رونے لگا کہ ہچکی بندھ گئی اور بولا کہ "اے نورِ چشم! ایسی جلدی، اس اپنے بوڑھے خادم سے سیر ہوئے کہ اسے دل گیر کئے جاتے ہو؟ قصد روانہ ہونے کا دل سے دور کرو۔ جب تلک میری زندگی ہے، رہو۔ تمہاری جدائی سے، ایک دم، میں جیتا نہ رہوں گا۔ بغیر اجل کے مر جاؤں گا۔ اور اس ملک فارس کی آب و ہوا، بہت خوب اور موافق ہے، بہتر تو یوں ہے کہ ایک آدمی معتبر بھیج کر، اپنے والدین کو، مع اسباب، یہیں بلوا لو۔ جو کچھ سوداری اور برداری درکار ہو، میں موجود کروں۔ جب ماں باپ تمہارے اور گھر بار، سب آیا، اپنی خوشی سے کاروبار، تجارت کا، کیا کرو۔ میں نے بھی اس عمر میں، زمانے کی بہت سختیاں کھینچی ہیں اور ملک ملک پھرا ہوں۔ اب بوڑھا ہوا فرزند نہیں رکھتا۔ میں تجھے، بہتر اپنے بیٹے سے، جانتا ہوں اور اپنا دلی عہدہ مختار کرتا ہوں۔ میرے کارخانے سے بھی ہوشیار اور خبردار رہو۔ جب تلک جیتا ہوں ایک ٹکڑا کھانے کو اپنے ہاتھ سے دو۔ جب مر جاؤں، گاڑ داب دیجو۔ اور سب مال و متاع میرا لیجو۔"

تب سوداگر بچے نے جواب دیا کہ "واقعی، صاحب نے زیادہ باپ سے، میری غم خواری اور خاطر داری کی کہ مجھے ماں باپ بھول گئے۔ لیکن اس عاصی کے والد نے ایک سال کی رخصت دی تھی۔ اگر دیر لگاؤں گا، تو وے اس پیری میں، رو رو کے مر جائیں گے۔ پس، رضامندی پدر کی، نوشنودی خدا کی ہے۔ اور اگر وہ مجھ سے ناراضی ہوں گے تو میں ڈرتا ہوں کہ شاید دعائے بد نہ کریں کہ دونوں جہان میں خدا کی رحمت سے محروم رہوں۔ اب آپ کی یہی شفقت ہے کہ بندے کو حکم کیجئے کہ فرمانا قبلہ گاہ، کا بجا لاوے اور حق پدری سے ادا ہووے۔ اور صاحب کی توجہ کا ادائے شکر، جب تلک دم میں دم ہے، میری گردن پر ہے۔ اگر اپنے ملک میں بھی جاؤں گا تو ہر دم دل و جان سے یاد کروں گا۔ خدا مسبب الاسباب ہے، شاید پھر کوئی ایسا سبب ہو کہ قدم بوسی حاصل کروں۔"

غرض، سوداگر بچے نے ایسی ایسی باتیں، لون مرچیں لگا کر خواجہ کو سنائیں کہ وہ بے چارا، لاچار

ہو کر ہونٹ چاٹنے لگا، از بسکہ اُس پر شیفتہ اور فریفتہ ہو رہا تھا کہنے لگا "اچھا، اگر تم نہیں رہتے، تو میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ میں تجھ کو اپنی جان کے برابر جانتا ہوں، پس جب جان چلی جاوے تو خالی بدن کس کام آوے؟ اگر تو اسی میں رضا مند ہے، تو چل اور مجھے بھی لے چل" سوداگر بچے سے یہ کہہ کر اپنی تیاری سفر کی کرنے لگا اور گماشتوں کو حکم دیا کہ باربرداری کی فکر جلدی کرو۔

جب خواجہ کے چلنے کی خبر مشہور ہوئی۔ وہاں کے سوداگروں نے سن کر، سب نے تہیہ سفر کا، کیا۔ خواجہ سگ پرست نے، گنج اور جواہر بے شمار، نوکر اور غلام ان گنت، تحفے اور اسباب شاہانہ بہت سا، ساتھ لے کر شہر کے باہر، تنبو اور قنات اور بے چوبے اور سراپردے اور کنڈلے کھڑے کروا کر، اُن میں داخل ہوا۔ جتنے تجار تھے، اپنی اپنی بساط موافق، مال سوداگری کا لے کر ہمراہ ہوئے برائے خود ایک لشکر ہو گیا۔

ایک دن جوگنی کو پیٹھ دے کر وہاں سے کوچ کیا، ہزاروں اونٹوں پر شلیتے اسباب کے، اور خچروں پر صندوق، نقد جواہر کے لاد کر، پانچ سو غلام، دشت قبچاق اور زنگ و روم کے، مسلح، صاحب شمشیر تازی اور ترکی و عراقی و عربی گھوڑوں پر چڑھ کر چلے۔ سب کے پیچھے، خواجہ اور سوداگر بچہ، خلعت فاخرہ پہنے، سکھپال پر سوار اور ایک تخت بغدادی اونٹ پر کسا، اُس پر کتا مسند پر سویا ہوا اور ان دونوں قیدیوں کے قفس ایک شتر پر لٹکائے ہوئے، روانہ ہوئے۔ جس منزل میں پہنچتے، سب سوداگر خواجہ کی بارگاہ میں آ کر حاضر ہوتے، اور دسترخوان پر کھانا کھاتے اور شراب پیتے۔ خواجہ، سوداگر بچے کے ساتھ ہونے کی خوشی میں، شکر خدا کا کرتا اور کوچ در کوچ چلا جاتا تھا۔ بارے، بہ خیر و عافیت نزدیک قسطنطنیہ کے آ پہنچے، باہر شہر کے مقام کیا۔ سوداگر بچے نے کہا "اے قبلہ! اگر رخصت دیجیے تو میں جا کر، ماں باپ کو دیکھوں، اور مکان صاحب کے واسطے خالی کروں، جب مزاج سامی میں آوے شہر بھی داخل ہوجیے۔"

خواجہ نے کہا "تمہاری خاطر تو میں یہاں آیا۔ اچھا، جلد مل چل کر، میرے پاس آؤ اور اپنے نزدیک میرے اُترنے کو مکان دو۔" سوداگر بچہ رخصت ہو کر اپنے گھر میں آیا۔ سب وزیر کے محل کے آدمی حیران ہوئے کہ یہ مرد کون گھس آیا۔ سوداگر بچہ (یعنی بیٹی وزیر کی) اپنی ماں کے پاؤں پر جا گری اور روئی اور بولی کہ "میں تمہاری جائی ہوں۔" سنتے ہی وزیر کی بیگم، گالیاں دینے لگی کہ "اے ستری! تو بیٹی تو ہو نکلی، اپنا منہ تو نے کالا کیا اور خاندان کو رسوا کیا۔ ہم تو تیری جان کو رو بیٹھ کر، صبر کر کے تجھ سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ جا دفع ہو۔"

تب وزیر زادی نے سر سے پگڑی اتار کر پھینک دی اور بولی "اے اماں جان! میں بُری جگہ نہیں گئی۔ کچھ بدی نہیں کی۔ تمہارے بموجب فرمانے کے، بابا کو قید سے چھڑانے کی خاطر، یہ سب مکر کی۔ الحمدللہ! کہ تمہاری دعا کی برکت سے، اور اللہ کے فضل سے، پورا کام کر کے آئی ہوں کہ نیشاپور سے اُس سوداگر کو معہ کتے (جس کے گلے میں دے لعل پڑے ہیں) اپنے ساتھ لائی ہوں اور تمہاری امانت میں خیانت نہیں کی۔ سفر کے لئے مردانہ لباس کیا ہے۔ اب ایک روز کا کام باقی ہے وہ کر کر، قبلہ گاہ کو بندی خانے سے چھڑاتی ہوں اور اپنے گھر میں آتی ہوں۔ اگر حکم ہو تو پھر جاؤں اور ایک روز باہر رہ، خدمت میں آؤں۔" ماں نے جب خوب معلوم کیا کہ میری بیٹی نے مردوں کا کام کیا اور اپنے تئیں سب طرح سلامت و محفوظ رکھا ہے، خدا کی درگاہ میں ناک گھسنی کی، اور خوش ہو کر بیٹی کو چھاتی سے لگا لیا اور منہ چوما، بلائیں لیں، دعائیں دیں اور رخصت کیا کہ "تو جو مناسب جان سو کر، میری خاطر جمع ہوئی۔"

وزیر زادی پھر سوداگر بچہ بن کر، خواجہ سگ پرست پاس چلی۔ وہاں خواجہ کو جدائی اُس کی، ازبسکہ شاق ہوئی، بے اعتبار ہو کر کوچ کیا۔ اتفاقاً نزدیک شہر کے، ادھر سے سوداگر بچہ جاتا تھا، اور اُدھر سے خواجہ آتا تھا، عین راہ میں ملاقات ہوئی۔ خواجہ نے دیکھتے ہی کہا "بابا! مجھ بوڑھے کو اکیلا چھوڑ کر کہاں گیا تھا؟" سوداگر بچہ بولا "آپ سے اجازت لے کر اپنے گھر گیا تھا۔ آخر ملازمت کے اشتیاق نے وہاں رہنے نہ دیا، آ کر حاضر ہوا۔" شہر کے دروازے پہ دریا کے کنارے، ایک باغ سایہ دار دیکھ کر خیمہ استادہ کیا اور وہیں اُترے۔ خواجہ اور سوداگر بچہ، باہم بیٹھ کر، شراب و کباب پینے لگے۔ جب عصر کا وقت ہوا، سیر تماشے کی خاطر، خیمے سے نکل کر، صندلیوں پہ بیٹھے۔ اتفاقاً، ایک قراول بادشاہی اُدھر آ نکلا۔ ان کا لشکر اور نشست برخاست دیکھ کر، اچنبھے ہو رہا اور دل میں کہا، شاید ایلچی کسو بادشاہ کا آیا ہے۔ کھڑا تماشا دیکھتا تھا۔

خواجہ کے شاطر نے اُس کو آگے بلایا اور پوچھا کہ "تو کون ہے؟" اُس نے کہا "میں بادشاہ کا میر شکار ہوں۔" شاطر نے خواجہ سے اس کا احوال کہا۔ خواجہ نے ایک غلام کافری کو کہا کہ جا کر، بزوار سے کہہ کہ ہم مسافر ہیں۔ اگر جی چاہے تو آؤ، بیٹھو، قہوہ قلیان حاضر ہے۔ جب میر شکار نے نام سوداگر کا سنا، زیادہ متعجب ہوا۔ اور یتیم کے ساتھ خواجہ کی مجلس میں آیا۔ لوازم اور شان و شوکت اور سپاہ و غلام دیکھے، خواجہ اور سوداگر بچے کو سلام کیا اور مرتبہ سگ کا نگاہ کیا۔ خواجہ نے اسے بٹھا کر، قہوے کی ضیافت کی۔ قراول نے نام و نشان خواجہ کا پوچھا۔ جب رخصت مانگی، خواجہ نے کئی تھان اور کچھ

تحفے اسے دے کر اجازت دی۔ صبح کو جب بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا، درباریوں سے خواجہ سوداگر کا ذکر کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ مجھ کو خبر ہوئی۔ میر شکار کو، میں نے روبرو طلب کیا اور سوداگر کا احوال پوچھا۔

اُس نے جو کچھ دیکھا تھا عرض کیا۔ سننے سے، کتے کے تحمل کے، اور دو آدمیوں کے پنجرے میں قید ہونے کے، مجھ کو خفگی آئی۔ میں نے فرمایا "وہ مردود واجب القتل ہے"۔ نسقچیوں کو حکم کیا کہ "جلد جاؤ۔ اُس بے دین کا سر کاٹ لاؤ"۔ قضا کار، وہی ایلچی فرنگ کا دربار میں حاضر تھا، مسکرایا۔ مجھے اور بھی زیادہ غضب ہوا۔ "اے بے ادب! بادشاہوں کے حضور میں، بے سبب دانت کھولنے ادب سے باہر ہے۔ بے محل ہنسنے سے رونا بہتر ہے"۔ اُس نے التماس کیا "جہاں پناہ! کئی باتیں خیال میں گزریں، لہٰذا فدوی متبسم ہوا۔ پہلے یہ کہ وزیر سچا ہے، اب قید خانے سے رہائی پاوے گا۔ دوسرے یہ کہ بادشاہ خون ناحق سے اُس وزیر کے بچے۔ تیسرے یہ کہ قبلۂ عالم نے بے سبب اور بے تقصیر اُس سوداگر کو حکم قتل کا کیا۔ ان حرکتوں سے تعجب آیا کہ بے تحقیق، ایک بے وقوف کے کہنے سے، آپ ہر کسو کو حکم قتل کا کر بیٹھتے ہیں۔ خدا جانے فی الحقیقت اس خواجہ کا احوال کیا ہے! اُسے حضور میں طلب کیجئے اور اس کی واردات پوچھیے۔ اگر تقصیر دار ٹھہرے، تب مختار ہو جو مرضی میں آوے، اُس سے سلوک کیجئے"۔

جب ایلچی نے اس طرح سے سمجھایا، مجھے بھی وزیر کا کہنا یاد آیا۔ فرمایا "سوداگر کو، اس کے بیٹے کے ساتھ، اور وہ سگ اور قفس حاضر کرو"۔ تورچی، اُس کے بلانے کو دوڑائے۔ ایک دم میں سب کو حضور میں لے آئے۔ روبرو طلب کیا۔ پہلے خواجہ اور اُس کا پسر آیا، دونوں لباس فاخرہ پہنے ہوئے۔ سوداگر بچے کا جمال دیکھنے سے، سب ادنیٰ اعلیٰ، حیران اور بھیچک ہوئے۔ ایک خوان طلائی، جواہر سے بھرا ہوا کہ ہر ایک رقم کی چھوٹ نے، سارے مکان کو روشن کر دیا) سوداگر بچہ ہاتھ میں لئے آیا اور میرے تخت کے آگے نچھاور کیا۔ آداب کورنشات بجا لا کر کھڑا ہوا، خواجہ نے بھی زمین چومی اور دعا کرنے لگا۔ میں نے اُس کی لیاقت کو بہت پسند کیا، لیکن عتاب کی رو سے کہا "اے شیطان، آدمی کی صورت! تو نے یہ کیا جال پھیلایا ہے اور اپنی راہ میں کنواں کھودا ہے؟ تیرا دین کیا ہے اور یہ کون آئین ہے؟ کس پیغمبر کی اُمت ہے؟ اگر کافر ہے تو یہ کیسی مت ہے، اور تیرا کیا نام ہے کہ تیرا یہ کام ہے؟"

اُس نے کہا "قبلۂ عالم کی عمر و دولت بڑھتی رہے! غلام کا دین یہ ہے کہ خدا واحد ہے، اُس کا کوئی شریک نہیں اور محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کلمہ پڑھتا ہوں، اور اس کے بعد بارہ امام

کو اپنا پیشوا جانتا ہوں۔ اور آئین میری یہ ہے کہ پانچوں وقت کی نماز پڑھتا ہوں، اور حج بھی کر آیا ہوں اور اپنے مال سے خمس زکوٰۃ دیتا ہوں اور مسلمان کہاتا ہوں۔ لیکن ظاہر میں، یہ سارے عیب جو مجھ میں بھرے ہیں جن کے سبب آپ ناخوش ہوئے ہیں اور تمام خلق اللہ میں بدنام ہو رہا ہوں، اس کا ایک باعث ہے کہ ظاہر نہیں کر سکتا۔ ہر چند سگ پرست مشہور ہوں اور مضاعف محصول دیتا ہوں یہ سب قبول کیا ہے، پر دل کا بھید کسو سے نہیں کہا۔" اس بہانے سے میرا غصہ زیادہ ہوا اور کہا "مجھے تو باتوں میں پھسلاتا ہے؟ میں نہیں ماننے کا، جب تلک اس اپنی گمراہی کی دلیل معقول، عرض نہ کرے کہ میرے دل نشین ہو، تب تو جان سے بچے گا، نہیں تو، اس کے قصاص میں، تیرا پیٹ چاک کراؤں گا، تو سب کو عبرت ہو کہ بار دیگر کوئی دین محمدی میں رخنہ نہ کرے۔"

خواجہ نے کہا "اے بادشاہ! مجھ کم بخت کے خون سے درگزر کر، اور جتنا مال میرا ہے کہ گنتی اور شمار سے باہر ہے، سب کو لے اور مجھے اور میرے بیٹے کو، اپنے تخت کے تصدق کر کر، چھوڑ دے اور جان بخشی کر۔" میں نے تبسم کر کے کہا "اے بے وقوف! اپنے مال کی طمع مجھے دکھاتا ہے؟ سوائے سچ بولنے کے اب تیری مخلصی نہیں۔" یہ سنتے ہی خواجہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگے، اور بیٹے کی طرف دیکھ کر ایک آہ بھری اور بولا "میں تو بادشاہ کے روبرو گنہگار ٹھہرا، مارا جاؤں گا، اب کیا کروں؟ تجھے کس کو سونپوں؟" میں نے ڈانٹا کہ "اے مکار! بس اب، عذر بہت کئے۔ جو کہنا ہے جلد کہہ۔"

تب تو اُس مرد نے قدم بڑھا کر، تخت کے پاس آکر، پائے کو بوسہ دیا اور صفت و ثنا کرنے لگا اور بولا "اے شہنشاہ! اگر حکم قتل کا میرے حق میں نہ ہوتا تو یہ سب باتیں سہتا اور اپنا ماجرا نہ کہتا۔ لیکن جان سب سے زیادہ عزیز ہے، کوئی آپ سے کنوئیں میں نہیں گرتا۔ پس جان کی محافظت واجب ہے اور ترک واجب کا، خلاف حکم خدا کے ہے۔ خیر، جو مرضی مبارک یہی ہے تو سرگزشت اس بے بضاعت کی سنیے۔ پہلے حکم ہو کہ وہ دونوں قفس، جن میں دو آدمی قید ہیں، حضور میں لا کر رکھیں۔ میں اپنا احوال کہتا ہوں، اگر کہیں جھوٹ کہوں تو اُن سے پوچھ کر مجھے قائل کیجیے اور انصاف فرمائیے۔" مجھے یہ بات اس کی بہت پسند آئی۔ پنجروں کو منگوا کر، ان دونوں کو نکلوا کر خواجہ کے پاس کھڑا کیا۔

خواجہ نے کہا "اے بادشاہ! یہ مرد جو داہنی طرف ہے، غلام کا بڑا بھائی ہے، اور جو بائیں کو کھڑا ہے منجھلا برادر ہے۔ میں ان دونوں سے چھوٹا ہوں۔ میرا باپ ملک فارس میں سوداگر تھا۔ جب میں چودہ برس کا ہوا، قبلہ گاہ نے رحلت کی۔ جب تجہیز و تکفین سے فراغت ہوئی اور پھول

اُٹھ چکے، ایک روز ان دونوں بھائیوں نے مجھے کہا کہ "اب باپ کا مال جو کچھ ہے تقسیم کر لیں، جس کا دل جو چاہے سو کام کرے"۔ میں نے سن کر کہا "اے بھائیو! یہ کیا بات ہے؟ میں تمہارا غلام ہوں۔ بھائی چاری کا دعویٰ نہیں رکھتا۔ ایک باپ مر گیا، تم دونوں میرے پدر کی جگہ میرے سر پر قائم ہو۔ ایک نان خشک چاہتا ہوں جس میں زندگی بسر کروں اور تمہاری خدمت میں حاضر رہوں۔ مجھے حصّے بخرے سے کیا کام ہے؟ تمہارے آگے کے جھوٹے سے اپنا پیٹ بھر لوں گا اور تمہارے پاس رہوں گا۔ میں لڑکا ہوں، کچھ پڑھا لکھا بھی نہیں، مجھ سے کیا ہو سکے گا؟ ابھی تم مجھے تربیت کرو"۔

"یہ سن کر جواب دیا کہ "تو چاہتا ہے کہ اپنے ساتھ ہمیں بھی خراب اور محتاج کرے؟" میں چپکا ایک گوشے میں جا کر رونے لگا، پھر دل کو سمجھایا کہ بھائی آخر بزرگ ہیں، میری تعلیم کی خاطر چشم نمائی کرتے ہیں کہ کچھ سیکھے۔ اسی فکر میں سو گیا۔ صبح کو ایک پیادہ قاضی کا آیا اور مجھے دار الشرع میں لے گیا۔ وہاں دیکھا تو یہی دونوں بھائی حاضر ہیں۔ قاضی نے کہا "کیوں اپنے باپ کا ورثہ بانٹ چونٹ نہیں لیتا؟" میں نے گھر میں جو کہا تھا، وہاں بھی جواب دیا۔ بھائیوں نے کہا "اگر یہ بات اپنے دل سے کہتا ہے تو ہمیں لا دعویٰ لکھ دے کہ باپ کے مال و اسباب سے مجھے کچھ علاقہ نہیں"۔ تب بھی میں نے یہی سمجھا کہ یہ دونوں میرے بزرگ ہیں، میری نصیحت کے واسطے کہتے ہیں کہ باپ کا مال لے کر بے جا تصرف نہ کرے۔ بہ موجب ان کی مرضی کے، تاریخ خطی بہ مُہر قاضی، میں نے لکھ دی۔ یہ راضی ہوئے، میں گھر میں آیا۔

"دوسرے دن مجھ سے کہنے لگے "اے بھائی! یہ مکان جس میں تو رہتا ہے، ہمیں درکار ہے۔ تو اپنی بود و باش کی خاطر، اور جگہ لے کر جا رہ"۔ تب میں نے دریافت کیا کہ یہ باپ کی حویلی میں بھی رہنے سے خوش نہیں، لاچار ارادہ اُٹھ جانے کا کیا۔ جہاں پناہ! جب میرا باپ جیتا تھا تو جس وقت سفر سے آتا، ہر ایک ملک کا تحفہ بہ طریق سوغات کے لاتا اور مجھے دیتا، اس واسطے کہ چھوٹے بیٹے کو ہر کوئی زیادہ پیار کرتا ہے۔ میں نے اُن کو بیچ بیچ کر، تھوڑی سی اپنی پونجی بہم پہنچائی تھی، اُسی سے کچھ خرید و فروخت کرتا۔ ایک بار لونڈی، میری خاطر، ترکستان سے میرا باپ لایا اور ایک دفعہ گھوڑے لے کر آیا۔ اُن میں سے ایک بچھڑا ناکند کہ ہونہار تھا، وہ بھی مجھے دیا۔ میں اپنے پاس سے دانہ گھاس اُس کا کرتا تھا۔

"آخر ان کی بے مروتی دیکھ کر ایک حویلی خرید کی، وہاں جا رہا۔ یہ کتا بھی میرے ساتھ چلا آیا واسطے ضروریات کے اسباب خانہ داری کا، جمع کیا اور دو غلام خدمت کی خاطر مول لئے اور باقی

پونجی سے، ایک دکان بزازی کی، کر کے خدا کے توکل پر بیٹھا۔ اپنی قسمت پر راضی تھا اگرچہ بھائیوں نے بدخلقی کی۔ پر خدا جو مہربان ہوا، تین برس کے عرصے میں ایسی دکان جمی کہ میں صاحبِ اعتبار ہوا سب سرکاروں میں جو تحفہ چاہتا، میری ہی دکان سے جاتا۔ اُس میں، بہت سے روپے کماتے اور نہایت فراغت سے گزرنے لگی۔ ہر دم، جناب باری میں شکرانہ کرتا اور آرام سے رہتا۔ یہ کبت اکثر اپنے احوال پر پڑھتا:

روٹھے کیوں نہ راجا؟ واتیں کچھو نہیں کاجا۔
ایک تو سے مہاراجا، اور کون کو سراہیے؟
روٹھے کیوں نہ بھائی؟ واتیں کچھو نہ بسائی۔
ایک تو ہی ہے سہائی، اور کون پاس جائیے؟
روٹھے کیوں نہ متر، ششترو؟ آٹھوں جام ایک۔
راؤ رے، چرن کے نیہ کو نبھائیے
سنسار ہے روٹھا، ایک تو ہے انوٹھا۔
سب جو میں گے انگوٹھا، ایک تو نہ روٹھا چاہیے!

"اتفاقاً جمعے کے روز میں اپنے گھر بیٹھا تھا کہ ایک غلام میرا، سودے سلف کو بازار گیا تھا، بعد ایک دم کے روتا ہوا آیا۔ میں نے سبب پوچھا کہ 'تجھے کیا ہوا؟' خفا ہو کر بولا کہ 'تمہیں کیا کام ہے؟ تم خوشی مناؤ۔ لیکن قیامت میں کیا جواب دو گے؟' میں نے کہا 'اے حبشی! ایسی کیا بلا تجھ پر نازل ہوئی؟' اُس نے کہا 'یہ غضب ہے کہ تمہارے بڑے بھائیوں کی، چوک کے چوراہے میں، ایک یہودی نے مشکیں باندھی ہیں، اور قمچیاں مارتا ہے اور ہنستا ہے کہ اگر میرا روپیہ نہ دو گے تو مارتے مارتے مار ہی ڈالوں گا بھلا مجھے ثواب تو ہوگا! پس تمہارے بھائیوں کی یہ نوبت اور تم بے فکر ہو۔ یہ بات اچھی ہے؟ لوگ کیا کہیں گے؟' یہ بات غلام سے سنتے ہی، لہو نے جوش کیا۔ ننگے پاؤں بازار کی طرف دوڑا اور غلاموں کو کہا 'جلد روپے لے کر آؤ'؛ جونہی وہاں گیا، دیکھا تو جو کچھ غلام نے کہا تھا سچ ہے۔ اُن پر مار پڑ رہی ہے۔ حاکم کے پیادوں کو کہا 'واسطے خدا کے ذرا ٹھہر جاؤ'، میں یہودی سے پوچھوں کہ ایسی کیا تقصیر کی ہے جس کے بدلے یہ تعزیر کی ہے؟

"یہ کہہ کر میں یہودی کے نزدیک گیا اور کہا 'آج روز آدینہ ہے، ان کو کیوں ضرب شلاق کر رہا ہے؟' اُس نے جواب دیا 'اگر حمایت کرتے ہو تو پوری کرو۔ اُن کے عوض روپے حوالے کرو،

نہیں تو اپنے گھر کی راہ لو۔ میں نے کہا، "کیسے روپے؟ دستاویز نکال، میں روپے گن دیتا ہوں۔" اُس نے کہا "دستک حاکم کے پاس دے آیا ہوں۔" اس میں، میرے دونوں غلام، دو بدرے روپے لے کر آئے ہزار روپے میں نے یہودی کو دیئے اور بھائیوں کو چھڑایا۔ ان کی یہ صورت ہو رہی تھی کہ بدن سے ننگے اور بھوکے پیاسے۔ اپنے ہمراہ گھر میں لایا۔ دو نہیں حمام میں نہلوایا، نئی پوشاک پہنائی، کھانا کھلایا۔ ہرگز ان سے یہ نہ کہا کہ "اتنا مال باپ کا، تم نے کیا کیا؟" شاید شرمندہ ہوں۔ اے بادشاہ! یہ دونوں موجود ہیں، پوچھیے کہ سچ کہتا ہوں یا کوئی بات جھوٹ بھی ہے؟ خیر، جب کئی دن میں، مار کی کوفت سے بحال ہوئے، ایک روز میں نے کہا کہ "اے بھائیو! اب اس شہر میں تم بے اعتبار ہو گئے ہو۔ بہتر یہ ہے کہ چند روز سفر کرو۔" یہ سن کر چپ ہو رہے۔ میں نے معلوم کیا کہ راضی ہیں، سفر کی تیاری کرنے لگا۔ بال پرتل، باربرداری اور سواری کی فکر کر کے، بیس ہزار روپے کی جنس تجارت کی، خرید کی۔ ایک قافلہ سوداگروں کا بخارے کو جاتا تھا، ان کے ساتھ کر دیا۔

"بعد ایک سال کے وہ کارواں پھر آیا۔ ان کی خیر خبر کچھ نہ پائی۔ آخر ایک آشنا سے قسمیں دے کر پوچھا۔ اُس نے کہا "جب بخارے میں گئے، ایک نے جوئے خانے میں اپنا تمام مال ہار دیا۔ اب وہاں کی جاروب کشی کرتا ہے اور پھڑ کو لیپتا پوتتا ہے۔ جواری جو جمع ہوتے ہیں اُن کی خدمت کرتا ہے۔ وہ، بہ طریق خیرات کے، کچھ دیتے ہیں۔ وہاں گرگا بنا پڑا رہتا ہے اور دوسرا" بوزہ فروش کی لڑکی پر عاشق ہوا، اپنا مال سارا صرف کیا۔ اب وہ بوزہ خانے کی ٹہل کیا کرتا ہے۔ قافلے کے آدمی اس لیے نہیں کہتے کہ تو شرمندہ ہوگا۔"

"یہ احوال، اُس شخص سے سن کر، میری عجیب حالت ہوئی، مارے فکر کے نیند بھوک جاتی رہی زادِ راہ لے کر، قصد بخارے کا کیا۔ جب وہاں پہنچا دونوں کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنے مکان میں لایا۔ غسل کروا کر نئی پوشاک پہنائی۔ اور ان کی خجالت کے ڈر سے، ایک بات منہ پر نہ رکھی۔ پھر مال سوداگری کا ان کے واسطے خریدا اور ارادہ گھر کا کیا۔ جب نزدیک نیشاپور کے آیا، ایک گاؤں میں بہ معہ مال اسباب، ان کو چھوڑ کر گھر میں آیا۔ اس لیے کہ میرے آنے کی کسو کو خبر نہ ہو بعد دو دن کے مشہور کیا کہ میرے بھائی سفر سے آئے ہیں، کل ان کے استقبال کی خاطر جاؤں گا۔ صبح کو چاہا کہ جاؤں، ایک گرہست اُس موضع کا میرے پاس آیا اور فریاد کرنے لگا۔ میں اُس کی آواز سُن کر باہر آیا، اُسے روتا دیکھ کر پوچھا کہ "کیوں زاری کرتا ہے؟" وہ بولا "تمہارے بھائیوں کے سبب سے ہمارے گھر لوٹے گئے، کاش کہ اُن کو تم، وہاں نہ چھوڑ آتے!"

"میں نے پوچھا کیا مصیبت گزری؟ بولا کہ رات کو ڈاکہ آیا، اُن کا مال و اسباب لوٹا اور ہمارے گھر بھی لوٹ لے گئے؛ میں نے افسوس کیا اور پوچھا کہ اب دے دونوں، کہاں ہیں؟ کہا شہر کے باہر ننگے منگے، خراب خستہ، بیٹھے ہیں؛ دو نہیں دو جوڑے کپڑوں کے ساتھ لے کر گیا۔ پہنا کر گھر میں لایا۔ لوگ سن کر ان کے دیکھنے کو آتے تھے۔ اور یہ مارے شرمندگی کے باہر نہ نکلتے تھے۔ تین مہینے اسی طرح گزرے، تب میں نے اپنے دل میں غور کی کہ کب تلک یہ کونے میں دبکے بیٹھے رہیں گے؟ بنے تو، ان کو اپنے ساتھ سفر میں لے جاؤں۔

"بھائیوں سے کہا اگر فرمائیے تو یہ فدوی آپ کے ساتھ چلے؛ یہ خاموش رہے۔ پھر لوازمہ سفر کا، اور جنس سوداگری کی تیار کر کے چلا اور ان کو ساتھ لیا۔ جس وقت، مال کی زکوٰۃ دے کر، اسباب کشتی پر چڑھایا اور لنگر اٹھایا، ناؤ چلی۔ یہ کنارے پر سو رہا تھا۔ جب چونکا اور جہاز کو مانجھدار میں دیکھا، حیران ہو کر بھونکا۔ اور دریا میں کود پڑا اور پیرنے لگا۔ میں نے ایک بینوئی دوڑا دی۔ بارے، سگ کو لے کر کشتی میں پہنچایا۔ ایک مہینہ خیر و عافیت سے دریا میں گزرا۔ کہیں منجھلا بھائی میری لونڈی پر عاشق ہوا۔ ایک دن بڑے بھائی سے کہنے لگا کہ چھوٹے بھائی کی منت اٹھانے سے بڑی شرمندگی حاصل ہوئی، اس کا تدارک کیا کریں؟ بڑے نے جواب دیا کہ ایک صلاح دل میں ٹھہرائی ہے، اگر بن آوے تو بڑی بات ہے؛ آخر دونوں نے مصلحت کر کے تجویز کی کہ اسے مار ڈالیں اور سارے مال اسباب کے قابض، متصرف ہوں۔

"ایک دن، میں جہاز کی کوٹھڑی میں سوتا تھا اور لونڈی پاؤں داب رہی تھی کہ منجھلا بھائی آیا اور جلدی سے مجھے جگایا۔ میں ہڑبڑا کر چونکا اور باہر نکلا۔ یہ کتا میرے ساتھ ہو لیا۔ دیکھوں تو بڑا بھائی جہاز کی باڑ پر ہاتھ ٹیکے، نہوڑا ہوا، تماشا دریا کا، دیکھ رہا ہے اور مجھے پکار رہا ہے۔ میں نے پاس جا کر کہا خیر تو ہے؟ بولا عجب طرح کا تماشا ہو رہا ہے کہ دریائی آدمی، موتی کی سیپیاں اور مونگے کے درخت، ہاتھ میں لئے ہوئے ناچتے ہیں؛ اگر اور کوئی ایسی بات، خلاف قیاس، کہتا تو میں نہ مانتا۔ بڑے بھائی کے کہنے کو راست جانا۔ دیکھنے کو سر جھکایا۔ ہر چند نگاہ کی، کچھ نظر نہ آیا، اور وہ یہی کہتا رہا اب دیکھا؟ لیکن کچھ ہو تو دیکھوں۔ اس میں مجھے غافل پا کر، منجھلے نے اچانک پیچھے آ کر ایسا دھکیلا کہ بے اختیار پانی میں گر پڑا، اور وہ رد نے دھونے لگے کہ دوڑیو، ہمارا بھائی دریا میں ڈوبا۔

"اتنے میں ناؤ بڑھ گئی۔ اور دریا کی لہر مجھے کہیں سے کہیں لے گئی۔ غوطے پر غوطے کھاتا تھا، اور

موجوں میں چلا جاتا تھا۔ آخر تھک گیا۔ خدا کو یاد کرتا تھا، کچھ بس نہ چلتا تھا۔ ایک بارگی کسو چیز پر ہاتھ پڑا آنکھ کھول کر دیکھا تو یہی کتا ہے۔ شاید جس دم مجھے دریا میں ڈالا، میرے ساتھ یہ بھی کودا، اور پیرتا ہوا میرے ساتھ لپٹا چلا جاتا تھا۔ میں نے اُس کی دُم پکڑ لی۔ اللہ نے اُس کو میری زندگی کا سبب کیا۔ سات دن اور رات، یہی صورت گزری۔ آٹھویں دن کنارے جا لگے۔ طاقت مطلق نہ تھی۔ لیٹے لیٹے، کروٹیں کھا کر، جوں توں، اپنے تئیں خشکی میں ڈالا۔ ایک دن بے ہوش پڑا تھا، دوسرے دن کتے کی آواز کان میں گئی۔ ہوش میں آیا۔ خدا کا شکر بجا لایا۔ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دور سے، سواد شہر کا، نظر آیا لیکن قوت کہاں کہ ارادہ کروں؟ لاچار دو قدم چلتا، پھر بیٹھتا۔ اسی حالت سے شام تک، کوس بھر راہ کاٹی۔

"بیچ میں ایک پہاڑ ملا۔ رات کو وہاں گر رہا۔ صبح کو شہر میں داخل ہوا۔ جب بازار میں گیا نان بائی اور حلوائیوں کی دکانیں نظر آئیں۔ دل ترسنے لگا، نہ پاس پیسہ جو خرید کروں، نہ جی چاہے کہ مفت مانگوں۔ اسی طرح اپنے دل کو تسلی دیتا ہوا کہ اگلی دکان سے لوں گا، چلا جاتا تھا۔ آخر طاقت نہ رہی اور پیٹ میں آگ لگی، نزدیک تھا کہ روح بدن سے نکلے، ناگاہ، دو جوان کو دیکھا کہ لباس عجم کا پہنے، اور ہاتھ پکڑے، چلے آتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر خوش ہوا کہ یہ اپنے ملک کے انسان ہیں، شاید آشنا صورت ہوں۔ ان سے اپنا احوال کہوں گا۔ جب نزدیک آئے تو میرے دونوں برادر حقیقی تھے۔ دیکھ کر نپٹ شاد ہوا۔ شکر خدا کا کیا کہ خدا نے آبرو رکھ لی۔ غیر کے آگے ہاتھ نہ پسارا۔ نزدیک جا کر سلام کیا بڑے بھائی کا ہاتھ چوما۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی غل و شور کیا۔ منجھلے بھائی نے طمانچہ مارا کہ میں لڑکھڑا کر گر پڑا۔ بڑے بھائی کا دامن پکڑا کہ شاید یہ حمایت کرے گا، اس نے لات ماری۔

"غرض دونوں نے مجھے خوب خورد خام کیا، اور حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کا سا کام کیا۔ ہر چند میں نے خدا کے واسطے دیئے اور گھگھیایا، ہرگز رحم نہ کھایا۔ ایک خلقت اکٹھی ہوئی۔ سب نے پوچھا "اس کا کیا گناہ ہے؟" تب بھائیوں نے کہا "یہ حرام زادہ، ہمارے بھائی کا نوکر تھا۔ سو اُس کو دریا میں ڈال دیا، اور مال اسباب سب لے لیا۔ ہم مدت سے تلاش میں تھے، آج اس صورت سے نظر آیا۔" اور مجھ سے پوچھتے تھے کہ "اے ظالم! یہ کیا تیرے دل میں آیا کہ ہمارے بھائی کو مار کھپایا! کیا اس نے تیری تقصیر کی تھی؟ اُس نے تجھ سے کیا بُرا سلوک کیا تھا کہ اپنا مختار بنایا تھا؟" پھر ان دونوں نے اپنے گریبان چاک کر ڈالے، اور بے اختیار جھوٹ موٹ بھائی کی خاطر روتے تھے اور لاتیں مکی مجھ پر کرتے تھے۔

"اس میں حاکم کے پیادے آئے، ان کو ڈانٹا کہ کیوں مارتے ہو؟ اور میرا ہاتھ پکڑ کر کوتوال کے پاس لے گئے۔ یہ دونوں بھی ساتھ چلے اور حاکم سے بھی یہی کہا اور بطور رشوت کے کچھ دے کر اپنا انصاف چاہا، اور خون ناحق کا دعویٰ کیا۔ حاکم نے مجھ سے پوچھا۔ میری یہ حالت تھی کہ مارے بھوک اور مار پیٹ کے طاقت گویائی کی نہ تھی۔ سر نیچے کئے کھڑا تھا، کچھ منہ سے جواب نہ نکلا۔ حاکم کو بھی یقین ہوا کہ یہ مقرر خونی ہے۔ فرمایا اسے میدان میں لے جا کر سولی دو۔ جہاں پناہ! میں نے روپے دے کر ان کو مہو دی کی قید سے چھڑایا تھا۔ اس کے عوض انہوں نے بھی روپے خرچ کر کے میری جان کا قصد کیا۔ یہ دونوں حاضر ہیں۔ ان سے پوچھیے، میں اس میں سر مو تفاوت کہتا ہوں؟ خیر مجھے لے گئے۔ جب دار کو دیکھا، ہاتھ زندگی سے دھوئے۔

"سوائے اس کتے کے، کوئی میرا رونے والا نہ تھا۔ اس کی یہ حالت تھی کہ ہر ایک آدمی کے پاؤں میں لوٹتا اور چلاتا تھا۔ کوئی لکڑی، کوئی پتھر سے مارتا لیکن یہ اس جگہ سے نہ سرکتا اور میں رو بہ قبلہ کھڑا ہو، خدا کو کہتا تھا کہ اس وقت میں، تیری ذات کے سوا، میرا کوئی نہیں جو آڑے آوے اور بے گناہ کو بچا دے۔ اب تو ہی بچا دے تو بچتا ہوں۔ یہ کہہ کر، کلمہ شہادت کا پڑھ کر، تیور اکڑ گر پڑا۔ خدا کی حکمت سے، اس شہر کے بادشاہ کو قولنج کی بیماری ہوئی۔ امرا اور حکیم جی جمع ہوئے۔ جو علاج کرتے تھے، فائدہ نہ ہوتا تھا۔ ایک بزرگ نے کہا کہ سب سے بہتر یہ دوا ہے کہ محتاجوں کو کچھ خیرات کرو اور بندی والوں کو آزاد کرو۔ دوا سے، دعا میں بڑا اثر ہے۔ وہ نہیں بادشاہی چیلے پنڈت خانوں کی طرف دوڑے۔

"اتفاقاً ایک اس میدان میں آ نکلا۔ ازدحام دیکھ کر معلوم کیا کہ کسو کو سولی چڑھاتے ہیں۔ یہ سنتے ہی، گھوڑے کو دار کے نزدیک لا کر، تلوار سے طنابیں کاٹ دیں۔ حاکم کے پیادوں کو ڈانٹا اور تنبیہہ کی کہ ایسے وقت میں کہ بادشاہ کی یہ حالت ہے، تم خدا کے بندے کو قتل کرتے ہو؟ اور مجھے چھڑا دیا۔ تب یہ دونوں بھائی، پھر حاکم کے پاس گئے، اور میرے قتل کے واسطے کہا۔ شحنہ نے تو رشوت کھائی تھی، جو یہ کہتے تھے سو کرتا تھا۔

"کوتوال نے ان سے کہا کہ خاطر جمع رکھو۔ اب میں اسے ایسا قید کرتا ہوں کہ آپ سے، آپ، مارے بھوکوں کے، بے آب و دانہ مر جاوے۔ کسو کو خبر نہ ہووے؛ مجھے پکڑ لائے اور ایک گوشے میں رکھا۔ اس شہر سے باہر، کوس ایک پر، ایک پہاڑ تھا کہ حضرت سلیمان کے وقت میں، دیووں نے ایک کنواں، تنگ و تاریک، اس میں کھودا تھا۔ اس کا نام زندان سلیمان کہتے تھے۔ جس پر بڑا

غضب بادشاہی ہوتا، اُسے وہاں محبوس کرتے۔ وہ خود بخود مر جاتا۔ القصّہ رات کو، چپکے، یہ دونوں بھائی اور کوتوال کے ڈنڈیئے، مجھے اُس پہاڑ پر لے گئے اور اس غار میں ڈال کر، اپنی خاطر جمع کر کے پھرے۔ اے بادشاہ! یہ کتا میرے ساتھ چلا گیا۔ جب مجھے کنویں میں گرایا، تب یہ اُس کی مینڈ پر لیٹ رہا۔ میں اندر بے ہوش پڑا تھا۔ ذرا سرت آئی تو میں اپنے تئیں مردہ خیال کیا اور اُس مکان کو گور سمجھا۔ اس میں دو شخصوں کی آواز کان میں پڑی کہ کچھ آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ یہی معلوم کیا کہ نکیر منکر ہیں، تجھ سے سوال کرنے آئے ہیں۔ سرسراہٹ رسی کی سنی، جیسے کسو نے وہاں لٹکائی میں حیرت میں تھا، زمین کو ٹٹولتا تو ہڈیاں ہاتھ میں آئیں۔

"بعد ایک ساعت کے، آواز چپڑ چپڑ منہ چلانے کی، میرے کان میں آئی، جیسے کوئی کچھ کھاتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ اے خدا کے بندو! تم کون ہو؟ خدا کے واسطے بتاؤ۔ وہ ہنسے اور بولے دیر زندان مہتر سلیمان کا ہے اور ہم قیدی ہیں۔ میں نے اُن سے پوچھا کیا میں جیتا ہوں؟ پھر کھلکھلا کر ہنسے اور بولے اب تک تو تُو زندہ ہے، پر اب مرے گا۔ میں نے کہا تم کھاتے ہو کیا ہو جو مجھے بھی تھوڑا سا دو؟ تب جھنجھلا کر خالی جواب دیا اور کچھ نہ دیا۔ وہ کھا پی کر سو رہے۔ میں، مارے ضعف و ناتوانی کے، غش میں پڑا رہتا تھا اور خدا کو یاد کرتا تھا۔ قبلۂ عالم! سات دن دریا میں اور اتنے دن، بھائیوں کے بہتان کے سبب، دانہ نہ میسّر آیا۔ علاوہ، کھانے کے بدلے مار پیٹ کھائی اور ایسے زندان میں پھنسا کہ صورت رہائی کی مطلق خیال میں بھی نہ آتی تھی۔

"آخر جان کندنی کی نوبت پہنچی۔ کبھو دم آتا، کبھو نکل جاتا تھا۔ لیکن کبھو کبھو، آدھی رات کو، ایک شخص آتا اور رومال میں روٹیاں اور صراحی پانی کی، ڈوری میں باندھ لٹکا دیتا اور پکارتا۔ وہ دونوں آدمی جو میرے پاس محبوس تھے، لے لیتے اور کھاتے پیتے۔ اُوپر سے کتنے، ہمیشہ یہ احوال دیکھتے دیکھتے، عقل دوڑائی کہ جس طرح یہ شخص آب و نان کنویں میں لٹکا دیتا ہے، تو بھی ایسی فکر کر کہ کچھ اس بے کس کو، جو میرا خاوند ہے، آذوقہ پہنچے تو اس کا دم بچے۔ یہ خیال کر کے شہر میں گیا، نانبائی کی دکان میں منبر پر، گُردے چنے ہوئے دھرے تھے۔ جست مار کر ایک کلیجہ منہ میں لیا اور بھاگا۔ لوگ پیچھے دوڑے، ڈھیلے مارتے تھے لیکن اُس نے نان کو نہ چھوڑا۔ آدمی تھک کر پھرے۔ شہر کے کتے پیچھے لگے۔ ان سے لڑتا بھڑتا، روٹی کو بچائے اُس چاہ پر آیا اور نان کو اندر ڈال دیا۔ روشن تھا، میں نے روٹی کو اپنے پاس پڑا دیکھا اور کتے کی آواز سنی۔ کلیجے کو اٹھا لیا اور یہ کتا روٹی پھینک کر پانی کی تلاش میں گیا۔

"کسی گاؤں کے کنارے ایک بڑھیا کی جھونپڑی تھی۔ پتھلیا اور بدھنا، پانی سے بھرا ہوا دھرا تھا اور وہ پیرزن چرخا کاتتی تھی۔ کتا کوزے کے نزدیک گیا، چاہا کہ لوٹے کو اٹھا دے۔ عورت نے ڈانٹا۔ لوٹا اس کے منہ سے چھوٹا، گھڑے پر گرا۔ مٹکا پھوٹا۔ باقی باسن لڑھ گئے، پانی بہہ چلا۔ بڑھیا لکڑی لے کر مارنے کو اٹھی۔ یہ سگ اس کے دامن میں لپٹ گیا، اس کے پاؤں پہ منہ ملنے اور دم ہلانے لگا۔ اور پہاڑ کی طرف دوڑ گیا۔ پھر اس کے پاس آکر، کبھو رسی اٹھاتا، کبھو ڈول منہ میں پکڑ کر دکھاتا، اور منہ اس کے قدموں پہ رگڑتا، اور آنچل چادر کا پکڑ کر کھینچتا۔ خدا نے اس عورت کے دل میں رحم دیا کہ ڈول رسی کو لے کر، اس کے ہمراہ چلی۔ یہ اس کا آنچل پکڑے، گھر سے باہر ہو کر، آگے آگے ہو لیا۔

"آخر اس کو پہاڑ ہی پہ لے آیا۔ عورت کے جی میں کتے کی اس حرکت سے الہام ہوا کہ اس کا میاں مقرر، اس غار میں گرفتار ہے۔ شاید اس کی خاطر پانی چاہتا ہے۔ غرض پیرزن کوئیں پہ ہوتے، غار کے منہ پر آیا۔ عورت نے، لوٹا پانی کا بھر کر، رسی سے لٹکایا۔ میں نے وہ باسن لے لیا اور نان کا ٹکڑا کھایا۔ دو تین گھونٹ پانی پیا۔ اس پیٹ کے کتے کو راضی کیا۔ خدا کا شکر کر کر ایک کنارے بیٹھا اور خدا کی رحمت کا منتظر تھا کہ دیکھیے اب کیا ہوتا ہے؟ یہ حیوان بے زبان، اسی طرح سے نان لے آتا۔ اور بڑھیا کے ہاتھ پانی پلواتا۔ جب بھٹیاروں نے دیکھا کہ کتا ہمیشہ روٹی لے جاتا ہے، ترس کھا کر مقرر کیا کہ جب اسے دیکھتے، ایک گردا اس کے آگے پھینک دیتے۔ اور اگر وہ عورت پانی نہ لاتی تو یہ اس کے باسن پھوڑ ڈالتا۔ لاچار وہ بھی ہر روز ایک صراحی پانی کی دے جاتی۔ اس رفیق نے آب و ناں سے میری خاطر جمع کی اور آپ زندان کے منہ پر پڑا رہتا۔ اس طرح چھ مہینے گزرے۔ لیکن جو آدمی ایسے زندان میں رہے کہ دنیا کی ہوا اس کو نہ لگے، اس کا کیا حال ہو! نرا پوست و استخوان، مجھ پہ باقی رہا۔ زندگی وبال ہوئی۔ جی میں آوے کہ یا الٰہی! یہ دم نکل جاوے تو بہتر ہے۔

"ایک روز رات کو، وہ دونوں قیدی سوتے تھے۔ میرا دل امنڈ آیا، بے اختیار رونے لگا اور خدا کی درگاہ میں نک گھسنی کرنے۔ پچھلے پہر کیا دیکھتا ہوں کہ خدا کی قدرت سے ایک رسی غار میں لٹکی اور آواز ... میں سنی کہ اے کم بخت بدنصیب! ڈور کا سرا اپنے ہاتھ میں مضبوط باندھ اور یہاں سے نکل۔ میں ... دل میں خیال کیا کہ آخر بھائی مجھ پہ مہربان ہو کر، لہو کے جوش سے، آپ ہی نکالنے آئے۔ ... خوشی سے اس طناب کو کمر میں، خوب کسا۔ کسو نے مجھے اوپر کھینچا۔ رات ایسی اندھیری تھی کہ جس نے ... نے نہیں پہچانا کہ کون ہے۔ جب میں باہر آیا تب اس نے کہا، جلد آ، یہاں کھڑے ... میں طاقت تو نہ تھی پر مارے ڈر کے، گرتا پڑتا، پہاڑ سے نیچے آیا۔ دیکھوں

تو دو گھوڑے، زین بندھے ہوئے کھڑے ہیں۔ اس شخص نے ایک پر مجھے سوار کیا اور ایک پر آپ چڑھ لیا اور آگے ہوا۔ جاتے جاتے، دریا کے کنارے پر پہنچا۔

"صبح ہو گئی۔ اس شہر سے دس بارہ کوس نکل آئے۔ اس جوان کو دیکھا کہ اونچی بنا ہوا، زرہ بکتر پہنے گھوڑے پر پاکھر ڈالے، میری طرف غضب کی نظروں سے گھور کر، اور اپنا ہاتھ اپنے دانتوں سے کاٹ کر، تلوار میان سے کھینچی اور گھوڑے کو جست کر کر، مجھ پر چلائی۔ میں نے اپنے تئیں گھوڑے پر سے نیچے گرا دیا اور گھگھیانے لگا کہ "میں بے تقصیر ہوں۔ مجھے کیوں قتل کرتا ہے؟ اے صاحب مروت! ایسے زندان سے میرے تئیں تو نے نکالا، اب یہ بے مروتی کیا ہے؟" اس نے کہا "سچ کہہ تو کون ہے؟" میں نے جواب دیا کہ "مسافر ہوں۔ ناحق کی بلا میں گرفتار ہو گیا تھا۔ تمہارے تصدق سے، بارے، جیتا نکلا ہوں" اور بہت باتیں خوشامد کی کیں۔

"خدا نے اس کے دل میں رحم دیا، شمشیر کو غلاف کیا اور بولا "خیر خدا جو چاہے سو کرے۔ جا تیری جان بخشی کی، جلد سوار ہو، یہاں توقف کا مکان نہیں" گھوڑوں کو جلد کیا اور چلے۔ راہ میں افسوس کھاتا اور پچھتاتا جاتا تھا۔ ظہر کے وقت تک، ایک جزیرے میں جا پہنچے۔ وہاں گھوڑے سے اترا، مجھے بھی اتارا۔ زین خوگیر، مرکبوں کی پیٹھ سے کھولا اور چرنے کو چھوڑ دیا۔ اپنی بھی کمر سے، ہتھیار کھول ڈالے اور بیٹھا۔ مجھ سے بولا "اے بدنصیب! اب اپنا احوال کہہ، تو معلوم ہو کہ تو کون ہے؟" میں نے اپنا نام نشان بتایا اور جو کچھ بپتا بیتی تھی، اس سے آخر تک کہی۔

"اس جوان نے جب میری سرگزشت سب سنی، رونے لگا اور مخاطب ہوا کہ "اے جوان! اب میرا ماجرا سن، میں کنیا، زیرباد کے دیس کے راجا کی، ہوں۔ اور وہ گھبرو، جو زندان سلیمان میں قید ہے، اس کا نام بہرہ مند ہے۔ میرے پتا کے منتری کا بیٹا ہے۔ ایک روز مہاراج نے آگیا دی کہ جتنے راجا اور کنور ہیں میدان میں، زیر جھروکے نکل کر، تیراندازی اور چوگان بازی کریں تو گھڑ چڑھی، اور کسب ہر ایک کا ظاہر ہو۔ میں رانی کے نیڑے، جو میری ماتا تھیں، اٹاری پر اوجھل میں بیٹھی تھی اور دائیاں اور سہیلیاں حاضر تھیں۔ تماشا دیکھتی تھی۔ یہ دیوان کا پوت، سب میں سندر تھا اور گھوڑے کو، کاوے دے کر کسب کر رہا تھا۔ مجھ کو بھایا اور دل سے اس پر ریجھی۔ مدت تلک یہ بات گپت رکھی۔

"آخر جب بہت بیاکل ہوئی، تب دائی سے کہا اور ڈھیر سا انعام دیا۔ وہ اس جوان کو، کسو نہ کسو ڈھب سے پوشیدہ، میرے دھرا ہر میں لے آئی۔ تب یہ بھی مجھے چاہنے لگا۔ بہت دن اس عشق مشک میں کٹے۔ ایک روز چوکی داروں نے آدھی رات کو، ہتھیار باندھے اور محل میں آتے دیکھ کر، اسے پکڑا اور راجا

نے کہا، اُسے حکم قتل کیا۔ سب ارکانِ دولت نے، کہہ سن کر، جان بخشی کروائی۔ تب فرمایا کہ اس کو زندانِ سلیمان میں ڈال دو۔ اور دوسرا جو ان جوان کے ہمراہ اسیر ہے، اُس کا بھگتنا ہے۔ اُس رین کو وہ بھی اس کے ساتھ تھا دونوں کو اُس کنوئیں میں چھوڑ دیا۔ آج تین برس ہوئے کہ وے پھنسے ہیں مگر کسو نے نہیں دریافت کیا کہ یہ جوان راجا کے گھر میں کیوں آیا تھا۔ بھگوان نے میری پت رکھی۔ اس کے شکرانے کے بدلے، میں نے اپنے اوپر لازم کیا ہے کہ ان اور جل اس کو پہنچایا کروں۔ جب سے، اٹھوارے میں ایک من آتی ہوں اور آٹھ دن کا آذوقہ اکٹھا دے جاتی ہوں۔

"کل رات، سپنے میں دیکھا کہ کوئی مانس کہتا ہے کہ شتابی اُٹھ، اور گھوڑا جوڑا، اور کمند اور کچھ نقد خرچ کے واسطے لے کر، اُس غار پہ جا اور اُس بے چارے کو وہاں سے نکال۔ یہ سن کر میں چونک پڑی اور مگن ہو کر مردانہ بھیس کیا، اور ایک صندوقچہ جواہر و اشرفی سے بھر لیا۔ اور یہ گھوڑا اور کپڑا جوڑا لے کر وہاں گئی کہ کمند سے اُسے کھینچوں۔ کرم میں تیرے تھا کہ دیسی قید سے اس طرح چھٹکارا پاوے۔ اور میرے اس کرتب سے محرم کوئی نہیں، شاید وہ کوئی دیوتا تھا کہ تیری مخلصی کی خاطر مجھے بھجوایا۔ خیر، جو میرے بھاگ میں تھا، سو ہُوا۔"

یہ کتھا کہہ کر پوری کچوری، ماس کا سالن، انگوچھے سے کھولا۔ پہلے قند نکال، ایک کٹورے میں گھولا اور عرق بید مشک کا، اس میں ڈال کر مجھے دیا۔ میں نے اُس کے ہاتھ سے لے کر پیا، پھر تھوڑا سا ناشتہ کیا۔ بعد ایک ساعت کے، میرے تئیں لنگی بندھوا کر، دریا میں لے گئی۔ قینچی سے میرے سر کے بال کترے، ناخن لئے۔ نہلا دھلا کر کپڑے پہنائے۔ نئے سر سے آدمی بنایا۔ میں دوگانہ شکرانے کا رو بہ قبلہ ہو کر پڑھنے لگا۔ وہ نازنین اس میری حرکت کو دیکھتی رہی۔

"جب نماز سے فارغ ہوا، پوچھنے لگی کہ یہ تُو نے کیا کام کیا؟ میں نے کہا: جس خالق نے ساری خلقت کو پیدا کیا اور تجھ سی محبوبہ سے میری خدمت کروائی اور تیرے دل کو مجھ پر مہربان کیا اور ایسے زندان سے خلاص کروایا، اس کی ذات لاشریک ہے۔ اُس کی میں نے عبادت کی اور بندگی بجا لایا اور اُس کا شکر کیا۔ یہ بات سن کر کہنے لگی تم مسلمان ہو؟ میں نے کہا شکر الحمد للہ! بولی، میرا دل تمہاری باتوں سے خوش ہوا۔ مجھے تئیں بھی سکھاؤ اور کلمہ پڑھاؤ، میں بھی [illegible] میں نے کہا الحمد للہ کہ ہمارے دین کی شریک ہوئی۔ غرض میں نے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھایا [illegible] وہ اس سے پڑھ [illegible] پھر وہاں سے گھوڑوں پر سوار ہو کر ہم دونوں چلے [illegible] وہ ذکر دین ایمان کا کرتی [illegible] چلتی اور خوش ہوتی جاتی اس طرح دو مہینے [illegible] ہم شبانہ روز چلے گئے۔

آخر ایک ولایت میں پہنچے کہ درمیان، سرحد ملک زیرباد اور سراندیپ کے، تھی۔ ایک شہر نظر آیا کہ آبادی میں استنبول سے بڑا اور آب و ہوا بہت خوش اور موافق۔ پادشاہ اس شہر کا، کسریٰ سے زیادہ عادل اور رعیت پرور۔ دیکھ کر دل نپٹ شاد ہوا۔ ایک حویلی خرید کر کے بود و باش مقرر کی جب کئی دن میں، رنج سفر سے آسودہ ہوئے۔ کچھ اسباب ضروری درست کر کے، اس بی بی سے موافق شرع محمدی کے، نکاح کیا اور رہنے لگا۔ تین سال میں، وہاں کے اکابر و اصاغر سے مل جل کر اعتبار بہم پہنچایا اور تجارت کا ٹھاٹ پھیلایا۔ آخر وہاں کے سب سوداگروں سے سبقت لے گیا۔ ایک روز وزیر اعظم کی خدمت میں سلام کے لئے چلا۔ ایک میدان میں، کثرت خلق اللہ کی دیکھی۔ کسو سے پوچھا کہ کیوں اتنا ازدھام ہے؟ معلوم ہوا کہ دو شخصوں کو زنا اور چوری کرتے پکڑا ہے، اور شاید خون بھی کیا ہے، اُن کو سنگسار کرنے کو لائے ہیں۔

"مجھے سنتے ہی اپنا احوال یاد آیا کہ ایک دن مجھے بھی، اسی طرح سولی چڑھانے لے گئے تھے، خدا نے بچا لیا۔ آیا یہ کون ہیں گے کہ ایسی بلا میں گرفتار ہوتے ہیں؟ بھیڑ کو چیر کر اندر گھسا۔ دیکھا تو یہی میرے دونوں بھائی ہیں کہ ٹنڈیاں کسے، سر و پا برہنہ ان کو لئے جاتے ہیں۔ ان کی صورت دیکھتے ہی خون نے جوش کیا اور کلیجہ جلا۔ محصلوں کو، ایک مٹھی اشرفیاں دیں اور کہا، ایک ساعت توقف کرو، اور وہاں سے گھوڑے کو سرپٹ پھینک کر، حاکم کے گھر گیا۔ ایک دانہ یاقوت بے بہا کا نذر گزرانا اور ان کی شفاعت کی۔ حاکم نے کہا "ایک شخص ان کا مدعی ہے اور ان کے گناہ ثابت ہوئے ہیں اور بادشاہ کا حکم ہو چکا ہے، میں لاچار ہوں۔"

"بارے بہت منت و زاری سے، حاکم نے مدعی کو بلوا کر پانچ ہزار روپے پر راضی کیا کہ وہ دعویٰ خون کا معاف کرے۔ میں نے روپے گن دیئے اور لا دعویٰ لکھوا لیا اور ایسی بلا سے مخلصی دلوائی۔ جہاں پناہ ان سے پوچھیے کہ سچ کہتا ہوں یا جھوٹ بکتا ہوں؟ وہ دونوں بھائی، سر نیچے کئے، شرمندہ سے کھڑے تھے۔ خیر، ان کو چھڑا کر گھر میں لایا، حمام کروا کر لباس پہنوایا۔ دیوان خانے میں مکان رہنے کو دیا اس مرتبہ اپنے قبیلے کو، ان کے روبرو نہ کیا۔ ان کی خدمت میں حاضر رہتا اور ان کے ساتھ کھانا کھاتا۔ سونے کے وقت گھر میں جاتا۔ تین برس تک ان کی تابعداری میں گزری اور ان سے بھی کوئی حرکت بے واقع نہ ہوئی کہ باعث رنجیدگی کا ہووے۔ جو میں سوار ہو کر کہیں جاتا تو یہ گھر میں رہتے۔

"اتفاقاً وہ بی بی نیک بخت، ایک دن حمام کو گئی تھی۔ جب دیوان خانے میں آئی، کوئی مرد نظر نہ پڑا۔ اُس نے برقع اتارا۔ شاید یہ منجھلا بھائی لیٹا ہوا جاگتا تھا۔ دیکھتے ہی عاشق ہوا۔ بڑے

بھائی سے کہا۔ دونوں نے میرے مار ڈالنے کی باہم صلاح کی۔ میں اس حرکت سے مطلق خبر نہ رکھتا تھا بلکہ دل میں کہتا تھا کہ الحمدللہ اس مرتبہ، اب تک، انہوں نے کچھ ایسی بات نہیں کی، اب ان کی وضع درست ہوئی شاید غیرت کو کام فرمایا۔ ایک روز بعد کھانے کے، بڑے بھائی صاحب آبدیدہ ہوئے اور اپنے وطن کی تعریف اور ایران کی خوبیاں بیان کرنے لگے۔ یہ سن کر دوسرے بھی لبسورنے لگے۔ میں نے کہا کہ" اگر ارادہ وطن کا ہے تو بہتر۔ میں تابع مرضی کے ہوں۔ میری بھی یہی آرزو ہے۔ اب انشاء اللہ میں بھی آپ کی رکاب میں چلتا ہوں اُس بی بی سے، دونوں بھائیوں کی اُداسی کا مذکور کیا اور اپنا ارادہ بھی کہا۔ وہ عاقلہ بولی کہ" تم جانو۔ لیکن پھر کچھ دغا کیا چاہتے ہیں۔ یہ تمہاری جان کے دشمن ہیں۔ تم نے سانپ، آستین میں پالے ہیں اور اُنکی دوستی کا بھروسا رکھتے ہو! جو جی چاہے سو کرو لیکن موذیوں سے خبردار رہو" بہر تقدیر، تھوڑے عرصے میں، تیاری سفر کی کر کے خیمہ میدان میں اِستاد کیا۔ بڑا قافلہ جمع ہوا اور میری سرداری اور قافلہ باشی پر راضی ہوئے۔ اچھی ساعت دیکھ کر روانہ ہُوا، لیکن ان کی طرف سے، اپنی جانب، میں ہوشیار رہتا اور سب صورت سے، فرماں برداری اور دل جوئی ان کی کرتا۔

" ایک روز ایک منزل میں، منجھلے بھائی نے مذکور کیا کہ" ایک فرسخ اس مکان سے، ایک چشمہ جاری ہے مانند سلسبیل کے۔ اور میدان میں خودرو، کوسوں تک، لالہ نافرمان اور نرگس وگلاب پھولا ہے۔ واقعی عجب مکان سیر کا ہے۔ اگر اپنا اختیار ہوتا تو کل وہاں جا کر تفریح طبیعت کی کرتے اور ماندگی بھی رفع ہوتی" میں بولا کہ" صاحب مختار ہیں۔ فرماؤ تو کل کے دن مقام کریں اور وہاں چل کر سیر کرتے پھریں" یہ بولے "اس سے کیا بہتر؟" میں نے حکم کیا کہ سارے قافلے میں پکار دو کہ کل مقام ہے۔ اور بکاول کو کہا کہ" حاضری، ہر قسم کی تیار کر۔ کل سیر کو چلیں گے" جب صبح ہوئی ان دونوں برادروں نے کپڑے پہن، کمر باندھ کر، مجھے یاد دلایا کہ جلد ٹھنڈے ٹھنڈے چلیئے اور سیر کیجئے" میں نے سواری مانگی۔ بولے کہ" پاپیادہ جو لطف سیر کا ہوتا ہے، سو سواری میں معلوم؟" نفروں کو کہہ دو گھوڑے ڈرا کر لے آویں۔

" دونوں غلاموں نے، قلیان اور قہوہ دان لے لیا اور ساتھ ہوئے۔ راہ میں تیر اندازی کرتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ جب قافلے سے دور نکل گئے، ایک غلام کو انہوں نے کسی کام کو بھیجا۔ تھوڑی دور آگے بڑھ کر، دوسرے کو بھی اُس کے بلانے کو رخصت کیا۔ کم بختی جو آئی، میرے منہ میں جیسے کسی نے مہر دیدی جو وہ چاہتے تھے سو وہ کرتے تھے اور مجھے باتوں میں پرچائے لئے جاتے تھے، مگر یہ کتا ساتھ رہ گیا۔ بہت دور نکل گئے نہ چشمہ نظر آیا نہ گلزار۔ مگر ایک میدان پر خار تھا، وہاں مجھے پیشاب لگا، میں بول کرنے کو بیٹھا، اپنے پیچھے چمک، تلوار کی سی دیکھی، مڑ کر دیکھوں تو منجھلے بھائی صاحب نے مجھے تلوار ماری کہ سر دو

پارہ ہو گیا۔ جب تلک بولوں کہ اے ظالم! مجھے کیوں مارتا ہے؟ بڑے بھائی نے شانے پر لگائی۔ دونوں زخم کاری لگے، تیورا کر گرا۔ تب، ان دونوں بے رحموں نے، بہ خاطر جمع، میرے تئیں چور زخمی کیا اور لہولہان کر دیا۔ یہ کتا، میرا احوال دیکھ کر، ان پر بھپکا، اس کو بھی گھائل کیا۔ بعد اس کے، اپنے ہاتھوں سے، اپنے بدن میں زخموں کے نشان کئے اور سر و پا برہنہ قافلے میں گئے اور ظاہر کیا کہ "حرامیوں نے اس میدان میں، ہمارے بھائی کو شہید کیا اور ہم بھی، لڑ بھڑ کر، زخمی ہوئے۔ جلدی کوچ کرو، نہیں تو اب کارواں پر گر کر، سب کو ننگیا لیں گے"۔ قافلے کے لوگوں نے بدوؤں کا نام جو سنا، وہیں بدحواس ہوئے اور گھبرا کر کوچ کیا اور چل نکلے۔ میرے قبیلے نے، سلوک اور خوبیاں اُن کی سن رکھی تھیں، جو جو مجھ سے دغائیں کیں تھیں۔ یہ واردات، ان کاذبوں سے سُن کر، جلد خنجر سے اپنے تئیں ہلاک کیا اور جاں بحق تسلیم ہوئی"۔

اے درویشو! اُس خواجہ سگ پرست نے، جب اپنی کیفیت اور مصیبت، اس طرح سے یہاں تلک کہی، سنتے ہی مجھے بے اختیار رونا آیا۔ وہ سوداگر دیکھ کر کہنے لگا کہ "قبلۂ عالم! اگر بے ادبی نہ ہوتی تو برہنہ ہو کر، میں اپنا سارا بدن کھول کر دکھاتا"۔ تس پر بھی، اپنی راستی کو، گریبان مونڈھے تلک چیر کر، دکھایا۔ واقعی چار انگل تن اُس کا، بغیر زخم کے ثابت نہ تھا۔ میرے حضور سر سے عمامہ اُتارا۔ کھوپری میں ایسا بڑا اگڑھا پڑا تھا کہ ایک انار سموچا اس میں سما دے۔ ارکان دولت جتنے حاضر تھے، سب نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، طاقت دیکھنے کی نہ رہی۔

پھر خواجہ بولا کہ "بادشاہ سلامت! جب یہ بھائی اپنی دانست میں، میرا کام تمام کر کے چلے گئے، ایک طرف میں، اور ایک طرف یہ سگ، میرے نزدیک، زخمی پڑا تھا۔ لہو اتنا بدن سے گیا کہ مطلق طاقت اور ہوش کچھ باقی نہ تھا۔ کیا جانوں، دم کہاں اٹک رہا تھا کہ جیتا تھا؟ جس جگہ میں پڑا تھا ولایت سراندیپ کی سرحد تھی اور ایک شہر بہت آباد اس کے قریب تھا۔ اس شہر میں بڑا بت خانہ تھا اور وہاں کے بادشاہ کی ایک بیٹی تھی، نہایت قبول صورت اور صاحب جمال۔ اکثر بادشاہ اور شہزادے اس کے عشق میں خراب تھے۔ وہاں، رسم حجاب کی، نہ تھی۔ اس سے، وہ لڑکی تمام دن، ہم جولیوں کے ساتھ، سیر شکار کرتی پھرتی۔ ہم سے نزدیک ایک بادشاہی باغ تھا۔ اس روز بادشاہ سے اجازت لے کر اسی باغ میں آئی تھی۔ سیر کی خاطر اس میدان میں پھرتی آنکلی، کئی خواصیں بھی ساتھ سوار تھیں، جہاں میں پڑا تھا، آئیں۔ میرا کراہنا سن کر، پاس کھڑی ہوئیں۔ مجھے اس حالت میں دیکھ کر وے بھاگیں اور شہزادی سے کہا کہ "ایک مردوا اور ایک کتا، لہو میں شور بور، پڑا ہے"۔ اُن سے یہ

سن کر، آپ ملکہ، میرے سر پر آئی، افسوس کھا کر کہا 'دیکھو تو کچھ جان باقی ہے'؟ دو چار دائیوں نے اُتر کر دیکھا اور عرض کی 'اب تلک تو جیتا ہے'۔ تب فرمایا کہ 'امانت قالیچے پر لٹا کر، باغ میں لے چلو'۔ وہاں لے جا کر، جراح سرکار کا بلا کر، میرے اور میرے کتے کے علاج کی خاطر، بہت تاکید کی اور اُمیدوار، انعام و بخشش کا کیا۔ اُس حجام نے، سارا بدن میرا، پونچھ پانچھ کر، خاک و خون سے پاک کیا اور شراب سے دھو دھا کر، زخموں کو ٹلکے مرہم لگایا اور بید مشک کا عرق، پانی کے بدلے، میرے حلق میں چوایا۔ ملکہ آپ میرے سرہانے بیٹھی رہتی اور میری خدمت کرواتی اور تمام دن رات میں، دو چار بار، کچھ شوربا یا شربت اپنے ہاتھ سے پلاتی۔ بارے مجھے ہوش آیا تو دیکھا کہ ملکہ نہایت افسوس سے کہتی ہے 'کس ظالم خونخوار نے، تجھ پر یہ ستم کیا'؟ بڑے بت سے بھی نہ ڈرا'؟ بعد دس روز کے، عرق اور شربت اور معجونوں کی قوت سے، میں نے آنکھ کھولی۔ دیکھا تو اندر کا اکھاڑا میرے آس پاس جمع ہے اور ملکہ سرہانے کھڑی ہے۔ ایک آہ بھری اور چاہا کہ کچھ حرکت کروں، طاقت نہ پائی۔ بادشاہ زادی مہربانی سے بولی کہ 'اے عجمی! خاطر جمع رکھ، کڑھ مت، اگرچہ کسو ظالم نے، تیرا یہ احوال کیا لیکن بڑے بت نے مجھ کو تجھ پر مہربان کیا ہے۔ اب چنگا ہو جاوے گا'۔

"قسم اُس خدا کی، جو واحد لاشریک ہے، میں اُسے دیکھ کر، پھر بے ہوش ہو گیا۔ ملکہ نے بھی دریافت کیا اور گلاب پاش سے گلاب، اپنے ہاتھ سے چھڑکا۔ بیس دن کے عرصے میں زخم بھر آئے۔ اور انگور کر لائے۔ ملکہ ہمیشہ رات کو، جب سب سو جاتے، میرے پاس آتی اور کھلا پلا جاتی۔ غرض ایک چلّے میں غسل کیا۔ بادشاہ زادی نہایت خوش ہوئی۔ حجام کو انعام بہت سا دیا اور مجھ کو پوشاک پہنوائی۔ خدا کے فضل سے، اور خبر گیری اور سعی سے ملکہ کی، خوب چاق و چوبند ہوا۔ اور بدن نہایت تیار ہوا اور کتا بھی فربہ ہو گیا۔ روز مجھے شراب پلاتی اور باتیں سنتی اور خوش ہوتی۔ میں بھی ایک آدھ نقل، یا کہانی انوکھی، کہہ کر، اُس کے دل کو بہلاتا۔

"ایک دن پوچھنے لگی کہ 'اپنا احوال تو بیان کر کہ تم کون ہو اور یہ واردات، تم پر کیوں کر ہوئی'؟ میں نے، سارا ماجرا اپنا، اوّل سے آخر تک، کہہ سنایا۔ سن کر رونے لگی اور بولی کہ 'اب میں تجھ سے ایسا سلوک کروں گی کہ اپنی ساری مصیبت بھول جاوے گا'۔ میں نے کہا 'خدا تمہیں سلامت رکھے۔ تم نے نئے سرے، میری جان بخشی کی ہے۔ اب میں تمہارا ہو رہا ہوں۔ واسطے خدا کے، اسی طرح ہمیشہ مجھ پر، اپنی مہربانی کی نظر رکھیو'۔ غرض، تمام رات اکیلی، میرے پاس بیٹھی رہتی اور صحبت رکھتی۔ لیکن دن، دائی اس کی بھی، ساتھ رہتی۔ ہر ایک طور کا ذکر مذکور سنتی اور کہتی۔ جب ملکہ اُٹھ جاتی اور

میں تنہا ہوتا، طہارت کر، کونے میں چھپ کر نماز پڑھ لیتا۔

"ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ ملکہ اپنے باپ کے پاس گئی تھی۔ میں خاطر جمع سے، وضو کر کے، نماز پڑھ رہا تھا کہ اچانک شہزادی، دائی سے بولتی ہوئی، آئی کہ 'دیکھیں عجمی اس وقت کیا کرتا ہے؟ سوتا ہے یا جاگتا ہے؟' مجھے مکان پر جو نہ دیکھا، تعجب میں ہوئی کہ 'ایں، یہ کہاں گیا ہے؟ کسو سے کوئی لگا تو نہیں لگایا؟' کونا کھترا دیکھنے لگی اور تلاش کرنے لگی۔ آخر جہاں میں نماز کر رہا تھا، وہاں آ نکلی۔ اس لڑکی نے کبھو، نماز کاہے کو دیکھی تھی۔ چپکی کھڑی، دیکھا کی۔ جب میں نے نماز تمام کر کے، دعا کے لئے، ہاتھ اٹھائے اور سجدے میں گیا، بے اختیار کھلکھلا کر ہنسی اور بولی 'کیا یہ آدمی سودائی ہو گیا؟ یہ کیسی کیسی حرکتیں کر رہا ہے؟'

"میں ہنسنے کی آواز سن کر دل میں ڈرا۔ ملکہ آگے آ کر پوچھنے لگی کہ 'اے عجمی! یہ تو کیا کرتا تھا؟' میں کچھ جواب نہ دے سکا۔ اس میں دائی بولی 'بلاؤں، تیرے صدقے گئی۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص مسلمان ہے اور لات منات کا دشمن ہے۔ ان دیکھے خدا کو پوجتا ہے۔' ملکہ نے یہ سنتے ہی، ہاتھ ہاتھ پر، مار! بہت غصے ہوئی کہ 'میں کیا جانتی تھی کہ یہ ترک ہے اور ہمارے خداؤں سے منکر ہے؟ تبھی، ہمارے بت کے غضب میں، پڑا تھا۔ میں نے ناحق اس کی پرورش کی اور اپنے گھر میں رکھا۔' یہ کہتی ہوئی چلی گئی۔ میں سنتے ہی بدحواس ہوا کہ دیکھیے، اب کیا سلوک کرے۔ مارے خوف کے، نیند اچاٹ ہو گئی۔ صبح تک بے اختیار رویا کیا اور آنسوؤں منہ دھویا کیا۔

"تین دن رات، اسی خوف و رجا میں، روتے گزرے۔ ہرگز آنکھ نہ جھپکی۔ تیسری شب ملکہ، شراب کے نشے میں مخمور، اور دائی ساتھ لئے میرے مکان پر آئی۔ غصے میں بھری ہوئی، اور تیر کمان ہاتھ میں لئے، باہر چمن کے کنارے بیٹھی۔ دائی سے پیالہ شراب کا مانگا۔ پی کر کہا 'دایا! وہ عجمی جو ہمارے بڑے بت کے قہر میں، گرفتار ہے، مُوا، یا اب تک جیتا ہے؟' دائی نے کہا 'بلیاؤں، کچھ دم باقی ہے۔' بولی کہ 'اب وہ ہماری نظروں سے گرا۔ لیکن کہہ کہ باہر آوے۔' دائی نے مجھے پکارا۔ میں دوڑا۔ دیکھوں تو ملکہ کا چہرہ مارے غصے کے، تمتما رہا ہے اور سرخ ہو گیا ہے، روح قالب میں نہ رہی۔ سلام کیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوا۔ غضب کی نگاہ سے مجھے دیکھ کر دائی سے بولی 'اگر میں، اس دین کے دشمن کو تیر سے ماروں تو میری خطا بڑا بت معاف کرے گا یا نہیں؟' یہ مجھ سے بڑا گناہ ہوا ہے کہ میں نے اسے، اپنے گھر میں رکھ کر، خاطر داری کی۔'

دائی نے کہا 'بادشاہ زادی کی کیا تقصیر ہے؟ کچھ دشمن جان کر نہیں رکھا۔ تم نے اس پر ترس

کھایا، تم کو نیکی کے عوض نیکی ملے گی اور یہ اپنی بدی کا ثمرہ بڑے بت سے پا رہے گا۔" یہ سن کر کہا "دائی! اسے بیٹھنے کو کہو۔" دائی نے مجھے اشارت کی کہ بیٹھ جا۔ میں بیٹھ گیا۔ ملکہ نے اور جام شراب کا پیا اور دائی سے کہا کہ "اس کم بخت کو بھی ایک پیالہ دے تو آسانی سے مارا جاوے۔" دائی نے جام دیا۔ میں نے بے عذر پیا اور سلام کیا۔ ہرگز میری طرف نگاہ نہ کی، مگر کن انکھیوں سے، چوری چوری، دیکھتی تھی۔ جب مجھے سرور ہوا کچھ شعر پڑھنے لگا۔ ازاں جملہ ایک بیت یہ بھی پڑھی:

قالو میں ہوں میں تیرے، گو اب جیا تو پھر کیا؟
خنجر تلے کسو نے، ٹک دم لیا تو پھر کیا؟

سن کر مسکرائی اور دائی کی طرف دیکھ کر بولی "کیا تجھے نیند آتی ہے؟" دائی نے مرضی پا کر کہا کہ "ہاں، مجھ پر خواب نے غلبہ کیا ہے۔" وہ تو رخصت ہو کر جہنم واصل ہوئی۔ بعد ایک دم کے، ملکہ نے پیالہ مجھ سے مانگا میں جلد بھر کر، رو برو لے گیا۔ ایک ادا سے، میرے ہاتھ سے لے کر، پی لیا۔ تب میں قدموں پر گرا۔ ملکہ نے ہاتھ مجھ پر جھاڑا اور کہنے لگی "اے جاہل، ہمارے بڑے بت میں کیا برائی دیکھی، جو غائب خدا کی پرستش کرنے لگا؟" میں نے کہا "انصاف شرط ہے۔ ٹک غور فرمایئے کہ بندگی کے لائق وہ خدا ہے کہ جس نے ایک قطرے پانی سے، تم سا رشک محبوب پیدا کیا اور یہ حسن و جمال دیا کہ ایک آن میں، ہزاروں انسان کے دل کو، دیوانہ کر ڈالو۔ بت کیا چیز ہے کہ کوئی اس کی پوجا کرے؟ ایک پتھر کو، سنگ تراشوں نے گڑھ کر، صورت بنائی اور دام احمقوں کے واسطے بچھایا۔ جن کو شیطان نے ورغلایا ہے، وے مصنوع کو صانع جانتے ہیں جسے اپنے ہاتھوں سے بناتے ہیں، اُس کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ اور ہم مسلمان ہیں جس نے ہمیں بنایا ہے، ہم اُسے جانتے ہیں۔ اُن کے واسطے دوزخ، ہمارے لئے بہشت بنایا ہے۔ اگر بادشاہ زادی! ایمان خدا پہ لاوے، تب اُس کا مزہ پاوے اور حق و باطل میں فرق کرے اور اپنے اعتقاد کو غلط سمجھے۔"

"بارے، ایسی ایسی نصیحتیں سن کر، اس سنگ دل کا دل ملائم ہوا۔ خدا کے فضل و کرم سے رونے لگی اور بولی "اچھا مجھے بھی اپنا دین سکھاؤ۔" میں نے کلمہ تلقین کیا۔ اُس نے بہ صدق دل پڑھا اور توبہ استغفار کر کر، مسلمان ہوئی۔ تب میں اس کے پاؤں پڑا۔ صبح تک کلمہ پڑھتی اور استغفار کرتی رہی۔ پھر کہنے لگی "بھلا میں نے تو تمہارا دین قبول کیا، لیکن ماں باپ کا کیا علاج؟" میں نے کہا "تمہاری بلا سے! جو جیسا کرے گا، ویسا پاوے گا۔" بولی کہ "مجھے چچا کے بیٹے سے منسوب کیا ہے اور وہ بت پرست ہے۔ کل کو خدانخواستہ بیاہ ہوا اور وہ کافر مجھے ملے اور اس کا نطفہ میرے پیٹ میں ٹھہر

جاوے تو بڑی قباحت ہے۔ اس کی فکر، ابھی سے کیا چاہیے کہ اس بلا سے نجات پاؤں۔" میں نے کہا "تم، بات
تو، معقول کہتی ہو۔ جو مزاج میں آوے سو کرو۔" بولی کہ "میں اب یہاں نہ رہوں گی۔ کہیں نکل جاؤں گی
میں نے پوچھا "کس صورت سے بھاگنے پاؤ گی اور کہاں جاؤ گی؟" جواب دیا کہ "پہلے تم میرے پاس سے
جاؤ، مسلمانوں کے ساتھ سرا میں جا رہو، تو سب آدمی سنیں اور تم پر گمان نہ لے جاویں۔ تم وہاں
کشتیوں کی تلاش میں رہو۔ جو جہاز عجم کی طرف چلے، مجھے خبر کیجو۔ میں، اس واسطے، دائی کو تمہارے
پاس اکثر بھیجا کروں گی۔ جب تم کہلا بھیجو گے، میں نکل کر آؤں گی اور کشتی پر سوار ہو کر چلی جاؤں گی۔
ان کم بخت بے دینوں کے ہاتھ سے مخلصی پاؤں گی۔" میں نے کہا "تمہاری جان و مال کے قربان ہوا، دائی
کو کیا کرو گی؟" بولی "اس کی فکر سہل ہے۔ ایک پیالے میں، زہر ہلاہل پلا دوں گی۔" یہی صلاح مقرر ہوئی
جب دن ہوا، میں کارواں سرا میں گیا، ایک حجرہ کرائے لیا اور جا رہا۔ اُس جدائی میں، فقط وصل کی
توقع پہ جیتا تھا۔ جب دو مہینے میں سوداگر، روم و شام و اصفہان کے جمع ہوئے، ارادہ کوچ کا، تری کی
راہ نے، کیا اور اپنا اسباب جہاز پر چڑھانے لگے۔ ایک جگہ رہنے سے اکثر آشنا صورت ہو گئے تھے۔ مجھ
سے کہنے لگے "کیوں صاحب! تم بھی چلو نہ، یہاں کفرستان میں کب تلک رہو گے؟" میں نے جواب دیا کہ
"میرے پاس کیا ہے جو اپنے وطن کو جاؤں؟ یہی ایک لونڈی، ایک کُتّا، ایک صندوق، بساط میں رکھتا
ہوں۔ اگر تھوڑی سی جگہ، بیٹھ رہنے کو دو اور اس کا نول مقرر ہو تو میری خاطر جمع ہو۔ میں بھی سوار ہوں۔"
"سوداگروں نے، ایک کوٹھری میرے تحت کر دی۔ میں نے اُس کے نول کا روپیہ بھر دیا۔ دل جمعی کر کر،
کسو بہانے سے دائی کے گھر گیا اور کہا "اے ماں تجھ سے رخصت ہونے آیا ہوں۔ اب وطن کو جاتا ہوں
اگر تیری توجہ سے، ایک نظر ملکہ کو دیکھ لوں تو بڑی بات ہے۔" بارے، دائی نے قبول کیا۔ میں نے کہا
"میں رات کو آؤں گا۔ فلانے مکان پر کھڑا رہوں گا۔" بولی "اچھا" میں کہہ کر سرا میں آیا۔ صندوق اور
بچھونے اٹھا کر جہاز میں لایا اور ناخدا کو سونپ کر کہا "کل فجر کو، اپنی کنیز کو لے کر، آؤں گا۔" ناخدا بولا
"جلد آئیو۔ صبح ہم لنگر اٹھا دیں گے۔" میں نے کہا "بہت خوب۔" جب رات ہوئی، اسی مکان پر، جہاں
دائی سے وعدہ کیا تھا، جا کر کھڑا رہا۔ پہر رات گئے، محل کا دروازہ کھلا اور ملکہ، میلے کچیلے کپڑے پہنے
ایک پیٹی جواہر کی لیے، باہر نکلی۔ وہ پٹاری میرے حوالے کی اور ساتھ چلی۔ صبح ہوتے، کنارے دریا کے،
ہم پہنچے۔ ایک لغبوت پہ سوار ہو کر، جہاز میں جا اُترے۔ یہ وفادار کتا بھی ساتھ تھا۔ جب صبح خوب
روشن ہوئی لنگر اُٹھایا اور روانہ ہوئے۔ بہ خاطر جمع، چلے جاتے تھے۔ ایک بندر سے آواز، توپوں کی
شلک کی آئی۔ سب حیران اور فکر مند ہوئے۔ جہاز کو لنگر کیا اور آپس میں چرچا ہونے لگا کہ "کیا شاہ بندر

کچھ دعا کرے گا؟ توپ چھوڑنے کا کیا سبب ہے؟

"اتفاقاً، سب سوداگروں کے پاس، خوبصورت لونڈیاں تھیں۔ شاہ بندر کے خوف سے کہ مبادا چھین لے، سب نے کنیزوں کو، صندوقوں میں بند کیا۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا کہ اپنی شہزادی کو، صندوق میں بٹھا کر، قفل کر دیا۔ اس عرصے میں شاہ بندر، ایک غراب پر، مع نوکر چاکر، بیٹھا ہوا نظر آیا۔ آتے آتے جہاز پر آ چڑھا۔ شاید، اُس کے آنے کا یہ سبب تھا کہ بادشاہ کو دائی کے مرنے کی، اور ملکہ کے غائب ہونے کی، جب خبر معلوم ہوئی، مارے غیرت کے اس کا تو نام نہ لیا، مگر بادشاہ بندر کو حکم کیا کہ 'میں نے سنا ہے عجمی سوداگروں کے پاس لونڈیاں خوب خوب ہیں۔ سو میں شہزادی کے واسطے، لیا چاہتا ہوں۔ تم اُن کو روک کر، جتنی لونڈیاں جہاز میں ہوں، حضور میں حاضر کرو گے۔ انہیں دیکھ کر جو پسند آویں گی، ان کی قیمت دی جائے گی۔ نہیں تو واپس ہوں گی۔'

"بہ موجب حکم بادشاہ کے، یہ شاہ بندر، اس لئے آپ جہاز پر آیا اور میرے نزدیک ایک اور شخص تھا، اُس کے پاس بھی ایک باندی، قبول صورت، صندوق میں بند تھی۔ شاہ بندر اُسی صندوق پر آکر بیٹھا اور لونڈیوں کو نکلوانے لگا۔ میں نے خدا کا شکر کیا کہ بھلا بادشاہ زادی کا مذکور نہیں۔ غرض جتنی لونڈیاں پائیں، شاہ بندر کے آدمیوں نے ناؤ پر چڑھائیں اور خود شاہ بندر جس صندوق پر بیٹھا تھا، اُس کے مالک سے بھی ہنستے ہنستے پوچھا کہ تیرے پاس بھی تو لونڈی تھی۔ اُس احمق نے کہا 'آپ کے قدموں کی سوگند، میں نے ہی یہ کام نہیں کیا، سبھوں نے، تمہارے ڈر سے، لونڈیاں صندوقوں میں چھپائیں ہیں۔' شاہ بندر نے یہ بات سن کر، سب صندوقوں کا، جھاڑ لینا شروع کیا۔ میرا بھی صندوق کھولا اور ملکہ کو نکال کر سب کے ساتھ لے گیا۔ عجب طرح کی مایوسی ہوئی کہ یہ ایسی حرکت پیش آئی کہ تیری جان تو منت گئی اور ملکہ سے دیکھئے کیا سلوک کرے۔

"اُس کی فکر میں اپنی بھی جان کا ڈر بھول گیا۔ سارے دن رات، خدا سے دعائیں مانگتا رہا۔ جب بڑی فجر ہوئی، سب لونڈیوں کو کشتی پر سوار کر کے لاتے۔ سوداگر خوش ہوئے۔ اپنی اپنی کنیزکیں لیں۔ سب آئیں مگر ایک ملکہ ان میں نہ تھی۔ میں نے پوچھا کہ 'میری لونڈی نہیں آئی۔ اس کا کیا سبب ہے؟' انہوں نے جواب دیا کہ ہم واقف نہیں۔ شاید بادشاہ نے پسند کی ہوگی۔ سب سوداگر مجھے تسلی اور دلاسا دینے لگے کہ 'خیر، جو ہوا سو ہوا، تو کڑھ مت۔ اس کی قیمت ہم سب بہری کر کر، تجھے دیں گے۔' میرے حواس باختہ ہو گئے۔ میں نے کہا کہ اب میں عجم نہیں جانے کا۔ کشتی والوں سے کہا 'یارو! مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ کنارے پر اتار دیجیو۔' وے راضی ہوئے۔ میں جہاز سے اتر کر غراب میں آ بیٹھا

یہ کتا بھی میرے ساتھ چلا آیا۔

"جب بندر میں پہنچا، ایک صندوقچہ جواہر کا جو ملکہ اپنے ساتھ لائی تھی، اُسے تو رکھ لیا اور سب اسباب شاہ بندر کے لوگوں کو دیا۔ اور میں جاسوسی میں ہر کہیں پھرنے لگا کہ شاید خبر ملکہ کی پاؤں، لیکن ہرگز سراغ نہ ملا اور نہ اس بات کا پتہ پایا۔ ایک رات کو کسی مکر سے، بادشاہ کے محل میں بھی گیا اور ڈھونڈا۔ کچھ خبر نہ ملی۔ قریب ایک مہینے کے، شہر کے کوچے اور محلّے چھان مارے اور اس غم سے، اپنے تئیں قریب ہلاکت کے پہنچایا اور سودائی سا پھرنے لگا۔ آخر اپنے دل میں خیال کیا کہ غالب ہے، شاہ بندر کے گھر میں میری بادشاہ زادی ہووے تو ہووے، نہیں تو اور کہیں نہیں۔ شاہ بندر کی حویلی کے گرد پیش دیکھتا پھرتا تھا کہ کہیں سے بھی، جانے کی راہ پاؤں تو اندر جاؤں۔

"ایک بدر نظر پڑی، کہ موافق آدمی کی آمد و رفت کے، ہے۔ مگر جالی آہنی، اُس کے دہانے پر جڑی ہے۔ یہ قصد کیا کہ اس بدرو کی راہ سے چلوں۔ کپڑے بدن سے اتارے اور اس نجس کیچڑ میں اترا ہزار محنت سے اُس جالی کو توڑا اور اس سنڈاس کی راہ سے، چور محل میں گیا۔ عورتوں کا سا لباس بنا کر ہر طرف دیکھنے بھالنے لگا۔ ایک مکان سے آواز میرے کان میں پڑی جیسے کوئی مناجات کر رہا ہے آگے جا کر دیکھوں تو ملکہ ہے کہ عجب حالت سے روتی ہے اور نک گھسنی کر رہی ہے اور خدا سے دعا مانگتی ہے کہ 'صدقے! اپنے رسولؐ کے، اور اس کی آلِ پاک کے، مجھے اس کفرستان سے نجات دے اور جس شخص نے مجھے اسلام کی راہ بتائی ہے، اُس سے ایک بار خیریت سے ملا!' میں دیکھتے ہی، دوڑ کر پاؤں پر گر پڑا۔ ملکہ نے مجھے گلے لگا لیا۔ ہم دونوں پر ایک دم بے ہوشی کا عالم ہو گیا۔ جب حواس بجا ہوئے، میں نے کیفیت ملکہ سے پوچھی۔ بولی 'جب شاہ بندر سب لونڈیوں کو کنارے پر لے گیا۔ میں خدا سے یہی دعا مانگتی تھی کہ کہیں میرا راز فاش نہ ہو اور میں پہچانی نہ جاؤں اور تیری جان پر آفت نہ آوے۔ وہ ایسا ستار ہے کہ ہرگز کسو نے نہ دریافت کیا کہ یہ ملکہ ہے۔ شاہ بندر، ہر ایک کو بہ نظر خریداری دیکھتا تھا۔ جب میری باری ہوئی مجھے پسند کر کے، اپنے گھر میں چپکے بھیج دیا۔ اور دن کو بادشاہ کے حضور میں گزرانا۔ میرے باپ نے، جب اُن میں مجھے نہ دیکھا سب کو رخصت کیا۔ یہ سب پرپنچ میرے واسطے کیا تھا۔ اب یوں مشہور کیا ہے کہ بادشاہ زادی بہت سخت بیمار ہے۔ اگر میں ظاہر نہ ہوئی تو کوئی دن میں، میرے مرنے کی خبر، سارے ملک میں اُڑے گی تو بدنامی بادشاہ کی نہ ہووے۔ لیکن اب میں اس عذاب میں ہوں کہ شاہ بندر، مجھ سے اور ارادہ دل میں رکھتا ہے اور ہمیشہ ساتھ سونے کو بلاتا ہے۔ میں راضی نہیں ہوتی۔ از بسکہ چاہتا ہے، اب تک میری رضامندی منظور ہے۔ لہٰذا چپ ہو رہتا ہے۔ پر حیران

ہوں، اس طرح کہاں تک نبھے گی۔ سو میں نے بھی جی میں یہ ٹھہرایا ہے کہ جب مجھ سے، کچھ اور قصد کرے گا تو میں اپنی جان دوں گی اور مر رہوں گی۔ لیکن تیرے ملنے سے ایک اور تدبیر دل میں سوجھی ہے۔ خدا چاہے تو سوائے اس فکر کے، دوسری کوئی طرح، مخلصی کی، نظر نہیں آتی"۔

"میں نے کہا "فرماؤ تو، وہ کون سی تدبیر ہے"؟ کہنے لگی" اگر تو سعی اور محنت کرے، تو ہو سکے"۔ میں نے کہا "میں فرماں بردار ہوں۔ اگر حکم کرو تو جلتی آگ میں کود پڑوں، اور سیڑھی پاؤں تو تمہاری خاطر آسمان پر چلا جاؤں۔ جو کچھ فرماؤ، سو بجا لاؤں"۔ ملکہ نے کہا "تو، بڑے بت کے بت خانے میں جا، اور جس جگہ جوتیاں اتارتے ہیں، وہاں ایک سیاہ ٹاٹ پڑا رہتا ہے۔ اس ملک کی رسم ہے کہ جو کوئی مفلس اور محتاج ہو جاتا ہے، اُس جگہ، وہ ٹاٹ اوڑھ کر، بیٹھتا ہے۔ یہاں کے لوگ جو زیارت کو جاتے ہیں، موافق اپنے اپنے مقدور کے، اُسے دیتے ہیں۔ جب دو چار دن میں مال جمع ہوتا ہے، پنڈے، ایک خلعت۔ بڑے بت کی سرکار سے دے کر، اُسے رخصت کرتے ہیں۔ وہ تونگر ہو کر چلا جاتا ہے۔ کوئی نہیں معلوم کرتا کہ یہ کون تھا۔ تو بھی جا کر، اُس پلاس کے نیچے بیٹھ، اور ہاتھ منہ اپنا خوب طرح چھپا لے، اور کسو سے نہ بول۔ بعد تین دن کے، بامن اور بت پرست، ہر چند تجھے خلعت دے کر رخصت کریں تو وہاں سے ہرگز نہ اُٹھ۔ جب نہایت منت کریں تب تو بولیو کہ "مجھے روپیہ پیسہ کچھ درکار نہیں، میں مال کا بھوکا نہیں، میں مظلوم ہوں، فریاد کو آیا ہوں۔ اگر برہمنوں کی ماتا میری داد دے، تو بہتر، نہیں، بڑا بت میرا انصاف کرے گا اور اس ظالم سے یہی بڑا بت میری فریاد کو پہنچے گا"۔ جب تک وہ ماں باہمنوں کی، آپ تیرے پاس نہ آوے، بہتیرا کوئی منا دے، تو راضی نہ ہوجیو۔ آخر لاچار ہو کر، وہ خود تیرے نزدیک آوے گی۔ وہ بہت بوڑھی ہے۔ دو سو چالیس برس کی عمر ہے اور چھتیس بیٹے اس کے جنے ہوئے بت خانے کے سردار ہیں اور اس کا، بڑے بت کے پاس، بڑا درجہ ہے۔ اس سبب، اُس کا اتنا بڑا حکم ہے کہ جتنے چھوٹے بڑے اس ملک کے ہیں اس کے کہنے کو اپنی سعادت جانتے ہیں۔ جو وہ فرماتی ہے، بسر و چشم مانتے ہیں۔ اس کا دامن پکڑ کر کہیو "اے مائی! اگر مجھ مظلوم مسافر کا انصاف ظالم سے نہ کرے گی، تو میں بڑے بت کی خدمت میں ٹکریں ماروں گا۔ آخر وہ رحم کھا کر، تجھ سے میری سفارش کرے گا"۔ اس کے بعد وہ برہمنوں کی ماتا، جب تیرا سب احوال پوچھے تو کہیو کہ "میں عجم کا رہنے والا ہوں۔ بڑے بت کی زیارت کی خاطر اور تمہاری عدالت سن کر، کالے کوسوں سے یہاں آیا ہوں۔ کئی دنوں آرام سے رہا۔ میری بی بی بھی میرے ساتھ آئی تھی وہ جوان ہے اور صورت شکل بھی اچھی ہے اور آنکھ ناک سے درست ہے معلوم نہیں کہ شاہ بندر نے اُسے کیوں کر دیکھا، بہ زور مجھ سے چھین کر اپنے گھر میں ڈال دیا اور ہم مسلمانوں کا یہ قاعدہ ہے

کہ جو نامحرم، عورت کو ان کی، دیکھے یا چھین لے تو واجب ہے کہ اُس کو، جس طرح ہو مار ڈالیں، اور اپنی جورو کو لے لیں۔ اور نہیں تو، کھانا پینا چھوڑ دیں۔ کیونکہ جب تک وہ جیتا رہے، وہ عورت خاوند پر حرام ہے۔ اب یہاں لاچار ہو کر آیا ہوں۔ دیکھیے، تم کیا انصاف کرتی ہو!" جب ملکہ نے مجھے، یہ سب سکھا پڑھا دیا، میں رخصت ہو، اُسی تابدان کی راہ سے نکلا اور وہ جالی آہنی پھر لگا دی۔

"صبح ہوتے بت خانے میں گیا اور وہ سیاہ پلاس اوڑھ کر بیٹھا۔ تین روز میں اتنا روپیہ اور اشرفی، اور کپڑا میرے نزدیک جمع ہوا کہ انبار لگ گیا۔ چوتھے روز پنڈے بھجن کرتے اور گاتے بجاتے، خلعت لیے، میرے پاس آتے اور رخصت کرنے لگے۔ میں راضی نہ ہوا اور دہائی بڑے بت کی دی کہ میں گدائی نہیں کرتے آیا بلکہ انصاف کے لیے بڑے بت اور برہمنوں کی ماتا کے پاس آیا ہوں۔ جب تک اپنی داد نہ پاؤں گا، یہاں سے نہ جاؤں گا۔ وے سن کر، اُس پیرزال کے روبرو گئے اور میرا احوال بیان کیا۔ بعد اُس کے، ایک چوبے آیا اور میرے تئیں کہنے لگا کہ "چل ماتا بلاتی ہے۔" میں دو نہلیں ٹاٹ کا لا، سر سے پاؤں تک اوڑھے ہوئے، دھرے میں گیا۔ دیکھتا ہوں کہ ایک جڑاؤ سنگھاسن پر، جس میں لعل الماس اور موتی مونگا لگا ہوا ہے بڑا بت بیٹھا ہے اور ایک کرسی زرین پر فرش معقول بچھا ہے، اس پر ایک بڑھیا سیاہ پوش، مسند تکیے لگائے اور دو لڑکے، دس بارہ برس کے، ایک داہنے، ایک بائیں، شان و شوکت اور تجمل سے بیٹھی ہے مجھے آگے بلایا۔ میں ادب سے آگے گیا اور تخت کے پائے کو بوسہ دیا، پھر اُس کا دامن پکڑ لیا۔ اُس نے میرا احوال پوچھا، میں نے اُسی طرح جس طور سے ملکہ نے تعلیم کر دیا تھا ظاہر کیا۔

"سن کر بولی کہ کیا مسلمان اپنی استریوں کو ادھجل میں رکھتے ہیں؟ میں نے کہا 'ہاں تمہارے بچوں کی خیر ہو' یہ ہماری رسمِ قدیم ہے۔ بولی کہ 'تیرا اچھا مذہب ہے۔ میں ابھی حکم کرتی ہوں کہ شاہ بندر، بمعہ تیری جورو، آن کر حاضر ہوتا ہے۔ اور اس گیدی کو ایسی سیاست کروں کہ بار دیگر ایسی حرکت نہ کرے اور سب کے کان کھڑے ہوں اور ڈریں۔' اپنے لوگوں سے پوچھنے لگی کہ 'شاہ بندر کون ہے؟ اس کی یہ مجال ہوئی کہ بگانی تریا کو بہ زور چھین لیتا ہے؟' لوگوں نے کہا کہ فلانا شخص ہے۔ یہ سن کر، ان دونوں لڑکوں کو (جو پاس بیٹھے تھے) فرمایا کہ 'جلدی، اس مالش کو ساتھ لے کر، بادشاہ کے پاس جاؤ اور کہو کہ ماتا فرماتی ہے کہ حکم بڑے بت کا یہ ہے کہ شاہ بندر آدمیوں پر زور زیادتی کرتا ہے چنانچہ اس غریب کی عورت کو چھین لیا ہے۔ اس کی تقصیر بڑی ثابت ہوئی۔ جلد اُس گمراہ کے مال کا تالیقہ کر کر، اس ترک کے (کہ ہمارا منظورِ نظر ہے) حوالے کر۔ نہیں تو آج رات کو، ستیاناس ہو گا اور ہمارے غضب میں پڑے گا۔' وے دونوں طفل، اُٹھ کر منڈل سے باہر آئے اور سوار ہوئے۔ سب پنڈے سنکھ بجاتے اور آرتی گاتے

جلو میں ہو لئے۔

"غرض، وہاں کے بڑے چھوٹے، جہاں ان لڑکوں کا پاؤں پڑ تا تھا، وہاں کی مٹی تبرک جان کر اٹھا لیتے۔ اور آنکھوں سے لگاتے۔ اُسی طرح بادشاہ کے قلعے تک گئے۔ بادشاہ کو خبر ہوئی۔ ننگے پاؤں استقبال کی خاطر نکل آیا، اور ان کو بڑے مان مہت سے لے جا کر، اپنے پاس تخت پر بٹھایا اور پوچھا 'آج کیونکر تشریف فرما ہوا'؟ ان دونوں برہمن بچوں نے، ماں کی طرف سے جو کچھ سن آئے تھے، کہا اور بڑے بت کی خفگی سے ڈرایا۔

"بادشاہ نے سنتے ہی فرمایا 'بہت خوب!' اور اپنے نوکروں کو حکم کیا کہ محصل جا دیں اور شاہ بندر کو معہ اُس عورت کے، جلد حضور میں حاضر کریں تو میں، تقصیر اس کی تجویز کر کے، سزا دوں'۔ یہ سُن کر میں اپنے دل میں گھبرایا کہ بات تو اچھی نہ ہوئی۔ اگر شاہ بندر کے ساتھ ملکہ کو بھی لا دیں تو پردہ فاش ہوگا اور میرا کیا احوال ہوگا؟ دل میں نہایت خوف زدہ ہو کر خدا کی طرف رجوع کی۔ لیکن میرے منہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں، اور بدن کانپنے لگا۔ لڑکوں نے یہ میرا رنگ دیکھ، شاید دریافت کیا کہ یہ حکم اس کی مرضی کے موافق نہ ہوا۔ دونہیں خفا و برہم ہو کر اُٹھے، اور بادشاہ کو جھڑک کر بولے 'اے مردک! تو دیوانہ ہوا ہے جو فرماں برداری سے بڑے بت کی نکلا اور ہمارے بچن کو جھوٹ سمجھا، جو دونوں کو بلا کر تحقیق کیا چاہتا ہے؟ اب خبردار، تو غضب میں بڑے بت کے پڑا۔ ہم نے تجھے حکم پہنچا دیا۔ اب تو جان اور بڑا بت جانے'!

"اس کے کہنے سے، بادشاہ کی عجب حالت ہوئی کہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور سر سے پاؤں تلک رعشہ ہو گیا۔ منت کر کے منانے لگا، یہ دونوں ہرگز نہ بیٹھے لیکن کھڑے رہے۔ اس میں جتنے امیر اُمرا وہاں حاضر تھے، ایک منہ ہو کر، بدگوئی شاہ بندر کی، کرنے لگے کہ 'وہ ایسا ہی حرام زادہ، بدکار اور پاپی ہے ایسی ایسی حرکتیں کرتا ہے کہ حضور میں بادشاہ کے کیا کیا عرض کریں! جو کچھ برہمنوں کی ماتا نے کہلا بھیجا ہے درست ہے۔ اس واسطے کہ حکم بڑے بت کا ہے، یہ دروغ کیونکر ہوگا'؟ بادشاہ نے جب سب کی زبانی ایک ہی بات سنی، اپنے کہنے سے بہت خجل اور نادم ہوا۔ جلد ایک خلعت پاکیزہ مجھے دی اور حکم نامہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر، اس پر دستی مہر کر کر، میرے حوالے کیا۔ اور ایک رقعہ مادر برہمناں کو لکھا اور جواہر اشرفیوں کے خوان، لڑکوں کے روبرو پیشکش رکھ کر، رخصت کیا۔ میں خوشی بہ خوشی بت خانے میں آیا اور اس بڑھیا کے پاس گیا۔

"بادشاہ کا خط جو آیا تھا، اُس کا یہ مضمون تھا۔ القاب کے بعد بندگی، عجز و نیاز لکھ کر لکھا تھا

کہ موافق حکم حضور کے، اس مردِ مسلمان کو، خدمت شاہ بندر کی مقرر ہوئی اور خلعت دی گئی۔ اب یہ اُس کے قتل کرنے کا مختار ہے۔ اور سارا مال و اموال اُس کا، اس ترک کا ہوا۔ جو چاہے سو کرے امیدوار ہوں کہ میری تقصیر معاف ہو۔ برہمنوں کی ماں نے خوش ہو کر فرمایا کہ نوبت خانے میں، بت خانے کی نوبت بجے۔ اور پانچ سو سپاہی، برقنداز، جو بال باندھی کوڑی ماریں، مسلح میرے ہمراہ کر دیئے۔ اور حکم کیا کہ، بندر میں جا کر، شاہ بندر کو دستگیر کر کے، اس مسلمان کے حوالے کریں۔ جس طرح کے عذاب سے اس کا جی چاہے، اُسے مارے۔ اور خبردار، سوائے اس عزیز کے کوئی محل سرا میں داخل نہ ہووے اور اس کے مال و خزانے کو، امانت اُس کی، سپرد کریں۔ جب یہ بہ خوشی رخصت کرے، ارسید اور ہمانی نامہ اُس سے لے کر، پھر آویں۔ اور ایک سری پاؤ، بت بزرگ کی سرکار سے میرے تئیں دے کر، سوار کرا کر، وداع کیا۔

"جب میں بندر میں پہنچا، ایک آدمی نے بڑھ کر، شاہ بندر کو خبر کی۔ وہ حیران سا بیٹھا تھا کہ میں جا پہنچا۔ غصّہ تو دل میں بھر ہی رہا تھا، دیکھتے ہی شاہ بندر کو، تلوار کھینچ کر ایسی گردن میں لگائی کہ اس کا سر، الگ بھٹا سا، اُڑ گیا۔ اور وہاں کے گماشتے، خزانچی، مشرف، داروغوں کو پکڑوا کر، سب دفتر ضبط کئے، اور میں محل میں داخل ہوا۔ ملکہ سے ملاقات کی، آپس میں گلے لگ کر روئے اور شکر خدا کا کیا۔ میں نے اُس کے، اُس نے میرے، آنسو پونچھے۔ پھر باہر مسند پر بیٹھ کر، اہل کاروں کو خلعتیں دیں اور اپنی اپنی خدمتوں پر سب کو بحال کیا۔ نوکر اور غلاموں کو سرفرازی دی۔ وہ لوگ جو مندپ سے میرے ساتھ متعین ہوئے تھے، ہر ایک، کو انعام و بخشش دے کر اور اُن کے جمعدار، رسالہ دار کو جوڑے پہنا کر رخصت کیا اور جواہر بیش قیمت، اور تھان نور بافی اور شال بافی اور زردوزی، اور جنس و تحفے ہر ایک ملک کے، اور نقد بہت سا، پادشاہ کی نذر کی خاطر، اور موافق ہر ایک امراؤں کے درجہ بہ درجہ اور پنڈ یاین کے لئے، اور سب پنڈوں کے تقسیم کرنے کی خاطر، اپنے ساتھ لے کر، بعد ایک ہفتے کے میں بت کدے میں آیا اور اُس ماتا کے آگے، بہ طریق بھینٹ کے، رکھا۔

"اُس نے ایک اور خلعت سرفرازی کی مجھے بخشی اور خطاب دیا۔ پھر بادشاہ کے دربار میں جا کر پیشکش گزرانی اور جو ظلم و فساد، شاہ بندر نے ایجاد کیا تھا، اُس کے موقوف کرنے کی خاطر عرض کی، اس سبب سے بادشاہ اور امیر سوداگر، سب مجھ سے راضی ہوئے۔ بہت نوازش مجھ پر فرمائی۔ اور خلعت اور گھوڑا دے کر، منصب جاگیر عطا کی اور آبرو و حرمت بخشی۔ جب پادشاہ کے حضور سے باہر آیا، شاگرد پیشوں کو اور اہل کاروں کو، اتنا کچھ دے کر راضی کیا کہ سب میرا کلمہ پڑھنے لگے۔ غرض، میں

بہت مرفہ الحال ہو گیا اور نہایت آرام و چین سے، اس ملک میں، ملکہ سے عقد باندھ کر رہنے لگا اور خدا کی بندگی کرنے لگا۔ میرے انصاف کے باعث، رعیت پرجا، سب خوش تھے۔ مہینے میں ایک بار، بت خانے میں اور پادشاہ کے حضور آنا جاتا۔ پادشاہ روز بروز زیادہ سرفرازی فرماتا۔

"آخر مصاحبت میں مجھے داخل کیا۔ میری بے صلاح، کوئی کام نہ کرتا۔ نہایت بے فکری سے زندگی گزرنے لگی۔ مگر خدا ہی جانتا ہے، اکثر اندیشہ ان دونوں بھائیوں کا دل میں آتا کہ وے کہاں ہوں گے اور کس طرح ہوں گے۔ بعد مدت دو برس کے، ایک قافلہ سوداگروں کا، ملک زیر باد سے، اُس بندر میں آیا۔ وے سب قصد عجم کا رکھتے تھے، انہوں نے یہ چاہا کہ دریا کی راہ سے اپنے ملک کو جاویں۔ وہاں کا یہ قاعدہ تھا کہ جو کاروان آتا، اُس کا سردار، سوغات و تحفہ ہر ایک ملک کا، میرے پاس لاتا اور نذر گزرانتا دوسرے روز، میں اُس کے مکان پر جاتا۔ وہ بھی، بہ طریق محصول کے، اُس کے مال سے، لیتا اور پروانگی کوچ کی دیتا۔ اسی طرح، وہ سوداگر زیر باد کے بھی، میری ملاقات کو آتے اور بے بہا پیش کش لاتے۔ دوسرے دن میں اُن کے خیمے میں گیا۔ دیکھا تو، دو آدمی پھٹے پُرانے کپڑے پہنے، گٹھری بقچے سر پر اٹھا کر میرے روبرو لاتے ہیں، بعد ملاحظہ کرنے کے، پھر اُٹھا لے جاتے ہیں اور بڑی محنت اور خدمت کر رہے ہیں

"میں نے خوب بجھا کر جو دیکھا تو یہی دونوں میرے بھائی ہیں۔ اس وقت غیرت اور حمیت نے نہ چاہا کہ ان کو اس طرح خدمت گاری میں دیکھوں۔ جب اپنے گھر کو چلا آدمیوں کو کہا کہ "ان دونوں شخصوں کو لیتے آؤ۔" ان کو لائے۔ پھر لباس اور پوشاک بنوا دی اور اپنے پاس رکھا۔ ان بد ذاتوں نے، پھر میرے مارنے کا منصوبہ کر کر، ایک روز آدھی رات میں، سب کو غافل پا کر چوٹوں کی طرح میرے سرہانے آ پہنچے۔ میں نے اپنی جان کے ڈر سے، چوکی داروں کو دروازے پر رکھا تھا اور یہ کتا وفادار، میری چارپائی کی پٹی تلے، سوتا تھا۔ جوں انہوں نے تلواریں میان سے کھینچیں، پہلے کتے نے بھونک کر ان پر حملہ کیا۔ اُس آواز سے سب جاگ پڑے۔ میں بھی بلبلا کر چونکا۔ آدمیوں نے ان کو پکڑا، معلوم ہوا کہ آپ ہی ہیں۔ سب لعنتیں دینے لگے کہ باوجود اس خاطر داری کے، یہ کیا حرکت ان سے ظہور میں آئی۔

"بادشاہ سلامت! تب تو میں بھی ڈرا، مثل مشہور ہے: ۔ ایک خطا دو خطا، تیسری خطا، مادر بخطا۔ دل میں یہی صلاح ٹھہری کہ اب ان کو مقید کروں، لیکن اگر بندی خانے میں رکھوں تو ان کا کون خبر گیراں رہے گا؟ بھوک پیاس سے مر جائیں گے یا کوئی اور سوانگ لائیں گے۔ اس واسطے قفس میں رکھا ہے کہ ہمیشہ میری نظروں کے تلے رہیں تو بہ[illegible] ۔ مبادا آنکھوں سے [illegible] جمع ہو کر کچھ اور

کریں۔ اور اُس کتے کی عزت اور حرمت، اُس کی نمک حلالی اور وفاداری کا سبب ہے سبحان اللہ! آدمی بے وفا، بدتر حیوان باوفا سے ہے۔ میری یہ سرگزشت تھی جو حضور میں عرض کی۔ اب خواہ قتل فرمائیے یا جان بخشی کیجیے، حکم بادشاہ کا ہے۔"

میں نے سن کر، اُس جوان باایمان پر آفرین کی اور کہا "تیری مروّت میں کچھ خلل نہیں، اور ان کی بے حیائی اور حرام زدگی میں ہرگز قصور نہیں۔ سچ ہے، کتے کی دم کو بارہ برس گاڑو، تو بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہے۔" اُس کے بعد میں نے، حقیقت ان بارہ لعل کی، کہ اُس کتے کے پٹے میں تھے، پوچھی خواجہ بولا کہ "بادشاہ کی، صد وبیست سال کی عمر ہو! اُسی بندر میں جہاں میں حاکم تھا، بعد تین چار سال کے، ایک روز بالاخانے پر (محل کے، کہ بلند تھا) واسطے سیر اور تماشے، دریا اور صحرا کے، میں بیٹھا تھا اور ہر طرف دیکھتا تھا۔ ناگاہ ایک طرف جنگل میں کہ وہاں شاہراہ نہ تھی، دو آدمی کی تصویر سی نظر آئی کہ چلے جاتے ہیں۔ دوربین لے کر دیکھا تو عجب ہیئت کے انسان دکھائی دیے۔ چوب دار دوں کو اُن کے بلانے کے واسطے دوڑایا۔

"جب وے آئے معلوم ہوا کہ ایک عورت اور ایک مرد ہے۔ رنڈی کو محل سرا میں ملکہ کے پاس بھیج دیا اور مرد کو روبرو بلایا۔ دیکھا تو ایک جوان، برس بیس بائیس کا، داڑھی مونچھ آغاز ہے۔ لیکن دھوپ کی گرمی سے اُس کے چہرے کا رنگ، کالے توے کا سا ہو رہا ہے۔ اور سر کے بال، اور ہاتھوں کے ناخن بڑھ کر بن مانس کی صورت بن رہا ہے۔ اور ایک لڑکا، برس تین چار ایک کا کاندھے پر، اور دو آستینیں کرتے کی بھری ہوئی، ہیکل کی طرح گلے میں ڈالے۔ عجب صورت اور عجب وضع اس کی دیکھی۔ میں نے نہایت حیران ہو کر پوچھا "اے عزیز! تو کون ہے اور کس ملک کا باشندہ ہے اور یہ کیا تیری حالت ہے؟" وہ جوان بے اختیار رونے لگا اور وہ ہمیانی کھول کر میرے آگے زمین پر رکھی اور بولا "الجوع، الجوع! واسطے خدا کے کچھ کھانے کو دو۔ مدت سے گھاس اور بناس پتیاں کھاتا چلا آتا ہوں۔ ایک ذرا قوت مجھ میں باقی نہیں رہی۔" وونہیں نان وکباب اور شراب میں نے منگوا دی۔ وہ کھانے لگا

"اتنے میں خواجہ سرا، محل سے کئی تھیلیاں اور، اس کے تھیلے کے پاس سے، لے آیا۔ میں نے ان سب کو کھلوایا۔ ہر ایک قسم کے جواہر دیکھے، کہ ایک ایک دانہ ان کا، خراجِ سلطنت کا، کہا چاہیے ایک سے ایک انمول، ڈول میں اور تول میں، اور آبداری میں۔ اور ان کی چھوٹ پڑنے سے سارا مکان بوقلموں ہو گیا۔ جب اس نے ٹکڑا کھایا اور ایک جام دارو کا، پیا، اور دم لیا، حواس بجا ہوئے۔ تب میں

نے پوچھا 'یہ تھپڑ تجھے کہاں ہاتھ لگے'؟ جواب دیا کہ 'میرا وطن ولایت آذربائیجان ہے۔ لڑکپن میں گھر بار، ماں باپ سے جدا ہو کر، بہت سختیاں کھینچیں۔ اور ایک مدت تلک، زندہ درگور تھا اور کئی بار ملک الموت کے پنجے سے بچا ہوں۔ میں نے کہا 'اے مردِ آدمی! مفصل کہہ تو معلوم ہو'۔ تب وہ اپنا احوال بیان کرنے لگا کہ 'میرا باپ سوداگر پیشہ تھا۔ ہمیشہ سفر ہندوستان و روم و چین و خطا و فرنگ کا، کرتا۔ جب میں دس برس کا ہوا، باپ ہندوستان کو چلا۔ مجھے اپنے ساتھ لے جانے کو چاہا۔ ہر چند والدہ نے، اور خالہ ممانی، پھوپھی نے کہا کہ "ابھی یہ لڑکا ہے، لائق سفر کے نہیں ہوا،" والد نے نہ مانا اور کہا کہ 'میں بوڑھا ہوا، اگر یہ میرے روبرو تربیت نہ ہوگا تو یہ حسرت گور میں لے جاؤں گا۔ مرد بچہ ہے، اب نہ سیکھے گا تو کب سیکھے گا؟"

" یہ کہہ کر، مجھے خواہ مخواہ ساتھ لیا اور روانہ ہوا۔ خیر و عافیت سے راہ کٹی۔ جب ہندوستان میں پہنچے کچھ جنس وہاں بیچی۔ اور وہاں کے سوغات لے کر زیرباد کے ملک کو گئے۔ یہ بھی سفر ہوا۔ وہاں سے بھی، خرید و فروخت کر کے جہاز پر سوار ہوئے کہ جلد وطن میں پہنچیں۔ بعد ایک مہینے کے، ایک روز آندھی اور طوفان آیا اور مینہ موسلا دھار برسنے لگا۔ سارا زمین و آسمان دھواں دھار ہو گیا اور پتوار جہاز کی ٹوٹ گئی۔ معلم، ناخدا سر پیٹنے لگے۔ دس دن تلک، ہوا اور موج، جیدھر چاہتی تھی، لئے جاتی تھی۔ گیارہویں روز ایک پہاڑ سے ٹکر کھا کے، جہاز پرزے پرزے ہو گیا۔ نہ معلوم ہوا کہ باپ اور نوکر چاکر اور اسباب کہاں گیا؟

" میں نے اپنے تئیں ایک تختے پر دیکھا۔ سہ شبانہ روز، وہ بیڑا بے اختیار چلا گیا۔ چوتھے دن کنارے پر جا لگا۔ مجھ میں فقط جان باقی تھی۔ اس پر سے اتر کر، گھٹنیوں چل کر، بارے کسو نہ کسو طرح، زمین پر پہنچا۔ دور سے کھیت نظر آئے اور بہت سے آدمی وہاں جمع تھے لیکن سب سیاہ فام اور ننگے مادرزاد مجھ سے کچھ بولے۔ لیکن میں نے ان کی زبان مطلق نہ سمجھی۔ وہ کھیت چنوں کا تھا۔ وہ آدمی، آگ کا الاؤ جلا کر بوٹوں کے ہولے کرتے تھے، اور کھاتے تھے۔ اور کئی ایک گھر بھی وہاں نظر آئے۔ شاید ان کی خوراک یہی تھی اور وہیں بستے تھے۔ مجھے بھی اشارت کرنے لگے کہ تو بھی کھا۔ میں نے بھی ایک مٹھی اکھاڑ کر، بھونے اور کھانے لگا۔ تھوڑا سا پانی پی کر، ایک گوشے میں سو رہا۔

" بعد دیر کے جب جاگا، ان میں سے ایک شخص میرے نزدیک آیا اور راہ دکھانے لگا۔ میں نے تھوڑے سے چنے اکھیڑ لئے اور اس راہ پر چلا۔ ایک کف دست میدان تھا، گویا صحرائے قیامت کا نمونہ کہا چاہیئے۔ یہی بوٹ کھاتا ہوا چلا جاتا تھا۔ بعد چار دن کے، ایک قلعہ نظر آیا۔ جب پاس گیا تو

ایک کوٹ دیکھا، بہت بلند، تمام پتھر کا، اور ہر ایک النگ اُس کی، دو دو کوس کی، اور دروازہ ایک سنگ کا تراشا ہوا، ایک قفل بڑا سا جڑا تھا لیکن وہاں انسان کا نشان نظر نہ پڑا۔ وہاں سے آگے چلا، ایک ٹیلا دیکھا کہ اس کی خاک، سرمے کے رنگ سیاہ تھی۔ جب اُس تل کے پار ہوا تو ایک شہر نظر پڑا بہت بڑا، گرد شہر پناہ اور جا بہ جا برج۔ ایک طرف شہر کے دریا تھا، بڑے پاٹ کا۔ جاتے جاتے دروازے پر گیا اور بسم اللہ کہہ کر قدم اندر رکھا۔ ایک شخص کو دیکھا، پوشاک اہل فرنگ کی پہنے ہوئے، کرسی پر بیٹھا ہے۔ جوں اُس نے مجھے اجنبی مسافر دیکھا اور میرے منہ سے بسم اللہ سنی، پکارا کہ "وہ آگے آؤ۔" میں نے جا کر سلام کیا، بہ نہایت مہربانی سے سلام کا جواب دیا، ترت میز پر، پاؤ روٹی اور مسکہ، اور مرغ کا کباب اور شراب رکھ کر کہا "پیٹ بھر کر کھاؤ۔" میں نے تھوڑا سا کھایا اور پیا اور بے خبر ہو کر سویا۔ جب رات ہو گئی، تب آنکھ کھلی۔ ہاتھ منہ دھویا۔ پھر مجھے کھانا کھلایا اور کہا کہ "اے بیٹا! اپنا احوال کہہ۔" جو کچھ مجھ پر گزرا تھا سب کہہ سنایا۔ تب بولا کہ "یہاں تو کیوں آیا؟" میں نے دق ہو کر کہا "شاید تو دیوانہ ہے، میں نے بعد مدت کی محنت کے، اب بستی کی صورت دیکھی ہے۔ خدا نے یہاں تک پہنچایا اور تو کہتا ہے کیوں آیا؟" کہنے لگا "اب تو آرام کر، کل جو کہنا ہوگا، کہوں گا۔"

"جب صبح ہوئی بولا "کوٹھڑی میں پھاوڑا اور چھلنی اور توبڑہ ہے، باہر لے آ۔" میں نے دل میں کہا کہ خدا جانے روٹی کھلا کر، کیا محنت مجھ سے کرا دے گا۔ لاچار وہ سب نکال کر، اُس کے روبرو لایا۔ تب اُس نے فرمایا کہ "اس ٹیلے پر جا اور ایک گز کے موافق گڑھا کھود۔ وہاں سے جو نکلے، اس چھلنی میں چھان۔ جو نہ چھن سکے، اُس توبڑے میں بھر کر میرے پاس لا۔" میں وہ سب چیزیں لے کر وہاں گیا اور اتنا ہی کھود کر، چھان چھون کر، توبڑے میں ڈالا۔ دیکھا تو سب جواہر رنگ برنگ کے تھے۔ ان کی جوت سے آنکھیں چوندھیا گئیں۔ اسی طرح تھیلی کو منہا منہ بھر کر، اُس عزیز کے پاس لے گیا۔ دیکھ کر بولا "جو اس میں بھرا ہے، تو لے اور یہاں سے جا کہ تیرا رہنا اس شہر میں خوب نہیں۔" میں نے جواب دیا کہ "صاحب نے، اپنی جانب میں، بڑی مہربانگی کی کہ اتنا کچھ کنکر پتھر دیا، لیکن میرے کس کام کا ہے؟ جب بھوکا ہوں گا تو ان کو چبا سکوں گا، نہ پیٹ بھرے گا۔ پس اگر اور بھی دو تو میرے کس کام آئیں گے؟" وہ مرد ہنسا اور کہنے لگا کہ "مجھ کو تجھ پر افسوس آتا ہے کہ تو بھی ہماری مانند، ملک عجم کا متوطن ہے۔ اس لئے میں منع کرتا ہوں، نہیں تو جان۔ اگر خواہ مخواہ تیرا یہی قصد ہے کہ شہر میں جاؤں، تو میری انگوٹھی لیتا جا۔ جب بازار کے چوک میں جاوے تو ایک شخص سفید ریش، وہاں بیٹھا ہوگا اور اُس کی صورت شکل مجھ سے ملتی ہے۔ میرا بڑا بھائی ہے۔ اُس کو یہ چھاپ دکھاؤ تو وہ تیری خبرگیری کرے گا اور جو کچھ وہ کہے، اسی

موافق کام کیجو، نہیں تو مفت مارا جائے گا اور میرا حکم یہیں تک ہے۔ شہر میں میرا دخل نہیں۔" تب میں نے وہ خاتم اُس سے لی اور سلام کر کے، رخصت ہوا، شہر میں گیا۔ بہت خاصہ شہر دیکھا۔ کوچہ و بازار صاف اور زن و مرد، بے حجاب آپس میں، خرید و فروخت کرتے۔ سب خوش لباس۔ میں سیر کرتا اور تماشا دیکھتا، جب چوک کے چوراہے میں پہنچا، ایسا ازدحام تھا کہ تھالی پھینکے تو آدمیوں کے سر پر چلی جائے خلقت کا یہ ٹھٹ بندھ رہا تھا کہ آدمی کو راہ چلنا مشکل تھا۔ جب کچھ بھیڑ بھاڑ چھٹی، میں بھی دھکم دھکا کرتا ہوا آگے گیا۔ بارے اس عزیز کو دیکھا کہ ایک چوکی پر بیٹھا ہے اور ایک جڑاؤ چاقو روبرو دھرا ہے۔ میں نے جا کر سلام کیا اور وہ مہر دی۔ نظر غضب سے میری طرف دیکھا اور بولا "کیوں تو یہاں آیا، اور اپنے تئیں بلا میں ڈالا؟ مگر میرے بے وقوف بھائی نے تجھے منع نہ کیا تھا؟"

"میں نے کہا" انہوں نے تو کہا لیکن میں، نہ مانا" اور تمام کیفیت اپنی ابتدا سے انتہا تک کہہ سنائی۔ وہ شخص اٹھا اور مجھے ساتھ لے کر اپنے گھر کی طرف چلا۔ اُس کا مکان، بادشاہوں کا سا دیکھنے میں آیا اور بہت سے نوکر چاکر اُس کے تھے۔ جب خلوت میں جا کر بیٹھا، بہ ملائمت بولا کہ "اے فرزند! یہ کیا تو نے حماقت کی کہ اپنے پاؤں سے گور میں آیا؟ کوئی بھی، اس کم بخت طلسماتی شہر میں آتا ہے؟" میں نے کہا "میں اپنا احوال پیشتر کہہ چکا ہوں، اب تو قسمت لے آئی۔ لیکن شفقت فرما کر یہاں کی راہ و رسم سے مطلع کیجئے تو معلوم کروں کہ اس واسطے تم نے، اور تمہارے بھائی نے، مجھے منع کیا۔" تب وہ جوان مرد بولا کہ "بادشاہ اور تمام رئیس اس شہر کے، راندھے ہوئے ہیں۔ عجب طرح کا ان کا رویہ اور مذہب ہے یہاں بت خانے میں ایک بت ہے کہ شیطان، اُس کے پیٹ میں ہے، نام اور ذات اور دین ہر کسو کا بیان کرتا ہے۔ پس جو کوئی غریب مسافر آتا ہے، بادشاہ کو اس کی خبر ہوتی ہے، اُسے مندپ میں لے جاتا ہے اور بت کو سجدہ کرواتا ہے۔ اگر ڈنڈوت کی تو بہتر، نہیں تو بچارے کو دریا میں ڈبوا دیتا ہے اگر وہ چاہے کہ دریا سے نکل کر بھاگے تو آلت اور خصیے اُس کے بڑے ہو جاتے ہیں ایسے کہ زمین میں گھسٹتے۔ ایسا طلسم اس شہر میں بنایا ہے۔ مجھ کو تیری جوانی پر رحم آتا ہے۔ مگر تیری خاطر ایک تدبیر کرتا ہوں کہ بھلا کوئی دن تو تو جیتا رہے اور اس عذاب سے بچے۔"

"میں نے پوچھا" وہ کیا صورت تجویز کی ہے؟" ارشاد ہوا۔ کہنے لگا "تجھے کتخدا کروں اور وزیر کی لڑکی تیری خاطر بیاہ لاؤں۔" میں نے جواب دیا کہ "وزیر اپنی بیٹی مجھ سے مفلس کو کب دے گا؟ مگر جب ان کا دین قبول کروں؟ سو یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔" کہنے لگا "اس شہر کی یہ رسم ہے کہ جو کوئی اس بت کو سجدہ کرے، اگر فقیر ہو اور بادشاہ کی بیٹی کو مانگے تو اُس کی خوشی کی خاطر

حوالے کریں اور اسے رنجیدہ نہ کریں اور میرا بھی پادشاہ کے نزدیک اعتبار ہے اور عزیز رکھتا ہے۔ لہٰذا سب ارکان اور اکابر یہاں کے، میری قدر کرتے ہیں۔ اور درمیان ایک ہفتے میں دو دن، بت کدے میں زیارت کو جاتے ہیں اور عبادت بجا لاتے ہیں۔ چنانچہ کل سب جمع ہوویں گے، میں تجھے لے جاؤں گا۔" یہ کہہ کر، کھلا پلا کر، سلا رکھا۔ جب صبح ہوئی، مجھے ساتھ لے کر بت خانے کی طرف چلا۔ وہاں جا کر جو دیکھا تو آدمی آتے جاتے ہیں اور پرستش کرتے ہیں۔

"پادشاہ اور امیر، بت کے سامنے پنڈتوں کے پاس، سر ننگے کیے، ادب سے دو زانو بیٹھے تھے اور ناکتخدا لڑکیاں، اور خوبصورت لڑکے، جیسے حور و پریاں، چاروں طرف صف باندھے، کھڑے تھے تب وہ عزیز مجھ سے مخاطب ہوا کہ "اب میں جو کہوں سو کر۔" میں نے قبول کیا کہ "جو فرماؤ سو بجا لاؤں۔" بولا کہ "پہلے بادشاہ کے ہاتھ پاؤں کو بوسہ دے، بعد اُس کے وزیر کا دامن پکڑ۔" میں نے ویسا ہی کیا پادشاہ نے پوچھا، کہ "یہ کون ہے اور کیا کہتا ہے؟" اُس مرد نے کہا "یہ جوان میرے رشتے میں ہے، پادشاہ کی قدم بوسی کی آرزو میں دور سے آیا ہے۔ اس توقع پر کہ وزیر اس کو اپنی غلامی سے سربلند کرے اگر حکم بت کلاں کا اور مرضی حضور کی ہووے۔" پادشاہ نے پوچھا کہ "ہمارا مذہب اور دین و آئین قبول کرے گا، تو مبارک ہے۔" وونہیں بت خانے کا نقارخانہ بجنے لگا اور بھاری خلعت مجھے پہنائی اور ایک رسی سیاہ، میرے گلے میں ڈال کر کھینچتے ہوتے، بت کی سنگھاسن کے آگے لے جا کر، سجدہ کروا کر، کھڑا کیا۔

"بت سے آواز نکلی کہ "اے خواجہ زادے! خوب ہوا کہ تو ہماری بندگی میں آیا۔ اب ہماری رحمت اور عنایت کا امیدوار رہ۔" یہ سن کر سب خلقت نے سجدہ کیا اور زمین میں لوٹنے لگے اور پکارے "دھن ہے! کیوں نہ ہو! تم ایسے ہی ٹھاکر ہو۔" جب شام ہوئی، پادشاہ اور وزیر سوار ہو کر وزیر کے محل میں داخل ہوئے اور وزیر کی بیٹی کو، اپنے طور کی ریت رسم کر کے، میرے حوالے کیا۔ اور بہت سا دان دہیز دیا اور بہت منت دار ہوئے کہ "بموجب حکم بڑے بت کے اُسے تمہاری خدمت میں دیا ہے۔" ایک مکان میں ہم دونوں کو رکھا۔ اس نازنین کو جو میں نے دیکھا، تو فی الواقع اُس کا عالم پری کا سا تھا۔ نکھ سکھ سے درست۔ جو جو خوبیاں پدمنی کی سنی جاتی ہیں سو سب اُس میں موجود تھیں بلفراغت تمام میں نے صحبت کی اور حظ اٹھایا۔ صبح کو غسل کر کے، پادشاہ کے مجرے میں حاضر ہوا۔ پادشاہ نے خلعت دامادی کی عنایت کی اور حکم فرمایا کہ ہمیشہ دربار میں حاضر رہا کرے۔ آخر کو، بعد چند روز کے پادشاہ کی مصاحبت میں داخل ہوا۔

"بادشاہ میری صحبت سے نہایت محظوظ ہوتے اور اکثر خلعت اور انعام عنایت کرتے۔ اگرچہ دنیا کے مال سے میں غنی تھا اس واسطے کہ میرے تبیلے کے پاس، اتنا نقد جنس اور جواہر تھا کہ جس کی حد و نہایت نہ تھی۔ دو سال تک بہت عیش و آرام سے گزری۔ اتفاقاً وزیرزادی کو پیٹ رہا۔ جب ستواسا ہوا، اور ان گنا مہینہ گزر کر، پورے دن ہوئے، پیریں لگیں۔ دائی جنائی آئی، تو مرا لڑکا پیٹ میں سے نکلا۔ اُس کا بس، جچا کو چڑھا، وہ بھی مر گئی۔ میں مارے غم کے دیوانہ ہو گیا کہ یہ کیا آفت ٹوٹی! اس کے سرہانے بیٹھا روتا تھا۔ ایک بارگی رونے کی آواز سارے محل میں بلند ہوئی اور چاروں طرف سے عورتیں آنے لگیں۔ جو آتی تھی ایک دوہتڑ میرے سر پر مارتی اور اپنی کُسوتوں کو نکال کر کے میرے پاس، منہ کے مقابل، کھڑی رہتی اور رونا شروع کرتی۔ اتنی رنڈیاں اکٹھی ہوئیں کہ میں، اُن کے چوتڑوں میں، چھپ گیا۔ نزدیک تھا کہ جان نکل جاوے۔

"اتنے میں کسو نے پیچھے سے، گریبان میرا کھینچ کر گھسیٹا۔ دیکھوں تو وہی مرد عجمی ہے جس نے مجھے بیاہا تھا۔ کہنے لگا کہ "احمق، تو کس لیے روتا ہے؟" میں نے کہا "اے ظالم، یہ تو نے کیا بات کہی؟ میری بادشاہت لٹ گئی۔ آرام خانہ داری کا اگیا گزرا۔ تو کہتا ہے، کیوں غم کرتا ہے؟" وہ عزیز تبسم کر کے بولا کہ "اب اپنی موت کی خاطر رو۔ میں نے پہلے ہی تجھے کہا تھا کہ شاید اس شہر میں تیری اجل آئی ہے۔ سو ہی ہوا۔ اب سوائے مرنے کے، تیری رہائی نہیں۔" آخر لوگ مجھے پکڑ کر بت خانے میں لے گئے۔ دیکھا تو بادشاہ، اور اُمرا اور چھتیس فرقہ رعیت پرجا، وہاں جمع ہیں اور وزیرزادی کا مال اموال سب دھرا ہے۔ جو چیز جس کا جی چاہتا ہے، لیتا ہے اور اس کی قیمت کے روپے دھر دیتا ہے۔

"غرض سب اسباب کے نقد روپے ہوئے، ان روپوں کا جواہر خریدا گیا اور ایک صندوقچے میں بند کیا اور ایک دوسرے صندوق میں نان و حلوا، اور گوشت کے کباب، اور میوۂ خشک و تر، اور کھانے کی چیزیں لے کر بھریں۔ اور لاش اس بی بی کی، ایک صندوق میں رکھ کر، صندوق آذوقے کا ایک اونٹ پر لدوا دیا اور مجھے سوار کیا اور صندوقچہ جواہر کا میری بغل میں دیا اور سارے برہمن آگے آگے بھجن کرتے، سنکھ بجاتے چلے۔ اور پیچھے ایک خلقت، مبارکبادی کہتی ہوئی، ساتھ ہوئی۔ اس طور سے اُسی دروازے سے کہ میں پہلے روز آیا تھا، شہر کے باہر نکالا۔ جونہی داروغہ کی نگاہ مجھ پر پڑی، رونے لگا، اور بولا کہ "اے کم بخت اجل گرفتہ! میری بات نہ سنی اور اُس شہر میں آ کر مفت اپنی جان دی، میری تقصیر نہیں۔ میں نے منع کیا تھا۔" اُس نے یہ بات کہی۔ لیکن میں تو ہکا بکا

ہو رہا تھا، نہ زبان یاری دیتی تھی کہ جواب دوں، نہ اوسان بجا تھے کہ دیکھیے انجام میرا کیا ہوتا ہے؛

"آخر اس قلعے کے پاس، جس کا میں نے پہلے روز دروازہ بند دیکھا تھا، لے گئے اور بہت سے آدمیوں نے مل کر قفل کو کھولا اور تابوت اور صندوق کو اندر لے چلے۔ ایک پنڈت میرے نزدیک آیا اور سمجھانے لگا کہ "مانس ایک دن جنم پاتا ہے اور ایک روز ناس ہوتا ہے۔ دنیا کا یہی آواگون ہے۔ اب یہ تیری استری، اور پوت، اور دھن، اور چالیس دن کا اسباب بھوجن کا موجود ہے۔ اس کو لے اور یہاں رہ جب تلک بڑا بت تجھ پر مہربان ہووے۔" میں نے غصے میں چاہا کہ اس بت پر، اور وہاں کے رہنے والوں پر، اور اس ریت رسم پر، لعنت کہوں اور اس باہمن کو دھول چھکڑ کروں۔ وہی مرد عجمی اپنی زبان میں مانع ہوا کہ "خبردار ہرگز دم مت مار، اگر کچھ بھی بولا تو اسی وقت تجھے جلا دیں گے۔ خیر جو تیری قسمت میں تھا، سو ہوا۔ اب خدا کے کرم سے اُمیدوار رہ، شاید، اللہ تجھے یہاں سے جیتا نکالے۔"

"آخر سب، مجھے تن تنہا چھوڑ کر، اُس حصار سے باہر نکلے اور دروازہ پھر مقفل کر دیا۔ اُس وقت، میں اپنی تنہائی اور بے کسی پر بے اختیار رویا اور اس عورت کی لوتھ پر لاتیں مارنے لگا کہ "اے مردار، اگر تجھے جیتے ہی مر جانا تھا، بیاہ کاہے کو کیا تھا اور پیٹ سے کیوں ہوئی تھی؟" مار مار کر پھر چپکا بیٹھا۔ اس میں دن چڑھا اور دھوپ گرم ہوئی۔ سر کا بھیجا پکنے لگا، اور تعفن کے مارے دم نکلنے لگی جدھر دیکھتا ہوں، مردوں کی ہڈیاں اور صندوق جواہر کے ڈھیر لگے ہیں۔ تب، کئی صندوق پرانے لے کر نیچے اوپر رکھے کہ دن کو دھوپ سے اور رات کو اوس سے بچاؤ ہو۔ آب پانی کی تلاش کرنے لگا، ایک طرف جھرنا سا دیکھا کہ قلعے کی دیوار میں، پتھر کا ترشا ہوا، گھڑے کے منہ کے موافق ہے۔ بارے کئی دن، اُس پانی اور کھانے سے زندگی ہوئی۔

"آخر آذوقہ تمام ہوا۔ میں گھبرایا اور خدا کی جناب میں فریاد کی۔ وہ ایسا کریم ہے کہ دروازہ کوٹ کا کھلا اور ایک مردے کو لائے۔ اس کے ساتھ ایک پیر مرد آیا۔ جب اُسے بھی چھوڑ کر گئے، یہ دل میں آیا کہ اس بڈھے کو مار کر اس کے کھانے کا صندوق سب کا سب لے لے۔ ایک صندوق کا پایہ ہاتھ میں لے کر، اس کے پاس گیا۔ وہ بچارا، سر زانوں پر دھرے، حیران بیٹھا تھا۔ میں نے پیچھے سے آکر، اس کے سر میں ایسا مارا کہ سر پھٹ کر مغز کا گودا نکل پڑا اور فی الفور جان بحق تسلیم ہوا۔ اُس کا آذوقہ لے کر میں کھانے لگا۔ مدت تلک یہی میرا کام تھا کہ جو زندہ مردے کے ساتھ آتا، اسے میں مار ڈالتا اور کھانے کا اسباب لے کر بہ فراغت کھاتا۔

"بعد کتنی مدت کے ایک مرتبہ، ایک لڑکی تابوت کے ہمراہ آئی۔ نہایت قبول صورت۔ میرے

دل نے نہ چاہا کہ اُسے بھی ماروں۔ اُس نے مجھے دیکھا اور مارے ڈر کے بے ہوش ہو گئی۔ میں، اُس کا بھی آذوقہ اٹھا کر اپنے پاس لے آیا، لیکن اکیلا نہ کھاتا۔ جب بھوک لگتی اُس کے نزدیک لے جاتا اور ساتھ مل کر کھاتا۔ جب اُس عورت نے دیکھا کہ یہ شخص مجھے نہیں ستاتا، دن بہ دن اُس کی وحشت کم ہوتی اور رام ہوتی چلی۔ میرے مکان میں آنے جانے لگی۔ ایک روز اُس کا احوال پوچھا کہ "تو کون ہے؟" اُس نے جواب دیا کہ "میں بادشاہ کے وکیل مطلق کی بیٹی ہوں، اپنے چچا کے بیٹے سے منسوب ہوئی تھی۔ شب عروسی کے دن، اُسے قولنج ہوا۔ ایسا درد سے تڑپنے لگا کہ ایک آن کی آن میں مر گیا۔ مجھے اُس کے تابوت کے ساتھ لا کر یہاں چھوڑ گئے ہیں۔" تب اُس نے میرا احوال پوچھا۔ میں نے بھی تمام و کمال بیان کیا اور کہا "خدا نے تجھے، میری خاطر یہاں بھیجا ہے۔" وہ مسکرا کر چپکی ہو رہی۔

"اسی طرح، کئی دن میں، آپس میں محبت زیادہ ہو گئی۔ میں نے اُسے، ارکان مسلمانی کے سکھا کر کلمہ پڑھایا اور متعہ کر کر صحبت کی۔ وہ بھی حاملہ ہوئی۔ ایک بیٹا پیدا ہوا۔ قریب تین برس کے، اسی صورت سے گزری۔ جب لڑکے کا دودھ بڑھایا، ایک روز بی بی سے کہا کہ "یہاں کب تک رہیں گے؟" وہ بولی "خدا نکالے تو نکلیں۔ نہیں تو ایک روز یونہی مر جائیں گے۔" مجھے اس کے کہنے پر، اور اپنے رہنے پر، کمال رقت آئی۔ روتے روتے سو گیا۔ ایک شخص کو خواب میں دیکھا کہ کہتا ہے کہ "بد پرنالے کی راہ سے نکلنا ہے، تو نکل!" میں مارے خوشی کے چونک پڑا اور جورو کو کہا کہ "لوہے کی میخیں اور سیخیں، جو پرانے صندوقوں میں ہیں، جمع کر کے لے آؤ، تو اس کو کشادہ کروں۔" غرض میں، اُس موری کے منہ پر میخ رکھ کر، پتھروں سے ایسا ٹھونکتا کہ تھک جاتا۔ ایک برس کی محنت میں وہ سوراخ اتنا بڑا ہوا کہ آدمی نکل سکے۔

"بعد اُس کے، مردوں کی آستینوں میں، اچھے اچھے جواہر چن کر بھرے اور ساتھ لے کر اسی راہ سے، ہم تینوں نکلے۔ خدا کا شکر کیا اور بیٹے کو کاندھے پر بٹھا لیا۔ ایک مہینہ ہوا ہے کہ سر راہ چھوڑ کر، مارے ڈر کے جنگل پہاڑوں کی راہ سے، چلا آتا ہوں۔ جب گرسنگی ہوتی ہے گھاس پات کھاتا ہوں، قوت بات کہنے کی مجھ میں نہیں۔ یہ میری حقیقت ہے جو تم نے سنی۔"

"بادشاہ سلامت! میں نے اس کی حالت پہ ترس کھایا اور حمام کروا کر، اچھا لباس پہنوایا اور اپنا نائب بنایا۔ اور میرے گھر میں ملکہ سے کئی لڑکے پیدا ہوئے لیکن خرد سالی میں مر مر گئے۔ ایک بیٹا پانچ برس کا ہو کر موا، اس کے غم میں ملکہ نے بھی وفات پائی۔ مجھے کمال غم ہوا اور وہ ملک، بغیر اُس کے، کاٹنے لگا۔ دل اُداس ہو گیا۔ ارادہ عجم کا کیا۔ بادشاہ سے عرض کر کر، خدمت

شاہبندری کی، اس جوان کو دلوا دی۔ اس عرصے میں بادشاہ بھی مرگیا۔ میں اس وفادار کتے کو، اور سب مال خزانہ، جواہر ساتھ لے کر نیشاپور میں آ رہا، اس واسطے کہ میرے بھائیوں کے احوال سے کوئی واقف نہ ہووے۔ میں خواجہ سگ پرست مشہور ہوا۔ اور اس بدنامی میں، دوگنا محصول، آج تک بادشاہِ ایران کی سرکار میں بھرتا ہوں۔ اتفاقاً یہ سوداگر بچہ وہاں گیا، اس کے وسیلے سے جہاں پناہ کا قدم بوس کیا۔"

میں نے پوچھا "کیا یہ تمہارا فرزند نہیں؟" خواجہ نے جواب دیا "قبلۂ عالم! یہ میرا بیٹا نہیں آپ ہی کی رعیت ہے۔ لیکن اب میرا مالک اور وارث، جو کچھ کہیے، سو یہی ہے۔" یہ سن کر سوداگر بچے سے میں نے پوچھا کہ "تو کس تاجر کا لڑکا ہے اور تیرے ماں باپ کہاں رہتے ہیں؟" اس لڑکے نے زمین چومی اور جان کی امان مانگی اور بولا کہ "یہ لونڈی سرکار کے وزیر کی بیٹی ہے۔ میرا باپ حضور کے عتاب میں، بہ سبب اسی خواجہ کے لعلوں کے، پڑا۔ اور حکم یوں ہوا کہ اگر ایک سال تک، اس کی بات کرسی نشین نہ ہوگی تو جان سے مارا جاوے گا۔ میں نے سن کر، یہ بھیس بنایا اور اپنے تئیں نیشاپور پہنچایا۔ خدا نے خواجہ کو مع کتے اور لعلوں کے، حضور میں حاضر کر دیا۔ آپ نے تمام احوال سن لیا، امیدوار ہوں کہ میرے بوڑھے باپ کی مخلصی ہووے۔"

یہ بیان وزیر زادی سے سن کر، خواجہ نے ایک آہ کی اور بے اختیار گر پڑا۔ جب گلاب اس پر چھڑکا گیا تب ہوش میں آیا اور بولا "ہائے کم بختی! اتنی دور سے یہ رنج و محنت کھینچ کر، میں اس توقع پر آیا تھا کہ اس سوداگر بچے کو متبنیٰ کرکر، اپنا فرزند کروں گا اور اپنے مال و متاع کا اس کو ہبہ نامہ لکھ دوں گا، تو میرا نام رہے گا اور سارا عالم اسے خواجہ زادہ کہے گا۔ سو میرا خیال خام ہوا، اور بالعکس کام ہوا۔ اس نے عورت ہو کر، مجھ مرد پیر کو خراب کیا۔ میں رنڈی کے چرتر میں پڑا، اب میری وہ کہاوت ہوئی: گھر میں رہے نہ تیرتھ گئے، مونڈ منڈا فضیحت بھئے۔"

القصہ مجھے، اس کی بے قراری اور نالہ زاری پر، رحم آیا۔ خواجہ کو نزدیک بلایا اور کان میں مژدہ اس کے وصل کا سنایا کہ "غمگین مت ہو۔ اسی سے تیری شادی کر دیں گے۔ خدا چاہے تو اولاد تیری ہوگی اور یہی تیری مالک ہوگی۔" اس خوش خبری کے سننے سے، فی الجملہ اس کو تسلی ہوئی۔ تب میں نے کہا کہ "وزیر زادی کو محل میں لے جاؤ، اور وزیر کو بندی خانے سے لے آؤ اور حمام میں نہلاؤ اور خلعتِ سرفرازی کی پہناؤ اور جلدی میرے پاس لاؤ۔" جس وقت وزیر آیا، لب فرش تک، اس کا استقبال فرمایا اور اپنا بزرگ جان کر گلے لگایا اور نئے سرے سے، قلمدان وزارت کا عنایت

فرمایا اور خواجہ کو بھی جاگیر و منصب دیا اور ساعت سعید دیکھ کر، وزیر زادی سے نکاح پڑھوا کر منسوب کیا۔ کئی سال میں دو بیٹے اور ایک بیٹی اُس کے گھر پیدا ہوئی۔ چنانچہ بڑا بیٹا ملک التجار ہے اور چھوٹا ہماری سرکار کا مختار ہے۔

اے درویشو! میں نے اس لئے یہ نقل تمہارے سامنے کی کہ کل رات، دو فقیروں کی سرگزشت میں نے سنی تھی۔ اب تم دونوں بھی، جو باقی رہے ہو، یہ سمجھو کہ ہم اسی مکان میں بیٹھے ہیں اور مجھے اپنا خادم، اور اس گھر کو اپنا تکیہ جانو۔ بے وسواس، اپنی اپنی سیر کا، حال کہو اور چندے میرے پاس رہو۔"

جب فقیروں نے، بادشاہ کی طرف، بہت خاطر داری دیکھی کہنے لگے "خیر، جب تم نے گداؤں سے اُلفت کی، تو ہم دونوں بھی اپنا ماجرا بیان کرتے ہیں، سنیے:"

اقبال کی کہانی
کچھ میری کچھ ان کی زبانی

راوی ڈاکٹر ظہیر الدین الجامعی

- اقبال کے آدم گرانہ شعر کی حیثیت اور پیامبرانہ کلام کی تفسیر
- بزرگ تر دانائے راز کی ہمہ گیر فلسفہ کی دراست کی تشریح
- اقبال کے نادر خیالات اور شاہین فکر کی ترجمانی
- اقبالیات میں لائق اعتراف اضافہ
- سنجیدہ اور عمیق مطالعہ کی نادر مثال

فوٹو آفسیٹ کی اعلیٰ طباعت

سیر تسیرے درویش کی

تیسرا درویش کوٹ باندھ بیٹھا اور اپنی سیر کا بیان اس طرح سے کرنے لگا:

"احوال اس فقیر کا، اے دوستاں سنو!
یعنی جو مجھ پہ بیتی ہے وہ داستاں سنو!
جو کچھ کہ شاہِ عشق نے مجھ سے کیا سلوک
تفصیل وار کرتا ہوں اُس کا بیاں سنو!

یہ کمترین، بادشاہ زادہ عجم کا ہے۔ میرے ولی نعمت وہاں کے بادشاہ تھے اور سوائے میرے، کوئی فرزند نہ رکھتے تھے۔ میں، جوانی کے عالم میں، مصاحبوں کے ساتھ چوپڑ، گنجیفہ، شطرنج تختہ نرد کھیلا کرتا یا سوار ہو کر سیر و شکار میں مشغول رہتا۔ ایک دن کا یہ ماجرا ہے کہ سواری تیار کروا کر اور سب یار آشناؤں کو لے کر، میدان کی طرف نکلا۔ باز، بہری، جرہ، باشا، سرخاب اور تیتروں پر اُڑاتا ہوا، دور نکل گیا۔ عجب طرح کا، ایک قطعہ بہار کا، نظر آیا کہ جیدھر نگاہ جاتی تھی، کوسوں تلک سبز، اور پھولوں سے لعل، زمین نظر آتی تھی۔ یہ سماں دیکھ کر، گھوڑوں کی باگیں ڈال دیاں، اور قدم قدم سیر کرتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ ناگاہ اُس صحرا میں دیکھا کہ ایک کالا ہرن، اس پہ زربفت کی جھول اور جھبوز کلی مرصع کی، اور گھونگرو سونے کے، زردوزی پٹے میں ٹلکے ہوئے، گلے میں پڑے، خاطر جمع سے اُس میدان میں (کہ جہاں انسان کا دخل نہیں اور پرندہ پر نہیں مارتا) چرتا پھرتا ہے۔ ہمارے گھوڑوں کے سم کی آہٹ پا کر، چونکا ہوا اور سر اٹھا کر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلا۔

مجھے اُس کے دیکھنے سے یہ شوق ہوا کہ رفیقوں سے کہا کہ "تم یہیں کھڑے رہو، میں اسے جیتا پکڑوں گا۔ خبردار، تم قدم آگے نہ بڑھائیو اور میرے پیچھے نہ آئیو۔" اور گھوڑا، میری رانوں تلے، ایسا پرند تھا کہ بارہا ہرنوں کے اوپر دوڑا کر، ان کی کڑچھالوں کو بھلا کر، ہاتھوں سے پکڑ پکڑ لیے تھے۔ اس کے عقب دوڑایا۔ وہ دیکھ کر چھلانگیں بھرنے لگا، اور ہوا ہوا۔ گھوڑا بھی باد سے باتیں کرتا تھا، لیکن اُس کی گرد کو نہ پہنچا۔ وہ راہوار بھی پسینے پسینے ہو گیا، اور میری بھی جیبھ، مارے پیاس کے، چٹخنے لگی۔ پر کچھ بس نہ چلا۔ شام ہونے لگی۔ اور میں کیا جانوں، کہاں سے کہاں نکل آیا؟ لاچار

ہو رہا ہے بھلاوا دیا اور ترکش میں سے تیر نکال کر، اور قربان سے کمان سنبھال کر، چلے میں جوڑ کر کشش کان تک لا کر، ران کو اس کی تاک، اللہ اکبر کہہ کر مارا۔ بارے پہلا ہی تیر اس کے پاؤں میں ترازو ہوا۔ تب لنگڑاتا ہوا پہاڑ کے دامن کی سمت چلا۔ فقیر بھی گھوڑے پر سے اتر پڑا اور پا پیادہ، اس کے پیچھے لگا۔ اس نے کوہ کا ارادہ کیا اور میں نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔ کئی اتار چڑھاؤ کے بعد ایک گنبد نظر آیا۔ جب پاس پہنچا تو ایک باغیچہ اور ایک چشمہ دیکھا۔ وہ ہرن تو نظروں سے چھلاوا ہو گیا۔ میں نہایت تھکا تھا، ہاتھ پاؤں دھونے لگا۔

ایک بارگی آواز رونے کی، اُس برج کے اندر سے، میرے کان میں آئی۔ جیسے کوئی کہتا ہے کر "اے بچے! جس نے تجھے تیر مارا، میری آہ کا تیر اُس کے کلیجے میں لگیو، وہ اپنی جوانی سے پھل نہ پاوے اور خدا اس کو میرا سا دکھیا بناوے!" میں یہ سن کر وہاں گیا۔ دیکھا تو ایک بزرگ، ریش سفید اچھی پوشاک پہنے، ایک مسند پر بیٹھا ہے اور ہرن آگے لیٹا ہوا ہے۔ اُس کی جانگھ سے تیر کھینچتا ہے اور بد دعا دیتا ہے۔ میں نے سلام کیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا کہ "حضرت سلامت! یہ تقصیر، نادانستہ، اس غلام سے ہوئی۔ میں یہ نہ جانتا تھا۔ خدا کے واسطے معاف کرو۔" بولا کہ "بے زبان کو تو نے ستایا ہے۔ اگر ان جان، یہ حرکت تجھ سے ہوئی، اللہ معاف کرے گا۔" میں پاس جا بیٹھا اور تیر نکالنے میں شریک ہوا۔ بڑی دقت سے تیر کو نکالا اور زخم میں مرہم بھر کر چھوڑ دیا۔ پھر ہاتھ دھو کر، اُس پیر مرد نے کچھ حاضری، جو اُس وقت موجود تھی، مجھے کھلائی۔ میں نے کھا پی کر ایک چارپائی پر لمبی تانی۔

ماندگی کے سبب، خوب پیٹ بھر کر، سویا۔ اُس نیند میں، آواز نوحہ و زاری کی، کان میں آئی آنکھیں مل کر جو دیکھتا ہوں تو اُس مکان میں، نہ وہ بوڑھا ہے نہ کوئی اور۔ ہے۔ اکیلا میں پلنگ پر لیٹا ہوں اور وہ دالان خالی پڑا ہے۔ چاروں طرف بھیانک ہو کر دیکھنے لگا۔ ایک کونے میں پردہ پڑا نظر آیا۔ وہاں جا کر اُسے اٹھایا، دیکھا تو ایک تخت بچھا ہے اور اس پر ایک پری زاد عورت، برس چودہ ایک کی، مہتاب کی سی صورت، اور زلفیں دونوں طرف چھوٹی ہوئیں، ہنستا چہرہ، فرنگی لباس پہنے ہوئے، عجب ادا سے دیکھتی ہے اور بیٹھی ہے۔ اور بزرگ اپنا سر، اس کے پاؤں پر دھرے بے اختیار رو رہا ہے اور ہوش و حواس کھو رہا ہے۔ میں اُس پیر مرد کا یہ احوال اور اس نازنین کا حسن و جمال دیکھ کر مرجھا گیا اور مُردے کی طرح بے جان ہو کر گر پڑا۔ وہ مرد بزرگ، یہ میرا حال دیکھ کر، شیشہ گلاب کا لے آیا اور مجھ پر چھڑکنے لگا۔ جب میں چنگا، اُٹھ کر اُس معشوق کے مقابل جا کر سلام کیا۔ اُس نے ہرگز نہ ہاتھ اٹھایا اور نہ ہونٹ ہلایا۔ میں نے کہا کہ "اے گل بدن، اتنا غرور کرنا اور جواب سلام کا

نہ دنیا، کس مذہب میں درست ہے؟

کم بولنا ادا ہے، ہرچند، پر نہ اتنا
مند جائے چشم عاشق، تو بھی وہ منہ نہ کھولے

واسطے اُس خدا کے جس نے تجھے بنایا ہے، کچھ تو منہ سے بول۔ ہم بھی اتفاقاً یہاں آنکلے ہیں۔ مہمان کی خاطر ضرور ہے۔" میں نے بہتیری باتیں بنائیں لیکن کچھ کام نہ آئیں۔ وہ چپکے، بت کی طرح بیٹھے سنا کی۔ تب میں نے بھی آگے بڑھ کر ہاتھ، پاؤں پہ چلایا۔ جب پاؤں کو چھیڑا تو سخت معلوم ہوا۔ آخر یہ دریافت کیا کہ پتھر سے اس لعل کو تراشا ہے، اور آزر نے اس بت کو بنایا ہے۔ تب اس پیر مرد بت پرست سے پوچھا کہ "میں نے تیرے ہرن کی ٹانگ میں کھپرا مارا۔ تو نے اس عشق کی ناوک سے میرا کلیجہ چھید کر دار پار کیا۔ تیری دعا قبول ہوئی۔ اب اس کی کیفیت مفصل بیان کر کہ یہ طلسم کیوں بنایا ہے اور تو نے، بستی کو چھوڑ کر، جنگل پہاڑ کیوں بسایا ہے؟ تجھ پر جو کچھ بیتا ہے مجھ سے کہہ۔"

جب اس کا بہت پیچھا لیا، تب اُس نے جواب دیا کہ "اس بات نے مجھے تو خراب کیا، کیا تو بھی سن کر ہلاک ہوا چاہتا ہے؟" میں نے کہا "لو، اب بہت مکر پکر کیا، مطلب کی بات کہو، نہیں مار ڈالوں گا۔" مجھے نہایت درپے دیکھ کر بولا "اے جوان! حق تعالیٰ، ہر انسان کو، عشق کی آنچ سے محفوظ رکھے! دیکھ تو، اس عشق نے کیا کیا آفتیں برپا کی ہیں! عشق ہی کے مارے عورت، خاوند کے ساتھ ستی ہوتی ہے اور اپنی جان کھوتی ہے۔ اور فرہاد و مجنوں کا قصہ سب کو معلوم ہے۔ تو اس کے سننے سے، کیا پھل پاوے گا؟ ناحق گھر بار، دولت دنیا، چھوڑ چھاڑ کر نکل جاوے گا؟" میں نے جواب دیا "اپنی دوستی تہ کر رکھو۔ اس وقت مجھے اپنا دشمن سمجھو۔ اگر جان عزیز ہے تو صاف کہو۔" لاچار ہو کر آنسو بھر لایا اور کہنے لگا کہ "مجھ خانہ خراب کی یہ حقیقت ہے کہ بندے کا نام نعمان سیاح ہے۔ میں بڑا سوداگر تھا۔ اس سن میں، تجارت کے سبب، ہفت اقلیم کی سیر کی اور سب بادشاہوں کی خدمت میں رسائی ہوئی۔

"ایک بار یہ خیال جی میں آیا کہ چاروں دانگ ملک تو پھرا لیکن جزیرہ فرنگ کی طرف نہ گیا اور وہاں کے بادشاہ کو، اور رعیت و سپاہ کو، نہ دیکھا اور رسم و راہ وہاں کی، کچھ نہ دریافت ہوئی۔ ایک دفعہ وہاں بھی چلا چاہیے۔ رفیقوں اور شفیقوں سے صلاح لے کر ارادہ مصمم کیا اور تحفہ ہدیہ جہاں تہاں کا، جو وہاں کے لائق تھا، لیا اور ایک قافلہ سوداگروں کا اکٹھا کر کر، جہاز پہ سوار ہو کر روانہ ہوا۔ ہوا جو موافق پائی، کئی مہینوں میں اس ملک میں جا داخل ہوا۔ شہر میں ڈیرا کیا۔ عجب شہر دیکھا کہ کوئی شہر اس شہر کی خوبی کو نہیں پہنچتا۔ ہر ایک بازار و کوچے میں پختہ سڑکیں بنی ہوئیں اور چھڑکاؤ کیا ہوا۔ صفائی

ایسی کہ ایک تنکا کہیں پڑا نظر نہ آیا، کوڑے کا تو ذکر کیا ہے۔ اور عمارتیں زنگ برنگ کی۔ اور رات کو رستوں میں دور رستہ، قدم بہ قدم روشنی، اور شہر کے باہر باغات کہ جن میں عجائب گل بوٹے اور میوے نظر آئے کہ شاید سوائے بہشت کے، کہیں اور نہ ہوں گے۔ جو وہاں کی تعریف کروں، سو بجا ہے۔

"غرض سوداگروں کے آنے کا چرچا ہوا۔ ایک خواجہ سرا معتبر، سوار ہو کر، اور کئی خدمت گار ساتھ لے کر، قافلے میں آیا اور بیوپاریوں سے پوچھا کہ 'تمہارا سردار کون سا ہے؟' سبھوں نے میری طرف اشارت کی۔ وہ محلی، میرے مکان میں آیا۔ میں تعظیم بجا لایا، باہم سلام علیک ہوئی۔ اُس کو مسند پر بٹھایا، تکیے کی تواضع کی۔ بعد اس کے، میں نے پوچھا کہ، صاحب کے تشریف لانے کا کیا باعث ہے؟ فرمائیے؛ جواب دیا کہ 'شہزادی نے سنا ہے کہ سوداگر آئے ہیں اور بہت جنس لائے ہیں۔ لہٰذا مجھ کو حکم کیا کہ جا کر ان کو حضور میں لے آؤ۔ پس تم جو کچھ اسباب، لائق بادشاہوں کی سرکار کے ہو، سارے لے کر چلو اور سعادت آستانہ بوسی کی، حاصل کرو؛

"میں نے جواب دیا کہ 'آج تو ماندگی کے باعث قاصر ہوں۔ کل جان و مال سے حاضر ہوں۔ جو کچھ اس عاجز کے پاس موجود ہے، نذر گزرانوں گا۔ جو پسند آوے، مال سرکار کا ہے؛' یہ وعدہ کر کر، اور عطر و پان دے کر، خواجہ کو رخصت کیا اور شب سوداگروں کو اپنے پاس بلا کر، جو جو تحفہ جس کے پاس تھا، لے لے کر جمع کیا اور جو میرے گھر میں تھا، وہ بھی لے لیا اور صبح کے وقت دروازے پر بادشاہی محل کے حاضر ہوا۔ بارے، دربان نے میری خبر عرض کی۔ حکم ہوا کہ حضور میں لاؤ۔ وہی خواجہ سرا نکلا اور میرا ہاتھ، ہاتھ میں لے کر، دوستی کی راہ سے، باتیں کرتا ہوا لے چلا۔ پہلے، خواص پرے سے ہو کر، ایک مکان عالی شان میں لے گیا۔ اے عزیز، تو باور نہ کرے گا، یہ عالم نظر آیا گویا پر کاٹ کر، پریوں کو چھوڑ دیا ہے۔ جس طرف دیکھتا تھا نگاہ گڑ جاتی تھی۔ پاؤں زمین سے اُکھڑے جاتے تھے۔ بہ زور، اپنے تئیں سنبھالتا ہوا، روبرو پہنچا۔ جونہی بادشاہ زادی پر نظر پڑی، غش کی نوبت ہوئی اور ہاتھ پاؤں میں رعشہ ہو گیا

"بہر صورت سلام کیا۔ دونوں طرف، دست راست اور دست چپ، صف بہ صف، نازنینان پری چہرہ، دست بستہ پری چہرہ کھڑی تھیں۔ میں جو کچھ قسم، جواہر اور پارچہ پوشاکی اور تحفہ، اپنے ساتھ لے گیا تھا، جب کئی کشتیاں حضور میں چنی گئیں (از بسکہ سب جنس لائق پسند کے تھی) خوش ہو کر خانساماں کے حوالے ہوئے اور فرمایا کہ 'قیمت اس کی، بہ موجب فرد کے، کل دی جائے گی؛' میں تسلیمات بجا لایا اور دل میں خوش ہوا کہ اس بہانے سے بھلا کل بھی آنا ہو گا جب رخصت ہوں۔

باہر آیا تو سودائی کی طرح کہتا کچھ تھا اور منہ سے نکلتا کچھ تھا۔ اسی طرح سرا میں آیا لیکن حواس بجا نہ تھے سب آشنا دوست پوچھنے لگے کہ "تمہاری کیا حالت ہے؟" میں نے کہا "اتنی آمد و رفت سے گرمی دماغ میں چڑھ گئی ہے۔"

"غرض وہ رات تلملاتے کاٹی، فجر کو پھر جا کر حاضر ہوا اور اسی خواجہ کے ساتھ پھر محل میں پہنچا۔ وہی عالم جو کل دیکھا تھا، دیکھا۔ بادشاہ زادی نے مجھے دیکھا اور ہر ایک کو، اپنے اپنے کام پر، رخصت کیا۔ جب پرچا ہوا، خلوت میں اٹھ گئیں اور مجھے طلب کیا۔ میں وہاں گیا، بیٹھنے کا حکم کیا۔ میں آداب بجا لا کر بیٹھا، فرمایا کہ "یہاں جو تو آیا اور یہ اسباب لایا، اس میں منافع کتنا منظور ہے؟" میں نے عرض کی کہ "آپ کے قدم دیکھنے کی بڑی خواہش تھی، سو خدا نے میسر کی۔ اب میں نے سب کچھ بھر پایا اور دونوں جہان کی سعادت حاصل ہوئی اور قیمت جو کچھ فہرست میں ہے، نصف کی خرید ہے اور نصف نفع ہے۔" فرمایا "نہیں۔ جو قیمت تو نے لکھی ہے وہ عنایت ہو گی۔ بلکہ اور بھی انعام دیا جائے گا، بشرطیکہ ایک کام تجھ سے ہو سکے، تو حکم کروں۔"

میں نے کہا کہ "غلام کا جان و مال، اگر سرکار کے کام آوے، تو میں اپنے طالعوں کی خوبی سمجھوں اور آنکھوں سے کروں۔" یہ سن کر قلم دان یاد فرمایا، ایک شقہ لکھا اور موتیوں کے دلمیان میں رکھ کر، ایک رومال شبنم کا اوپر لپیٹ کر، میرے حوالے کیا اور ایک انگوٹھی، نشان کے واسطے، انگلی سے اتار دی اور کہا کہ "اس طرف کو ایک بہت بڑا باغ ہے۔ دلکشا اس کا نام ہے، وہاں تو جا کر، ایک شخص کیخسرو نام داروغہ ہے۔ اس کے ہاتھ میں یہ انگشتری دیجو اور ہماری طرف سے دعا کہیو اور اس رقعے کا جواب مانگیو۔ لیکن جلد آئیو اگر کھانا وہاں کھائیو تو پانی یہاں پیجیو۔ اس کام کا انعام، تجھے ایسا دوں گی کہ تو دیکھے گا۔" میں رخصت ہوا اور پوچھتا پوچھتا چلا۔ قریب دو کوس کے جب گیا، وہ باغ نظر پڑا۔ جب پاس پہنچا، ایک عزیز مسلح، مجھ کو پکڑ کے، دروازے میں باغ کے لے گیا۔ دیکھوں تو ایک جوان، شیر کی سی صورت، سونے کی کرسی پر زرہ داؤدی پہنے، چار آئینہ باندھے، فولادی خود سر پہ دھرے، نہایت شان و شوکت سے بیٹھا ہے اور پانسو جوان، تیار، ڈھال تلوار ہاتھ میں لئے اور تیر کمان باندھے، مستعد، پرا باندھے کھڑے ہیں۔

"میں نے سلام کیا، مجھے نزدیک بلایا۔ میں نے وہ خاتم دی اور خوشامد کی باتیں کر کر، وہ رومال دکھایا اور رقعے کے بھی لانے کا احوال کہا۔ اس نے سنتے ہی انگلی دانتوں سے کاٹی اور سر دھن کر بولا کہ "شاید تیری اجل تجھ کو لے آئی ہے۔ خیر باغ کے اندر جا۔ سرو کے درخت میں، ایک آہنی پنجرہ لٹکتا ہے، اس میں ایک جوان قید ہے۔ اس کو یہ خط دے کر جواب لے کر جلدی پھر آ۔" میں نے شتاب باغ میں گھسا۔ باغ کیا

تھا گویا جیتے جی بہشت میں گیا۔ ایک ایک چمن، رنگ برنگ کا، پھول رہا تھا اور فوارے چھوٹ رہے تھے جانور چہچہے مار رہے تھے۔ میں سیدھا چلا گیا اور اس درخت میں وہ قفس دیکھا۔ اس میں ایک جوان حسین نظر آیا میں نے ادب سے سر نہوڑایا اور سلام کیا۔ اور وہ خر لطیفہ سربمہر، پنجرے کی تیلیوں کی راہ سے، دیا۔ وہ عزیز رقعہ کھول کر پڑھنے لگا اور مجھ سے، مشتاق وار، احوال ملکہ کا پوچھنے لگا۔

"ابھی باتیں تمام نہ ہوئیں تھیں کہ ایک فوج زنگیوں کی نمود ہوئی اور چاروں طرف سے مجھ پر آ ٹوٹی۔ اور بے تحاشا برچھی و تلوار مارنے لگی۔ ایک آدمی ہتے کی بساط کیا؟ ایک دم میں چور زخمی کر دیا۔ مجھے کچھ اپنی سدھ بدھ نہ رہی۔ پھر جو ہوش آیا، اپنے تئیں چارپائی پر پایا کہ دو پیادے اٹھائے لئے جاتے ہیں اور آپس میں بتیاتے ہیں۔ ایک نے کہا "اس مردے کی لوتھ کو میدان میں پھینک دو۔ کتے کوے کھائیں گے۔" دوسرا بولا "اگر بادشاہ تحقیق کرے، اور یہ خبر پہنچے، تو جیتا گڑوا دے اور بال بچوں کو کولہو میں پڑوا دے۔ کیا ہمیں اپنی جان بھاری پڑی ہے جو ایسی نامعقول حرکت کریں؟"

میں نے یہ گفتگو سن کر، دونوں یاجوج ماجوج سے کہا کہ "واسطے خدا کے مجھ پر رحم کرو، ابھی مجھ میں ایک رمق جان باقی ہے۔ جب مر جاؤں گا جو تمہارا جی چاہے گا سو کیجیو۔ مردہ بدست زندہ لیکن یہ تو کہو مجھ پر یہ کیا حقیقت بیتی؟ مجھے کیوں مارا؟ اور تم کون ہو؟ بھلا اتنا تو کہہ سناؤ۔" تب انہوں نے رحم کھا کر کہا کہ "وہ جوان جو قفس میں بند ہے، اس بادشاہ کا بھتیجا ہے اور پہلے اس کا باپ تخت نشین تھا۔ رحلت کے وقت یہ وصیت اپنے بھائی کو کی کہ "ابھی میرا بیٹا جو وارث اس سلطنت کا ہے، لڑکا اور بے شعور ہے۔ کاروبار بادشاہت کا، خیر خواہی اور ہوشیاری سے، تم کیا کیجیو۔ جب یہ بالغ ہو اپنی بیٹی سے شادی اس کی، کر دیجیو، اور مختار تمام ملک اور خزانے کا کیجیو۔" یہ کہہ کر انہوں نے وفات پائی اور سلطنت کی نوبت چھوٹے بھائی پر آئی۔ اس نے وصیت پر عمل نہ کیا بلکہ دیوانہ اور سودائی مشہور کر کے پنجرے میں ڈال دیا۔ اور چوکی گاڑھی، چاروں طرف باغ کے، رکھی ہے کہ پرندہ پر نہیں مار سکتا اور کئی مرتبہ زہر ہلاہل دیا ہے، لیکن زندگی زبردست ہے، اثر نہیں کیا۔ اب وہ شہزادی اور یہ شہزادہ، دونوں، عاشق معشوق بن رہے ہیں۔ وہ گھر میں تلپھے ہے اور یہ قفس میں تڑپھے ہے۔ تیرے ہاتھ، شوق کا نامہ اس نے بھیجا۔ یہ خبر ہرکاروں نے، بجنس، بادشاہ کو پہنچائی۔ حبشیوں کا دستہ متعین ہوا۔ تیرا یہ احوال کیا، اور اس جوان قیدی کے قتل کی، وزیر سے تدبیر پوچھی۔ اس نمک حرام نے ملکہ کو راضی کیا ہے کہ اس بے گناہ کو، بادشاہ کے حضور، اپنے ہاتھ سے شہزادی مار ڈالے۔"

"میں نے کہا "چلو مرتے مرتے یہ بھی تماشا دیکھ لیں۔" آخر راضی ہو کر وہ دونوں، اور میں زخمی چپکے ایک گوشے میں جا کر کھڑے ہوئے۔ دیکھا تو تخت پر بادشاہ بیٹھا ہے اور ملکہ کے ہاتھ میں ننگی تلوار ہے اور شہزادے کو پنجرے سے باہر نکال کر روبرو کھڑا کیا۔ ملکہ جلاد بن کر، شمشیر برہنہ لیے ہوئے اپنے عاشق کو قتل کرنے کو آئی۔ جب نزدیک پہنچی تلوار پھینک دی اور گلے میں چمٹ گئی۔ تب وہ عاشق بولا کہ "ایسے مرنے پر میں راضی ہوں۔ یہاں بھی تیری آرزو ہے، وہاں بھی تیری تمنا رہے گی۔" ملکہ بولی کہ "اس بہانے سے میں تیرے دیکھنے کو آئی تھی۔" بادشاہ، یہ حرکت دیکھ کر سخت برہم ہوا اور وزیر کو ڈانٹا کہ "تو یہ تماشا مجھے دکھلانے کو لایا تھا؟" محلی، ملکہ کو جدا کر کے، محل میں لے گئے اور وزیر نے خفا ہو کر، تلوار اٹھائی اور بادشاہ زادے کے اوپر دوڑا کہ ایک ہی وار کام اس بچارے کا تمام کرے۔ جوں چاہتا ہے کہ تیغا چلاوے، غیب سے ایک تیر ناگہانی، اس کی پیشانی پر بیٹھا کہ دو سار ہو گیا اور وہ گر پڑا۔

"بادشاہ یہ واردات دیکھ کر محل میں گھس گئے۔ جوان کو پھر، قفس میں بند کر، باغ میں لے گئے میں بھی وہاں سے نکلا۔ راہ میں ایک آدمی، مجھے بلا کر، ملکہ کے حضور میں لے گیا۔ مجھے گھائل دیکھ کر، ایک جراح کو بلوایا اور نہایت تقید سے فرمایا کہ "اس جوان کو جلد چنگا کر کے، غسل شفا کا دے۔ یہی تیرا مجرا ہے۔ اس کے اوپر تو جتنی محنت کرے گا، ویسا ہی انعام اور سرفرازی پاوے گا۔" غرض وہ جراح بہ موجب ارشاد ملکہ کے، تگ و دو کر کے، ایک چلے میں نہلا دھلا، مجھے حضور میں لے گیا۔ ملکہ نے پوچھا کہ "اب تو کچھ کسر باقی نہیں رہی؟" میں نے کہا کہ "آپ کی توجہ سے اب ہٹا کٹا ہوں۔" تب ملکہ نے ایک خلعت اور بہت سے روپے جو فرمائے تھے، بلکہ اس سے بھی دو چند عطا کیے اور رخصت کیا۔

"میں نے وہاں سے، سب رفیق اور نوکر چاکروں کو لے کر، کوچ کیا۔ جب اس مقام پر پہنچا، سب کو کہا "تم اپنے وطن کو جاؤ" اور میں نے اس پہاڑ پر، یہ مکان اور اس کی صورت بنا کر رہنا مقرر کیا۔ اور نوکروں اور غلاموں کو، موافق ہر ایک کی قدر کے، روپے دے کر آزاد کیا اور یہ کہہ دیا کہ جب تلک میں جیتا رہوں، میرے قوت کی خبر گیری تمہیں ضرور ہے، آگے تم مختار ہو۔ اب وہی اپنی نمک حلالی سے میرے کھانے کی خبر لیتے ہیں اور میں، بہ خاطر جمع، اس بت کی پرستش کرتا ہوں۔ جب تلک جیتا ہوں، میرا یہی کام ہے۔ یہ میری سرگزشت ہے جو تو نے سنی۔"

"یا فقرا! میں نے بہ مجرد سننے اس قصے کے، کفنی گلے میں ڈالی اور فقیروں کا لباس کیا، اور اشتیاق میں اس فرنگ کے ملک کے دیکھنے کے، روانہ ہوا۔ کتنے ایک عرصے میں جنگل پہاڑوں کی سیر

کرتا ہوا، مجنوں اور فرہاد کی صورت بن گیا۔

آخر میرے شوق نے اس شہر تک پہنچایا۔ گلی کوچے میں باؤلا سا پھرنے لگا۔ اکثر، ملکہ کے محل کے آس پاس، رہا کرتا۔ لیکن کوئی ڈھب ایسا نہ ہوتا، جو وہاں تک رسائی ہو۔ عجب حیرانی تھی کہ جس واسطے یہ محنت کشتی کر کر گیا، وہ مطلب ہاتھ نہ آیا۔ ایک دن بازار میں کھڑا تھا کہ ایک بارگی آدمی بھاگنے لگے اور دکاندار، دکانیں بند کر کے، چلے گئے۔ یا وہ رونق تھی یا سنسان ہو گیا۔ ایک طرف سے ایک جوان، رستم کا سا کلہ جبڑا، شیر کی مانند گونجتا اور تلوار دو دستی جھاڑتا ہوا، زرہ بکتر گلے میں، اور ٹوپ جلیم کا سر پر، اور طمنچے کی جوڑی کمر میں، کیفی کی طرح بکتا جھکتا نظر آیا۔ اور اس کے پیچھے، دو غلام، بنات کی پوشاک پہنے، ایک تابوت مخمل کاشانی سے مڑھا ہوا، سر پر لئے چلے آتے ہیں۔

میں یہ تماشا دیکھ کر، ساتھ چلنے کا قصد کیا۔ جو کوئی آدمی میری نظر پڑتا، مجھے منع کرتا۔ لیکن میں کب سنتا ہوں؟ رفتہ رفتہ وہ جواں مرد، ایک عالی شان مکان میں چلا۔ میں بھی ساتھ ہوا۔ اُس نے پھرتے ہی چاہا کہ ایک ہاتھ مارے اور مجھے دو ٹکڑے کرے۔ میں نے اُسے قسم دی کہ "میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ میں نے اپنا خون معاف کیا۔ کسو طرح مجھے اس زندگی کے عذاب سے چھڑا دے کہ نہایت تنگ آیا ہوں۔ میں جان بوجھ کر تیرے سامنے آیا ہوں، دیر مت کر۔" مجھے مرنے پر ثابت قدم دیکھ کر، خدا نے اُس کے دل میں رحم ڈالا اور غصہ بھی ٹھنڈا ہوا۔ بہت توجہ اور مہربانی سے پوچھا کہ "تو کون ہے اور کیوں اپنی زندگی سے بیزار ہوا ہے؟"

میں نے کہا "ذرا بیٹھیے تو کہوں۔ میرا قصہ بہت دور دراز ہے اور عشق کے پنجے میں گرفتار ہوں، اس سبب سے لاچار ہوں۔" یہ سن کر اس نے اپنی کمر کھولی اور ہاتھ منہ دھو کر کچھ ناشتہ کیا۔ مجھے بھی باعث ہوا۔ جب فراغت کر کے بیٹھا، بولا "کہہ، تجھ پر کیا گزری؟" میں نے سب واردات اس پیر مرد کی، اور ملکہ کی اور اپنے وہاں جانے کی کہہ سنائی۔ پہلے سن کر رویا اور یہ کہا کہ "اس کم بخت نے کس کس کا گھر گھالا۔ لیکن بھلا، تیرا علاج میرے ہاتھ میں ہے۔ اغلب ہے کہ اس عاصی کے سبب سے تو اپنی مراد کو پہنچے۔ اور تو اندیشہ نہ کر اور خاطر جمع رکھ۔" حجام کو فرمایا کہ "اس کی حجامت کر کے، حمام کروا دے۔" ایک جوڑا کپڑا، اس کے غلام نے لا کر، پہنایا۔ تب مجھ سے کہنے لگا کہ "یہ تابوت جو تو نے دیکھا اُسی شہزادہ مرحوم کا ہے جو قفس میں مقید تھا اُس کو دوسرے وزیر نے، آخر مکر سے مارا۔ اس کی تو نجات ہوئی کہ مظلوم مارا گیا۔ میں اُس کا کوکا ہوں۔ میں نے بھی اس وزیر کو بہ ضرب شمشیر مارا اور پادشاہ کے مارنے کا ارادہ کیا۔ پادشاہ گڑگڑا!

اور سوگند کھانے لگا کہ "میں بے گناہ ہوں؛ میں نے اُسے نامرد جان کر چھوڑ دیا تب سے میرا کام یہی ہے کہ ہر مہینے کی نوچندی جمعرات کو، میں اس تابوت کو اسی طرح، شہر میں لئے پھرتا ہوں اور اس کا ماتم کرتا ہوں۔"

اُس کی زبانی، یہ احوال سننے سے مجھے تسلی ہوئی کہ اگر یہ چاہے گا تو میرا مقصد بر آوے گا۔ خدا نے بڑا احسان کیا، جو ایسے جنونی کو مجھ پر مہربان کیا۔ سچ ہے کہ خدا مہربان ہو تو کل مہربان۔ جب شام ہوئی آفتاب غروب ہوا، اس جوان نے تابوت کو نکالا اور ایک غلام کے عوض، وہ تابوت میرے سر پر دھرا اور اپنے ساتھ لے کر چلا۔ فرمانے لگا کہ "ملکہ کے نزدیک جاتا ہوں، تیری سفارش تا بہ مقدور کروں گا۔ تو ہرگز دم نہ مارو۔ چپکا بیٹھا، سنا کیجو۔" میں نے کہا "جو کچھ صاحب فرماتے ہیں، سو ہی کروں گا خدا تم کو سلامت رکھے، جو میرے احوال پر ترس کھاتے ہو۔" اُس جوان نے قصد پادشاہی باغ کا کیا۔ جب اندر داخل ہوا، ایک چبوترہ سنگِ مرمر کا، ہشت پہلو، باغ کے صحن میں تھا اور اس پر ایک نمگیرہ، سفید بادلے کا، موتیوں کی جھالر لگی ہوئی، الماس کے اِستادوں پر کھڑا تھا، اور ایک مسند مغرق بچھی ہوئی تھی۔ گاؤ تکیہ اور لغلی تکیے، زربفت کے لگے ہوئے۔ وہ تابوت وہاں رکھوایا اور ہم دونوں کو فرمایا کہ "اُس درخت کے پاس جا کر بیٹھو۔"

بعد ایک ساعت کے، مشعل کی روشنی نظر آئی۔ ملکہ آپ، کئی خواصیں پیش پیش اہتمام کرتی ہوئیں تشریف لائیں۔ لیکن اُداسی اور خفگی، چہرے پر ظاہر تھی۔ آکر مسند پر بیٹھیں۔ یہ کوکا ادب سے دست بستہ کھڑا رہا۔ پھر ادب سے، دور، فرش کے کنارے، مؤدب بیٹھا۔ فاتحہ پڑھیں اور کچھ باتیں کرنے لگا میں کان لگائے سن رہا تھا۔ آخر اُس جوان نے کہا کہ "ملکۂ جہاں سلامت! ملک عجم کا شہزادہ، آپ کی خوبیاں اور محبوبیاں، غائبانہ سن کر، اپنی سلطنت کو برباد دے، فقیر بن، مانند ابراہیم ادھم کے، تباہ ہو، اور بڑی محنت کھینچ کر، یہاں تلک آپہنچا ہے۔ سائیں تیرے کارنے، چھوڑا شہر بلخ۔ اور اس شہر میں بہت دنوں سے حیران پریشان پھرتا ہے۔ آخر وہ قصد مرنے کا کر کے میرے ساتھ لگ چلا۔ میں نے تلوار سے ڈرایا، اُس نے گردن آگے دھر دی اور قسم دی کہ 'اب میں یہی چاہتا ہوں، دیر مت کر؛ غرض تمہارے عشق میں ثابت ہے۔ میں نے خوب آزمایا، سب طرح پورا پایا۔ اس سبب سے، اُس کا مذکور، میں درمیان لایا۔ اگر حضور سے اُس کے احوال پر، مسافر جان کر، توجہ ہو تو خدا ترسی اور حق شناسی سے دور نہیں۔"

یہ ذکر ملکہ نے سن کر فرمایا "کہاں ہے؟ اگر شہزادہ ہے تو کیا مضائقہ؟ روبرو آوے۔" وہ

کوکا، وہاں سے اُٹھ کر آیا اور مجھے ساتھ لے کر گیا۔ میں ملکہ کے دیکھنے سے شاد ہوا، لیکن عقل و ہوش برباد ہوئے۔ عالم سکوت کا ہو گیا۔ یہ ہوا کہ نہ پڑا کہ کچھ کہوں۔ ایک دم میں ملکہ سدھاری اور کوکا اپنے مکان کو چلا۔ گھر آ کر بولا کہ "میں نے تیری سب حقیقت، اوّل سے آخر تک کہہ سنائی۔ اور سفارش بھی کی اب تو ہمیشہ رات کو، بلا ناغہ جایا کر اور عیش خوشی منایا کر۔" میں اس کے قدم پر گر پڑا۔ اُس نے گلے لگا لیا۔ تمام دن گھڑیاں گنتا رہا کہ کب سانجھ ہو جو میں جاؤں۔ جب رات ہوئی، میں اُس جوان سے رخصت ہو کر چلا اور پائیں باغ میں، ملکہ کے چبوترے پر، تکیہ لگا کر جا بیٹھا۔

بعد ایک گھڑی کے، ملکہ تن تنہا، ایک خواص کو ساتھ لے کر، آہستہ آہستہ آ کر مسند پر بیٹھیں۔ خوش طالعی سے یہ دن میسّر ہوا۔ میں نے قدم بوس کیا۔ اُنہوں نے سر میرا اٹھا لیا اور گلے سے لگا لیا اور بولیں کہ "اس فرصت کو غنیمت جان اور میرا کہا مان۔ مجھے یہاں سے لے نکل۔ اور کسو، اور ملک کو چل۔" میں نے کہا "چلیے"، یہ کہہ کر ہم دونوں باغ کے باہر تو ہوئے، پر حیرت سے اور خوشی سے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور راہ بھول گئے اور ایک طرف کو چلے جاتے تھے، پر کچھ ٹھکانہ نہیں، پاتے تھے ملکہ برہم ہو کر بولی کہ "اب میں تھک گئی۔ تیرا مکان کہاں ہے؟ جلد چل کر پہنچ۔ نہیں تو، کیا کیا چاہتا ہے میرے پاؤں میں پھپھولے پڑ گئے ہیں، رستے میں کہیں بیٹھ جاؤں گی۔"

میں نے کہا کہ "میرے غلام کی حویلی نزدیک ہے، اب آ پہنچے۔ خاطر جمع رکھو اور قدم اٹھاؤ۔" جھوٹ تو بولا، پر دل میں حیران تھا کہ کہاں لے جاؤں؟ عین راہ پر ایک دروازہ مقفل نظر پڑا۔ جلدی سے، قفل کو توڑ کر، مکان کے بھیتر گئے۔ اچھی حویلی، فرش بچھا ہوا، شراب کے شیشے بھرے، قرینے سے طاق میں دھرے اور باورچی خانے میں نان کباب تیار تھے۔ ماندگی کمال ہو رہی تھی، ایک ایک گلابی، شراب پر لگالی کی، اُس گزک کے ساتھ لی اور ساری رات باہم خوشی کی۔ جب اس چین سے صبح ہوئی، شہر میں غل مچا کہ شہزادی غائب ہوئی۔ محلّہ محلّہ، کوچہ کوچہ، منادی پھرنے لگی۔ اور کٹنیاں اور ہرکارے چھوٹے کہ جہاں سے ہاتھ آوے پیدا کریں۔ اور سب دروازوں پر شہر کے، بادشاہی غلاموں کی چوکی آ بیٹھی۔ گزربانوں کو حکم ہوا کہ بغیر پروانگی، چیونٹی باہر شہر کے، نہ نکل سکے۔ جو کوئی سراغ ملکہ کا لاوے گا، ہزار اشرفی اور خلعت انعام پاوے گا۔ تمام شہر میں کٹنیاں پھرنے اور گھر گھر میں گھسنے لگیں۔

مجھے کم بختی لگی، دروازہ بند نہ کیا۔ ایک بڑھیا، شیطان کی نالہ (اُس کا خدا، کرے منہ کالا) ہاتھ میں تسبیح لٹکائے، برقع اوڑھے، دروازہ کھلا پا کر ندھڑک چلی آئی اور سامنے کھڑے ہو کر، ہاتھ اٹھا کر

دعا دینے لگی کہ "الٰہی، تیری نتھ چوڑی سہاگ کی، سلامت رہے! اور کماؤ کی پگڑی قائم رہے۔ میں غریب رنڈیا فقیرنی ہوں۔ ایک بیٹی میری ہے کہ وہ دو جی سے، پورے دنوں، دردزہ میں مرتی ہے اور مجھ کو اتنی وسعت نہیں کہ آدھی کا تیل، چراغ میں جلاؤں۔ کھانے پینے کو تو کہاں سے لاؤں۔ اگر مرگئی تو گور و کفن کیوں کر کروں گی۔ اور جنی تو دائی جنائی کو کیا دوں گی، اور جچا کو ستھوارا، اچھوانی کہاں سے پلاؤں گی آج دو دن ہوئے ہیں کہ بھوکی پیاسی پڑی ہے۔ اے صاحب زادی، اپنی خیر، کچھ ٹکڑا پارچہ دلا تو اس کو پانی پینے کا ادھار ہو۔"

ملکہ نے ترس کھا کر، اپنے نزدیک بلا کر، چار نان اور کباب اور ایک انگوٹھی، چھنگلیا سے اتار کر حوالے کی کہ "اس کو بیچ باچ کر گہنا پاتا بنا دیجو اور خاطر جمع سے گزران کیجو اور کبھی آیا کیجو، تیرا گھر ہے۔"
اُس نے اپنے دل کا مدعا، جس کی تلاش میں آئی تھی، بہ جنس پایا۔ خوشی سے دعائیں دیتی اور بلائیں لیتی دفع ہوئی۔ ڈیوڑھی میں نان کباب پھینک دیئے۔ مگر انگوٹھی کو مٹھی میں لے لیا کہ پتہ ملکہ کے ہاتھ کا، میرے ہاتھ آیا۔ خدا اس آفت سے جو بچایا چاہے، اس مکان کا مالک، جواں مرد سپاہی، تازی گھوڑے پر چڑھا ہوا، نیزہ ہاتھ لیے شکار بند میں ایک ہرن لٹکائے، آپہنچا۔ اپنی حویلی کا تالا ٹوٹا اور کواڑ کھلے پائے۔ اُس دلالہ کو نکلتے دیکھا۔ مارے غصّے کے، ایک ہاتھ سے، اس کے جھونٹے پکڑ کر لٹکا لیا اور گھر میں آیا۔ اُس کے دونوں پاؤں میں رسّی باندھ کر، ایک درخت کی ٹہنی میں لٹکایا۔ سر تلے، پاؤں اُوپر کئے۔ ایک دم میں، تڑپ تڑپ کر مرگئی۔ اُس مرد کی صورت دیکھ کر یہ ہیبت غالب ہوئی کہ ہوائیاں اُڑنے لگیں اور مارے ڈر کے کلیجہ کانپنے لگا۔ اُس عزیز نے ہم دونوں کو بدحواس دیکھ کر، تسلی دی کہ بڑی نادانی تم نے کی۔ ایسا کام کیا اور دروازہ کھول دیا۔"

ملکہ نے مسکرا کر فرمایا کہ "شاہ زادہ، اپنے غلام کی حویلی کہہ کر، مجھے لے آیا ہے اور مجھ کو پھسلایا۔"
اُس نے التماس کیا کہ "شہزادے نے بیان واقعی کیا جتنی خلق اللہ ہے، پادشاہوں کی لونڈی غلام ہیں۔ اُنہیں کی برکت اور فیض سے، سب کی پرورش اور نباہ ہے۔ یہ غلام، بے دام و درم، زرخرید تمہارا ہے، لیکن بھید چھپانا عقل، مقتضا ہے۔ اے شہزادے، تمہارا اور ملکہ کا اس غریب خانے میں توجہ فرمانا اور تشریف لانا، میری سعادت دونوں جہان کی ہے۔ اور اپنے فدوی کو سرفراز کیا۔ میں نثار ہونے کو تیار ہوں۔ کسو صورت میں جان و مال سے دریغ نہ کروں گا۔ آپ شوق سے آرام فرمائیے۔ اب کوڑی بھر خطرہ نہیں۔ یہ مردار کٹنی اگر سلامت جاتی تو آفت لاتی۔ اب جب تلک مزاج شریف چاہیے بیٹھے رہیے۔ اور جو کچھ درکار ہو اس خانہ زاد کو کہیئے، سب حاضر کرے گا۔ اور بادشاہ تو کیا چیز ہے، تمہاری

خبر فرشتوں کو بھی نہ ہوگی!" اس جوان مرد نے ایسی ایسی باتیں، تسلّی کی، کہیں کہ ٹک خاطر جمع ہوئی۔ تب میں نے کہا "شاباش، تم بڑے مرد ہو۔ اس مروّت کا عوض، ہم سے بھی جب ہو سکے گا تب ظہور میں آوے گا تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے کہا کہ "غلام کا اسم بہزاد خاں ہے۔ غرض چھ مہینے، جتنی شرطِ خدمت کی تھی بہ جان و دل بجا لایا۔ خوب آرام سے گزری۔"

ایک دن مجھے، اپنا ملک اور ماں باپ یاد آئے۔ اس لئے نہایت متفکر بیٹھا تھا۔ میرا چہرہ ملین دیکھ کر، بہزاد خاں روبرو ہاتھ جوڑ کر، کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ "اس فدوی سے اگر کچھ تقصیر، چاکری برداری میں واقع ہوئی ہو، تو ارشاد ہو۔" میں نے کہا "از برائے خدا، یہ کیا مذکور ہے؟ تم نے ایسا سلوک کیا کہ اس شہر میں ایسے آرام سے رہے، جیسے اپنی ماں کے پیٹ میں کوئی رہتا ہے۔ نہیں تو، یہ ایسی حرکت ہم سے ہوئی تھی کہ تنکا تنکا، ہمارا دشمن تھا۔ ایسا دوست ہمارا کون تھا کہ ذرا دم لیتے؟ خدا تمہیں خوش رکھے، بڑے مرد ہو!" تب اس نے کہا "اگر یہاں سے دل برداشتہ ہوا ہو، تو جہاں حکم ہو، وہاں خیر و عافیت سے پہنچا دوں۔" فقیر بولا کہ "اگر اپنے وطن تک پہنچوں تو والدین کو دیکھوں۔ میری تو یہ صورت ہوئی، خدا جانے اُن کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ میں جس واسطے جلا وطن ہوا تھا، میری تو آرزو بر آئی۔ اب ان کی بھی قدم بوسی واجب ہے۔ میری خبر اُن کو کچھ نہیں کہ موا یا جیتا ہے۔ اُن کے دل پر کیا قلق گزرتا ہوگا؟"

وہ جوان مرد بولا کہ "بہت مبارک ہے، چلیئے!" یہ کہہ کے، ایک راس گھوڑا، ترکی، سو کوس چلنے والا اور ایک گھوڑی، جلد، جس کے پر نہیں کٹے تھے، لیکن شائستہ، ملکہ کی خاطر لایا، اور ہم دونوں کو سوار کروایا۔ پھر زرہ بکتر پہن، سلاح باندھ، ادچی بن، اپنے مرکب پر چڑھ بیٹھا اور کہنے لگا "غلام آگے ہو لیتا ہے۔ صاحب، خاطر جمع سے، گھوڑے دبائے ہوئے، چلے آویں۔"

جب شہر کے دروازے پر آیا، ایک نعرہ مارا اور تبر سے قفل کو توڑا اور نگہبانوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر للکارا کہ "بڑ چو دو! اپنے خاوند کو جا کر کہو کہ بہزاد خاں، ملکہ مہر نگار اور شہزادہ کامگار کو، جو تمہارا داماد ہے، ہانکے پکارے لئے جاتا ہے۔ اگر مردمی کا کچھ نشہ ہے تو باہر نکلو اور ملکہ کو چھین لو۔ یہ نہ کہیو کہ چپ چاپ لے گیا۔ نہیں تو قلعے میں بیٹھے آرام کیا کرو۔" یہ خبر بادشاہ کو جلد جا پہنچی۔ اور وزیر میر بخشی کو حکم ہوا "اُن تینوں، بد ذات مفسدوں کو، باندھ لاؤ۔ یا ان کے سر کاٹ کر حضور میں پہنچاؤ۔" ایک دم کے بعد، غٹ فوج کا نمود ہوا، اور تمام زمین و آسمان گرد باد ہو گیا۔ بہزاد خاں نے ملکہ کو اور اس فقیر کو، ایک در میں پل کے، کہ بارہ پلی اور جون پور کے پل کے برابر تھا، کھڑا کیا اور آپ گھوڑے کو ٹنگیا کر اُس فوج کی طرف پھرا اور شیر کی مانند گونج کر، مرکب کو ڈپٹ کر، فوج کے درمیان گھسا۔ تمام لشکر کائی سا

پھٹ گیا، اور یہ دونوں سرداروں تلک جا پہنچا۔ دونوں کے سر کاٹ لئے۔ جب سردار مارے گئے، لشکر تتر بتر ہو گیا۔ وہ کہاوت ہے: سر سے سرداہ، جب بیل پھوٹی، رائی رائی ہو گئی۔ وہ نہیں آپ پادشاہ کتنی فوج بکتر پوشوں کی ساتھ لے کر کمک کو آئے۔ ان کی بھی لڑائی اُس یکہ جوان نے ماردی، شکست فاش کھائی۔

پادشاہ پسپا ہوئے۔ سچ ہے، فتح دادالٰہی ہے۔ لیکن بہزاد خاں نے ایسی جواں مردی کی کہ شاید رستم سے بھی نہ ہو سکتی۔ جب بہزاد خاں نے دیکھا کہ مطلع صاف ہوا، اب کون باقی رہا ہے جو ہمارا پیچھا کرے گا، بے وسواس ہو کر اور خاطر جمع کر، جہاں ہم کھڑے تھے، آیا اور ملکہ کو اور مجھ کو ساتھ لے کر چلا۔ سفر کی عمر کوتاہ ہوتی ہے، تھوڑے عرصے میں اپنے ملک کی سرحد میں جا پہنچے۔ ایک عرضی صحیح سلامت آنے کی، پادشاہ کے حضور میں (جو قبلہ گاہ مجھ فقیر کے تھے) لکھ کر روانہ کی۔ جہاں پناہ پڑھ کر شاد ہوئے، دوگانہ شکر کا ادا کیا، جیسے سوکھے دھان میں پانی پڑا۔ خوش ہو کر سب امیروں کو جلو میں لے کر، اس عاجز کے استقبال کی خاطر، لب دریا آکر کھڑے ہوئے اور نواڑوں کے واسطے، میر بحر کو حکم ہوا۔ میں نے دوسرے کنارے پر سواری پادشاہ کی کھڑی دیکھی۔ قدم بوسی کی آرزو میں گھوڑے کو دریا میں ڈال دیا، ہیلہ مار کر، حضور میں حاضر ہوا۔ مجھے مارے اشتیاق کے کلیجے سے لگا لیا۔

اب ایک اور آفت ناگہانی پیش آئی کہ جس گھوڑے پر میں سوار تھا، شاید وہ بچہ اُسی مادیاں کا تھا جس پر ملکہ سوار تھی، یا جنسیت کے باعث میرے مرکب کو دیکھ کر، گھوڑی نے بھی جلدی کر کر، اپنے تئیں ملکہ سمیت میرے پیچھے دریا میں گرایا اور پیرنے لگی۔ ملکہ نے گھبرا کر باگ کھینچی، وہ منہ کی نرم تھی، الٹ گئی۔ ملکہ غوطے کھا کر، بہ معہ گھوڑی، دریا میں ڈوب گئی کہ پھر اُن دونوں کا نشان نظر نہ آیا۔ بہزاد خاں نے یہ حالت دیکھ کر، اپنے تئیں گھوڑے سمیت، ملکہ کی مدد کی خاطر، دریا میں پہنچایا۔ وہ بھی اُسی بھنور میں آ گیا، پھر نکل نہ سکا۔ بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے، کچھ بس نہ چلا، ڈوب گیا۔ جہاں پناہ نے یہ واردات دیکھ کر، مہاجال منگوا کر، پھنکوایا اور ملاحوں اور غوطہ خوروں کو فرمایا۔ انہوں نے سارا دریا چھان مارا تھا کہ مٹی لے لے آئے۔ پر، وے دونوں ہاتھ نہ آئے۔

یا فقرا! یہ حادثہ ایسا ہوا کہ میں سودائی اور جنونی ہو گیا اور فقیر بن کر یہی کہتا پھرتا تھا:

ان نینوں کا یہی بسیکھ، وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ۔ اگر ملکہ کہیں غائب ہو جاتی یا مر جاتی تو دل کو تسلی آتی۔ پھر تلاش کو نکلتا، یا صبر کرتا۔ لیکن جب نظروں کے روبرو، غرق ہو گئی تو کچھ بس نہ چلا۔

آخر جی میں یہی لہر آئی کہ دریا میں ڈوب جاؤں، شاید اپنے محبوب کو مر کر پاؤں۔

ایک روز رات کو، اُسی دریا میں بیٹھا، اور اپنے ڈوبنے کا ارادہ کر کر، گلے تک پانی میں گیا چاہتا ہوں کہ آگے پاؤں رکھوں اور غوطہ کھاؤں، وہی سوار برقع پوش، جنہوں نے تم کو بشارت دی ہے، آپہنچے، میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دلاسا دیا کہ "خاطر جمع رکھ۔ ملکہ اور بہزاد خاں زندہ ہیں تو اپنی جان، ناحق کیوں کھوتا ہے؟ دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ خدا کی درگاہ سے مایوس مت ہو۔ اگر جیتا رہے گا تو تیری ملاقات، اُن دونوں سے، ایک نہ ایک روز ہو رہے گی۔ اب تو روم کی طرف جا۔ اور بھی دو درویش، دل ریش وہاں گئے ہیں۔ اُن سے تو جب ملے گا، اپنی مراد کو پہنچے گا۔"

یا فقرا! بہ موجب حکم اپنے ہادی کے، میں بھی خدمت شریف میں آکر حاضر ہوا ہوں۔ اُمید قوی ہے کہ ہر ایک، اپنے اپنے مطلب کو پہنچے۔ اس ٹکڑ گدا کا یہ احوال تھا، جو تمام کمال کہہ سنایا۔"

سیر چوتھے درویش کی

چوتھا فقیر اپنی سیر کی حقیقت، رو رو کر، اس طرح دھرانے لگا:

"قصہ، ہماری بے سروپائی کا، اب سنو!
ٹک اپنا دھیان رکھ کے، مرا حال سب سنو!
کس واسطے میں آیا ہوں یاں تک تباہ ہو
سارا بیان کرتا ہوں، اس کا سبب سنو!

یا مرشد اللہ ذرا متوجہ ہو۔ یہ فقیر جو اس حالت میں گرفتار ہے، چین کے بادشاہ کا بیٹا ہے۔ ناز و نعمت سے پرورش پائی اور بہ خوبی تربیت ہوا۔ زمانے کے بھلے بُرے سے کچھ واقف نہ تھا۔ جانتا تھا کہ یونہیں ہمیشہ نبھے گی۔ عین بے فکری میں یہ حادثہ روبکار ہوا: قبلۂ عالم جو والد اس یتیم کے تھے، انہوں نے رحلت فرمائی۔ جان کندنی کے وقت، اپنے چھوٹے بھائی کو (جو میرے چچا ہیں) بلایا اور فرمایا کہ "ہم نے تو سب مال ملک چھوڑ کر، ارادہ کوچ کا کیا، لیکن یہ وصیت میری تم بجا لائیو اور بزرگی کو کام فرمائیو۔ جب تک شہزادہ، جو مالک اس تخت و چھتر کا ہے، جوان ہو، اور شعور سنبھالے، اور اپنا گھر دیکھے بھالے، تم اس کی نیابت کیجو، اور سپاہ و رعیت کو خراب نہ ہونے دیجو۔ جب وہ بالغ ہو، اُس کو سب کچھ سمجھا بجھا کر، تخت حوالے کرنا۔ اور روشن اختر، جو تمہاری بیٹی ہے، اُس سے شادی کر کے، تم سلطنت سے کنارہ پکڑنا۔ اس سلوک سے، بادشاہت ہمارے خاندان میں قائم رہے گی، کچھ خلل نہ آوے گا۔" یہ کہہ کر آپ تو جاں بحق تسلیم ہوئے۔ چچا بادشاہ ہوا اور بندوبست ملک کا کرنے لگا۔ مجھے حکم کیا کہ زنانے محل میں رہا کرے۔ جب تک جوان نہ ہو، باہر نہ نکلے۔ یہ فقیر، چودہ برس کی عمر تک، بیگمات اور خواصوں میں پلا کیا اور کھیلا کودا کیا۔ چچا کی بیٹی سے، شادی کی خبر سن کر، شاد تھا اور اس اُمید پر بے فکر رہتا اور دل میں کہتا کہ اب کوئی دن میں بادشاہت بھی ہاتھ لگے گی اور کتخدائی بھی ہو گی۔ دنیا بہ اُمید قائم ہے۔ ایک حبشی، مبارک نام، کہ والد مرحوم کی خدمت میں تربیت ہوا تھا، اور اس کا بڑا اعتبار تھا، اور صاحب شعور اور نمک حلال تھا، میں اکثر اُس کے نزدیک جا بیٹھتا۔ وہ بھی مجھے بہت پیار کرتا اور میری جوانی دیکھ کر خوش ہوتا اور کہتا کہ "الحمد للہ اے شاہزادے! اب تم جوان ہوئے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ، عنقریب

تمہارا عمو، ظل سبحانی کی نصیحت پر عمل کرے گا۔ اپنی بیٹی، اور تمہارے والد کا تخت، تمہیں دے گا۔"

ایک روز یہ اتفاق ہوا کہ ایک ادنیٰ سہیلی نے بے گناہ، میرے تئیں ایسا کھینچ طمانچہ مارا کہ میرے گال پر پانچوں انگلیوں کا نشان اُبھر آیا۔ میں روتا ہوا مبارک کے پاس آیا۔ اُس نے مجھے گلے سے لگا لیا اور آنسو آستین سے پونچھے اور کہا کہ "چلو آج تمہیں، بادشاہ پاس لے چلوں۔ شاید دیکھ کر مہربان ہو اور لائق سمجھ کر، تمہارا حق تمہیں دے۔" اُسی وقت چچا کے حضور میں لے گیا۔ چچا نے دربار میں نہایت شفقت کی اور پوچھا کہ "کیوں دلگیر ہو، اور آج یہاں کیوں کر آئے؟" مبارک بولا "کچھ عرض کرنے آتے ہیں۔" یہ سن کر خود بخود کہنے لگا کہ "اب میاں کا بیاہ کر دیتے ہیں۔" مبارک نے کہا "بہت مبارک ہے۔" وہ نہیں نجومی اور رمالوں کو روبرو طلب کیا اور اوپری دل سے پوچھا کہ "اس سال کون سا مہینہ، اور کون سا دن، اور گھڑی، مہورت مبارک ہے کہ سرانجام شادی کا کروں؟" انہوں نے مرضی پاکر، گن گنا کر عرض کی کہ "قبلۂ عالم! یہ برس سارا انجس ہے۔ کسی چاند میں، کوئی تاریخ سعد نہیں ٹھہرتی۔ اگر یہ سال، تمام بخیر و عافیت کٹے تو آئندہ کار خیر کے لیے بہتر ہے۔"

بادشاہ نے مبارک کی طرف دیکھا اور کہا "شہزادے کو محل میں لے جا۔ خدا چاہے تو اس سال کے گزرنے سے، اس کی امانت، اس کے حوالے کر دوں گا۔ خاطر جمع رکھے اور پڑھے لکھے۔" مبارک نے سلام کیا اور مجھے ساتھ لیا۔ محل میں پہنچا دیا۔ دو تین دن کے بعد، میں مبارک کے پاس گیا۔ مجھے دیکھتے ہی رونے لگا۔ میں حیران ہوا اور پوچھا کہ "دادا! خیر تو ہے؟ تمہارے رونے کا کیا باعث ہے؟" تب وہ خیرخواہ (کہ مجھے دل و جان سے چاہتا تھا) بولا کہ "میں اُس روز تمہیں اُس ظالم کے پاس لے گیا۔ کاش کہ، اگر یہ جانتا تو نہ لے جاتا!" میں نے گھبرا کر کہا "میرے جانے میں، کیا ایسی قباحت ہوئی؟ کہہ تو سہی۔" تب اُس نے کہا کہ "سب امیر، وزیر، ارکانِ دولت، چھوٹے بڑے، تمہارے باپ کے وقت کے، تمہیں دیکھ کر خوش ہوئے اور خدا کا شکر کرنے لگے کہ "اب ہمارا صاحب زادہ جوان ہوا، اور سلطنت کے لائق ہوا۔ اب کوئی دن میں، حق حقدار کو ملے گا۔ تب ہماری قدردانی کرے گا، اور خانہ زاد موروثیوں کی قدر سمجھے گا۔" یہ خبر اُس بے ایمان کو پہنچی۔ اُس کی چھاتی پر سانپ پھر گیا۔ مجھے خلوت میں بلا کر کہا "اے مبارک! اب ایسا کام کر کہ شہزادے کو کسی فریب سے مار ڈال، اور اس کا خطرہ، میرے جی سے نکال جو میری خاطر جمع ہو۔" تب سے میں بے حواس ہو رہا ہوں کہ تیرا چچا تیری جان کا دشمن ہوا۔" جونہیں مبارک سے، یہ خبر نا مبارک میں نے سنی، بغیر مارے مر گیا اور جان کے ڈر سے اُس کے پاؤں پر گر پڑا کہ "واسطے خدا کے، میں سلطنت سے گزرا۔ کسوطرح میرا جی بچے

اُس غلام باوفا نے، میرا سر اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا اور جواب دیا کہ "کچھ خطرہ نہیں۔ ایک تدبیر مجھے سوجھی ہے، اگر راست آئی تو کچھ پرواہ نہیں۔ زندگی ہے تو سب کچھ ہے۔ اغلب ہے کہ اس فکر سے، تیری جان بھی بچے اور اپنے مطلب سے کامیاب ہو" یہ بھروسا دے کر، مجھے ساتھ لے کر اُس جگہ، جہاں بادشاہ مغفور، یعنی والد اس فقیر کے، سوتے بیٹھتے تھے، گیا اور میری بہت خاطر جمع کی۔ وہاں ایک کرسی بچھی تھی۔ ایک طرف مجھے کہا، اور ایک طرف آپ پکڑ کر، صندلی کو سرکایا اور کرسی کے تلے کا فرش اٹھایا اور زمین کو کھودنے لگا۔ یک بارگی ایک کھڑکی نمود ہوئی کہ زنجیر اور قفل، اس میں لگا ہے مجھے بلایا۔ میں اپنے دل میں، مقرر یہ سمجھا کہ میرے ذبح کرنے اور گاڑ دینے کو، یہ گڑھا اس نے کھودا ہے۔ موت آنکھوں کے آگے پھر گئی۔ لاچار، چپکے چپکے، کلمہ پڑھتا ہوا نزدیک گیا۔ دیکھتا ہوں تو اس دریچے کے اندر عمارت ہے اور چار مکان ہیں۔ ہر ایک دالان میں، دس دس خمیں، سونے کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی، لٹکتی ہیں اور ہر ایک گولی کے منہ پر، ایک سونے کی اینٹ، اور ایک بندر جڑاؤ کا بنا ہوا، بیٹھا ہے۔ انتالیس گولیاں، چاروں مکان میں گنیں اور ایک خم کو دیکھا کہ مونہا منہ، اشرفیاں بھری ہیں۔ اُس پہ نہ میمون ہے نہ خشت ہے۔ اور ایک حوض، جواہر سے لبالب بھرا ہوا، دیکھا۔ میں نے مبارک سے پوچھا کہ "اے دادا! یہ کیا طلسم ہے اور کس کا مکان ہے اور یہ کس کام کے ہیں؟" بولا کہ "یہ بوزنے جو دیکھتے ہو، اُن کا یہ ماجرا ہے کہ تمہارے باپ نے جوانی کے وقت سے، ملک صادق (جو بادشاہ جنوں کا ہے) اُس کے ساتھ دوستی اور آمد و رفت پیدا کی تھی۔ چنانچہ ہر سال میں، ایک دفعہ، کئی طرح کی تحفہ خوشبوئیں اور اس ملک کی سوغاتیں، لے جاتے اور ایک مہینے کے قریب، اُس کی خدمت میں رہتے۔ جب رخصت ہوتے، تو ملک صادق ایک بندر زمرد کا، دیتا۔ ہمارا بادشاہ اُسے لا کر اس تہہ خانے میں رکھتا۔ اس بات سے سوائے میرے کوئی دوسرا مطلع نہ تھا۔ ایک مرتبہ غلام نے عرض کی کہ "جہاں پناہ! لاکھوں روپے کے تحفے لے جاتے ہیں اور وہاں سے ایک بوزنہ پتھر کا، مردہ، آپ لے آتے ہیں۔ اس کا آخر فائدہ کیا ہے؟" جواب میری اس بات کا، مسکرا کر فرمایا "خبردار، کہیں ظاہر نہ کیجو، خبر شرط ہے۔ یہ ایک ایک میمون بے جان، جو تو دیکھتا ہے، ہر ایک کے، ہزار دیو زبردست، تابع اور فرماں بردار ہیں۔ لیکن جب تک میرے پاس، چالیسوں بندر، پورے جمع نہ ہو ویں تب تک یہ سب نکمے ہیں، کچھ کام نہ آویں گے، سو ایک بندر کی کمی تھی کہ اُسی برس بادشاہ نے وفات پائی۔

تنی محنت کچھ نیک نہ لگی۔ اس کا فائدہ ظاہر نہ ہوا۔ اے شہزادے تیری بہ ... کسی کی

دیکھ کر مجھے یاد آیا اور یہ جی میں ٹھہرایا، کسو طرح تجھ کو، ملک صادق کے پاس لے چلوں اور تیرے چچا کا ظلم، بیان کروں۔ غالب ہے کہ وہ دوستی، تمہارے باپ کی، یاد کر کر، ایک بوزنہ جو باقی ہے، تجھے دے۔ تب اُن کی مدد سے، تیرا ملک تیرے ہاتھ آوے اور چین ماچین کی سلطنت تُو، بہ خاطر جمع، کرے۔ اور بالفعل، اس حرکت سے تیری جان بچتی ہے۔ اگر اور کچھ نہ ہوا، تو اس ظالم کے ہاتھ سے، سوائے اس تدبیر کے، اور کوئی صورت مخلصی کی نظر نہیں آتی۔" میں نے اُس کی زبانی، یہ سب سن کر کہا کہ "دادا جان! اب تو میری جان کا مختار ہے۔ جو میرے حق میں بھلا ہو، سو کر۔" میری تسلی کر کے، آپ عطر اور بخور، اور جو کچھ وہاں کے لے جانے کی خاطر مناسب جانا، خرید کرنے بازار میں گیا۔

دوسرے دن، میرے اُس کافر چچا کے پاس (جو بجائے ابوجہل کے تھا) گیا اور کہا "جہاں پناہ! شہزادے کے مار ڈالنے کی ایک صورت دل میں ٹھہرائی ہے، اگر حکم ہو تو عرض کروں۔" وہ کم بخت خوش ہو کر بولا "وہ کیا تدبیر ہے؟" تب مبارک نے کہا کہ "اس کے مار ڈالنے میں سب طرح آپ کی بدنامی ہے، مگر میں اُسے باہر جنگل میں لے جا کر ٹھکانے لگاؤں اور گاڑھ داب کر چلا آؤں، ہرگز کوئی محرم نہ ہوگا کہ کیا ہوا۔" یہ بندش، مبارک سے سن کر بولا کہ "بہت مبارک! میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ سلامت نہ رہے۔ اُس کا دغدغہ میرے دل میں ہے، اگر مجھے اس فکر سے چھڑا دے گا تو اس خدمت کے عوض بہت کچھ پاوے گا۔ جہاں تیرا جی چاہے، لے جا کے کھپا دے اور مجھے یہ خوشخبری لا دے۔"

مبارک نے، بادشاہ کی طرف سے اپنی دل جمعی کر کے، مجھے ساتھ لیا اور دے تحفے لے کر، آدھی رات کو، شہر سے کوچ کیا اور اُتر کی سمت چلا۔ ایک مہینے تک پیہم چلا گیا۔ ایک روز رات کو چلے جاتے تھے جو مبارک بولا کہ "شکر خدا کا، اب منزلِ مقصود کو پہنچے۔" میں نے سن کر کہا کہ "دادا! یہ تو نے کیا کہا؟" کہنے لگا "اے شہزادے! جنوں کا لشکر، کیا نہیں دیکھتا؟" میں نے کہا "مجھے تیرے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔" مبارک نے ایک سرمہ دانی نکال کر، سلیمانی سرمے کی سلائیاں، میری دونوں آنکھوں میں پھیر دیں۔ دو نہیں، جنوں کی خلقت، اور لشکر کے تنبو قنات، نظر آنے لگے لیکن سب خوش رو اور خوش لباس مبارک کو پہچان کر، ہر ایک، آشنائی کی راہ سے، گلے ملتا اور مزاحیں کرتا۔

آخر جاتے جاتے، بادشاہی سراچوں کے نزدیک گئے اور بارگاہ میں داخل ہوئے۔ دیکھتا ہوں تو روشنی، قرینے سے روشن ہے اور صندلیاں طرح بہ طرح کی، دو رویہ بچھی ہیں اور عالم فاضل، درویش اور امیر، وزیر، میر بخشی، دیوان اُن پر بیٹھے ہیں۔ اور لیسا دل، گزر بردار، احدی، چیلے، ہاتھ

باندھے کھڑے ہیں۔ اور درمیان میں، ایک تخت مرصع کا، بچھا ہے۔ اُس پر ملک صادق، تاج اور چار قُب موتیوں کی پہنے ہوئے، مسند پر تکیے لگائے، بڑی شان و شوکت سے بیٹھا ہے۔ میں نے نزدیک جا کر سلام کیا۔ مہربانگی سے بیٹھنے کا حکم کیا۔ پھر کھانے کا چرچا ہوا۔ بعد فراغت کے دسترخوان بڑھایا گیا۔ تب مبارک کی طرف متوجہ ہو کر، احوال میرا پوچھا۔ مبارک نے کہا کہ "اب ان کے باپ کی جگہ پر، چچا ان کا، بادشاہت کرتا ہے اور ان کا دشمن جانی ہوا ہے۔ اس لئے میں انہیں، وہاں سے لے بھاگ کر، آپ کی خدمت میں لایا ہوں کہ یتیم ہیں اور سلطنت ان کا حق ہے۔ لیکن بغیر مربی، کسو سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ حضور کی دستگیری کے باعث اس مظلوم کی پرورش ہوتی ہے۔ ان کے باپ کی خدمت کا حق یاد کر کے، ان کی مدد فرمائیے اور وہ چالیسواں بند رعنایت کیجئے، جو چالیسوں پورے ہوں اور یہ اپنے حق کو پہنچ کر، تمہارے جان و مال کو دعا دیں۔ سوائے صاحب کی پناہ کے، کوئی ان کا ٹھکانا نظر نہیں آتا۔"

یہ تمام کیفیت سن کر، صادق نے تامل کر کے کہا کہ "واقعی، حقوق خدمت اور دوستی، بادشاہ مغفور کے، ہمارے اوپر بہت تھے اور یہ بیچارا، تباہ ہو کر، اپنی سلطنت موروثی چھوڑ کر، جان بچانے کے واسطے، یہاں تک آیا ہے اور ہمارے دامن دولت میں پناہ لی ہے۔ تامقدور کسو طرح، ہم سے کمی نہ ہوگی اور درگزر نہ کروں گا۔ لیکن ایک کام ہمارا ہے، اگر وہ اس سے ہو سکا اور خیانت نہ کی اور بخوبی انجام دیا اور اس امتحان میں پورا اُترا، تو میں قول و قرار کرتا ہوں کہ زیادہ بادشاہ سے سلوک کروں گا اور جو یہ چاہے گا سو دوں گا۔" میں نے ہاتھ باندھ کر التماس کیا کہ "اس فدوی سے، تابہ مقدور، جو خدمت سرکار کی ہو سکے گی، بہ سر و چشم بجالا دے گا اور اس کو خوبی و دیانت داری اور ہوشیاری سے کرے گا اور اپنی سعادت، دونوں جہان کی، سمجھے گا۔" فرمایا کہ "تو ابھی لڑکا ہے، اس واسطے بار بار تاکید کرتا ہوں، مبادا خیانت کرے اور آفت میں پڑے۔" میں نے کہا "خدا، بادشاہ کے اقبال سے، آسان کرے گا اور میں حتی المقدور کوشش کروں گا اور امانت حضور تک لے آؤں گا۔"

یہ سن کر ملک صادق نے مجھ کو قریب بلایا اور کاغذ، دستکی سے نکال کر، میرے تئیں دکھلایا اور کہا "یہ جس شخص کی شبیہ ہے، اُسے جہاں سے جانے، تلاش کر کے، میری خاطر پیدا کر کے لا اور جس گھڑی تو اُس کا نام و نشان پاوے اور سامنے جاوے، میری طرف سے بہت اشتیاق ظاہر کیجو۔ اگر یہ خدمت تجھ سے سرانجام ہوئی تو جتنی توقع، تجھے منظور ہے، اُس سے زیادہ غور و پرداخت کی جاوے گی۔ و الا، جیسا کرے گا ویسا پاوے گا۔" میں نے اُس کاغذ کو جو دیکھا، ایک تصویر

نظر پڑی کہ غش سا آنے لگا۔ بہ زور، مارے ڈر کے، اپنے تئیں سنبھالا اور کہا "بہت خوب، میں رخصت ہوتا ہوں۔ اگر خدا کو میرا بھلا کرنا ہے تو، بہ موجب حکم حضور کے، مجھ سے عمل میں آوے گا۔" یہ کہہ کر، مبارک کو ہمراہ لے کر، جنگل کی راہ لی۔ گاؤں گاؤں، بستی بستی، شہر شہر، ملک ملک، پھرنے لگا اور ہر ایک سے اُس کا نام و نشان تحقیق کرنے۔ کسو نے نہ کہا کہ ہاں میں جانتا ہوں یا کسی سے مذکور سنا ہے۔ سات برس تک، اسی عالم میں حیرانی و پریشانی سہتا ہوا، ایک نگر میں وارد ہوا عمارت عالی اور آباد لیکن وہاں کا ہر ایک متنفس، اسم اعظم پڑھتا تھا اور خدا کی عبادت بندگی کرتا تھا۔

ایک اندھا ہندوستانی فقیر، بھیک مانگتا نظر آیا لیکن کسو نے ایک کوڑی یا ایک نوالہ نہ دیا۔ مجھے تعجب آیا اور اُس کے اُوپر رحم کھایا۔ جیب میں سے ایک اشرفی نکال کر اُس کے ہاتھ دی۔ وہ لے کر بولا کہ "اے داتا! خدا تیرا بھلا کرے۔ تو شاید مسافر ہے۔ اس شہر کا باشندہ نہیں" میں نے کہا "فی الواقع، سات برس سے میں تباہ ہوا ہوں۔ جس کام کو نکلا ہوں، اس کا سراغ نہیں ملتا۔ آج اس بلدے میں آ پہنچا ہوں۔" وہ بوڑھا دعائیں دے کر چلا، میں اُس کے پیچھے لگ لیا۔ باہر شہر کے، ایک مکان عالی شان نظر آیا۔ وہ اس کے اندر گیا۔ میں بھی چلا۔ دیکھا تو عمارت جا بجا گر پڑی ہے اور بے مرمت ہو رہی ہے۔

میں نے دل میں کہا کہ "یہ محل، لائق بادشاہوں کے ہے۔ جس وقت تیاری اس کی ہوگی، کیا ہی مکان دلچسپ بنا ہوگا! اور اب تو ویرانی سے کیا صورت بن رہی ہے! پر معلوم نہیں کہ اجاڑ کیوں پڑا ہے؟ اور یہ نابینا اس محل میں کیوں بستا ہے؟" وہ کور، لاٹھی ٹیکتا ہوا، چلا جاتا تھا کہ ایک آواز آئی جیسے کوئی کہتا ہے کہ "اے باپ! خیر تو ہے، آج سویرے کیوں پھرے آتے ہو؟" پیر مرد نے سن کر جواب دیا کہ "بیٹی! خدا نے ایک جوان مسافر کو میرے احوال پر مہربان کیا۔ اُس نے ایک مہر مجھ کو دی۔ بہت دنوں سے، پیٹ بھر کر، اچھا کھانا نہ کھایا تھا۔ سو گوشت، مصالح، گھی، تیل آٹا، لون مول لیا اور تیری خاطر کپڑا جو ضرور تھا، خرید کیا۔ اب اس کو قطع کر، اور سی کر پہن۔ اور کھانا پکا، تو کھا پی کے اُس سخی کے حق میں دعا دیں۔ اگرچہ مطلب اُس کے دل کا معلوم نہیں، پر خدا دانا بینا ہے، ہم بے کسوں کی دعا قبول کرے۔" میں نے یہ احوال اُس کی فاقہ کشی کا جو سنا، بے اختیار جی میں آیا کہ بیس اشرفیاں اور اُس کو دوں لیکن آواز کی طرف دھیان جو گیا تو ایک عورت دیکھی کہ ٹھیک وہ تصویر اُسی معشوق کی تھی۔ تصویر کو نکال کر مقابل کیا، سر مو تفاوت نہ دیکھا۔ ایک نعرہ

دل سے نکلا اور بے ہوش ہوا۔ مبارک میرے تئیں، بغل میں لے کر بیٹھا اور پنکھا کرنے لگا۔ مجھ میں ذرا سا ہوش آیا، اُسی کی طرف تاک رہا تھا جو مبارک نے پوچھا کہ "تم کو کیا ہو گیا؟" ابھی منہ سے جواب نہیں نکلا وہ نازنین بولی کہ "اے جوان! خدا سے ڈر اور بیگانے ستر پر نگاہ مت کر۔ حیا اور شرم سب کو ضرور ہے۔"

اس لیاقت سے گفتگو کی کہ میں اس کی صورت اور سیرت پر محو ہو گیا۔ مبارک، میری خاطر داری بہت سی کرنے لگا۔ لیکن دل کی حالت کی، اُس کو کیا خبر تھی؟ لاچار ہو کر میں پکارا کہ "اے خدا کے بندو اور اس مکان کے رہنے والو! میں غریب مسافر ہوں۔ اگر اپنے پاس مجھے بلاؤ اور رہنے کو جگہ دو تو بڑی بات ہے۔" اُس اندھے نے نزدیک بلایا اور آواز پہچان کر گلے لگایا، اور جہاں وہ گلبدن بیٹھی تھی، اُس مکان میں لے گیا۔ وہ ایک کونے میں چھپ گئی۔ اُس بوڑھے نے مجھ سے پوچھا کہ "اپنا ماجرا کہہ کہ کیوں گھر بار چھوڑ کر اکیلا پڑا پھرتا ہے اور تجھے کس کی تلاش ہے؟" میں نے ملک صادق کا نام نہ لیا اور وہاں کا، کچھ ذکر مذکور نہ کیا۔ اس طور سے کہا کہ "یہ بے کس، شہزادہ چین و ماچین کا ہے۔ چنانچہ میرے ولی نعمت، ہنوز بادشاہ ہیں۔ ایک سوداگر سے، لاکھوں روپے دے کر، یہ تصویر مول لی تھی اس کے دیکھنے سے سب ہوش آرام جاتا رہا۔ اور فقیر کا بھیس کر کر، تمام دنیا چھان ماری۔ اب یہاں میرا مطلب ملا ہے، سو تمہارا اختیار ہے۔"

یہ سن کر، اندھے نے ایک آہ ماری اور بولا "اے عزیز! میری لڑکی بڑی مصیبت میں گرفتار ہے۔ کسو بشر کی مجال نہیں کہ اس سے نکاح کرے اور پھل پاوے۔" میں نے کہا کہ "اُمیدوار ہوں کہ مفصّل بیان کرو۔" تب اس مرد عجمی نے، اپنا ماجرا، اس طور سے ظاہر کیا کہ "سن اے پادشاہ زادے! میں رئیس اور اکابر، اس کم بخت شہر کا ہوں۔ میرے بزرگ، نام آور اور عالی خاندان تھے۔ حق تعالیٰ نے، یہ بیٹی مجھے عنایت کی۔ جب بالغ ہوئی تو اس کی خوبصورتی، اور نزاکت، اور سلیقے کا شور ہوا اور سارے ملک میں مشہور ہوا کہ فلانے کے گھر میں، ایسی لڑکی ہے کہ اُس کے حسن کے مقابل، حور پری شرمندہ ہے۔ انسان کا تو کیا منہ ہے کہ برابری کرے؟ یہ تعریف اس شہر کے شہزادے نے سنی۔ غائبانہ، دیکھے بھالے بغیر، عاشق ہوا۔ کھانا پینا چھوڑ دیا۔ اٹھوائی کھٹوائی لے کر پڑا۔

"آخر بادشاہ کو یہ بات معلوم ہوئی۔ میرے تئیں، رات کو خلوت میں بلایا اور یہ مذکور درمیان میں لایا اور مجھے باتوں میں پھسلایا، حتیٰ کہ نسبت ناتا کرنے میں راضی کیا۔ میں بھی سمجھا کہ جب بیٹی گھر میں پیدا ہوئی تو کسو نہ کسو سے بیاہنا ہی چاہیئے۔ پس اس سے کیا بہتر ہے کہ بادشاہ زادے سے

منسوب کردوں؟ اس میں پادشاہ بھی منت دار ہوتا ہے۔ میں قبول کر کے رخصت ہوا۔ اُسی دن سے دونوں طرف، تیاری بیاہ کی، ہونے لگی۔ ایک روز اچھی ساعت میں، قاضی، مفتی، عالم، فاضل، اکابر سب جمع ہوئے۔ نکاح باندھا گیا اور مہر معیّن ہوا۔ دُلہن کو، بڑی دھوم دھام سے، لے گئے سب رسم رسومات کر کے، فارغ ہوئے۔ نوشہ نے رات کو، جب قصد جماع کا کیا، اس مکان میں ایک شور وغل ایسا ہوا کہ جو باہر لوگ چوکی میں تھے، حیران ہوئے۔ دروازہ کوٹھڑی کا کھول کر چاہا، دیکھیں کہ یہ کیا آفت ہے۔ اندر سے ایسا بند تھا کہ کواڑ کھول نہ سکے۔ ایک دم میں، وہ رونے کی آواز بھی کم ہوئی پٹ کی چول اکھاڑ کر، دیکھا تو دولہا سر کٹا ہوا، پڑا تڑپتا ہے اور دلہن کے منہ میں سے کف چلا جاتا ہے اور اسی مٹی لہو میں، لتھڑی ہوئی، بے حواس پڑی، لوٹتی ہے۔

"یہ قیامت دیکھ کر سب کے ہوش جاتے رہے۔ ایسی خوشی میں یہ غم ظاہر ہوا۔ پادشاہ کو خبر پہنچی سر پیٹتا ہوا دوڑا۔ تمام ارکان سلطنت کے، جمع ہوئے، پر کسی کی عقل کام نہیں کرتی کہ اس احوال کو دریافت کرے۔ نہایت کو، پادشاہ نے اُس تلق کی حالت میں، حکم کیا کہ "اس کم بخت، بھونڈپیری دلہن کا بھی، سر کاٹ ڈالو۔" یہ بات پادشاہ کی زبان سے جونہی نکلی، پھر ویسا ہی ہنگامہ برپا ہوا۔ پادشاہ ڈرا اور اپنی جان کے خطرے میں نکل بھاگا اور فرمایا کہ "اسے محل سے باہر نکال دو۔" خواصوں نے اس لڑکی کو، میرے گھر پہنچا دیا۔ یہ چرچا دنیا میں مشہور ہوا، جن نے سنا حیران ہوا اور شہزادے کے مارے جانے کے سبب سے، خود پادشاہ اور جتنے باشندے اس شہر کے ہیں، میرے دشمن جانی ہوئے۔

"جب ماتم داری سے فراغت ہوئی اور چہلم ہو چکا، پادشاہ نے ارکانِ دولت سے صلاح پوچھی کہ "اب کیا کیا چاہیے؟" سبھوں نے کہا "اور تو کچھ ہو نہیں سکتا، بظاہر دل کی تسلی اور صبر کے واسطے اُس لڑکی کو اُس کے باپ سمیت مروا ڈالیے، اور گھر بار ضبط کر لیجیے۔" جب میری یہ سزا مقرر کی کوتوال کو حکم ہوا۔ اُس نے آ کر چاروں طرف سے میری حویلی کو گھیر لیا اور نرسنگا دروازے پر بجایا، اور چاہا کہ اندر گھسیں اور پادشاہ کا حکم بجا لاویں۔ غیب سے، اینٹ پتھر ایسے برسنے لگے کہ تمام فوج تاب نہ لا سکی۔ اپنا سر منہ بچا کر، جیدھر تیدھر بھاگی۔ اور ایک آواز مہیب، پادشاہ کے محل میں، اپنے کانوں سنی کہ "کیوں کم بخت، آئی ہے؟ کیا شیطان لگا ہے؟ بھلا چاہتا ہے تو اس نازنیں کے احوال کا، متعرض نہ ہو۔ نہیں تو، جو کچھ تیرے بیٹے نے اس سے شادی کر کر، دیکھا، تو بھی اس کی دشمنی سے دیکھے گا۔ اب اگر اُن کو ستا دے گا تو سزا پا دے گا۔"

پادشاہ کو مارے دہشت کے، تپ چڑھی، وونہیں حکم کیا کہ "ان بدبختوں سے کوئی مزاحم نہ ہو۔"

کچھ کہو نہ سنو۔ حویلی میں پڑا رہنے دو۔ زور ظلم اُن پر نہ کرو۔ اُس دن سے عامل، بائو بتاس جان کر، دعا تعویز، اور سیانے، جنتر منتر کرتے ہیں اور سب باشندے اس شہر کے اسم اعظم اور قرآن مجید پڑھتے ہیں۔ مدّت سے یہ تماشا ہو رہا ہے، لیکن اب تک کچھ اسرار معلوم نہیں ہوتا اور مجھے بھی ہرگز اطلاع نہیں مگر اس لڑکی سے ایک بار پوچھا کہ "تم نے اپنی آنکھوں سے کیا دیکھا تھا؟" یہ بولی کہ اور تو کچھ میں نہیں جانتی، لیکن یہ نظر آیا کہ جس وقت میرے خاوند نے، قصد مباشرت کا کیا، چھت پھٹ کر، ایک تخت مرصّع کا نکلا، اُس پر ایک جوان خوبصورت، شاہانہ لباس پہنے ہوئے بیٹھا تھا اور ساتھ بہت سے آدمی اہتمام کرتے ہوئے اُس مکان میں آئے اور شہزادے کے قتل کے مستعد ہوئے۔ وہ شخص سردار، میرے نزدیک آیا اور بولا "کیوں جانی! اب ہم سے کہاں بھاگو گی؟" اُن کی صورتیں آدمی کی سی تھیں، لیکن پاؤں بکری کے سے نظر آئے۔ میرا کلیجہ دھڑکنے لگا اور خوف سے غش میں آگئی۔ پھر مجھے کچھ سدھ نہیں کہ آخر کیا ہوا۔"

"تب سے میرا یہ احوال ہے کہ اس چھوٹے مکان میں، ہم دونوں جی، پڑے رہتے ہیں۔ پادشاہ کے غصّے کے باعث، اپنے رفیق سب جدا ہو گئے اور میں گدائی کرنے جو نکلتا ہوں تو کوئی کوڑی نہیں دیتا، بلکہ دکان پر کھڑے رہنے کے روادار نہیں۔ اس کم بخت لڑکی کے بدن پر، لتا نہیں کہ سر چھپا دے اور کھانے کو میسّر نہیں، جو پیٹ بھر کھاوے۔ خدا سے یہ چاہتا ہوں کہ موت ہماری آوے یا زمین پھٹے اور یہ نامنشدنی سماوے۔ اس جینے سے مرنا بھلا ہے۔ خدا نے شاید ہمارے تئیں واسطے تجھے بھیجا ہے جو تو نے رحم کھا کر ایک مہر دی۔ کھانا بنایا، خدا کی درگاہ میں شکر کیا اور تجھے دعا دی۔ اگر اس پر آسیب، جن یا پری کا، نہ ہوتا تو تیری خدمت میں، لونڈی کی جگہ دیتا اور اپنی سعادت جانتا۔ یہ احوال اس عاجز کا ہے۔ تو اس کے درپے مت ہو، اور اس قصد سے درگزر۔"

یہ سب ماجرا سن کر، میں نے بہت منت و زاری کی کہ مجھے اپنی فرزندی میں قبول کر۔ جو میری قسمت میں بدا ہوگا سو ہوگا۔ وہ پیر مرد ہرگز راضی نہ ہوا۔ شام جب ہوئی، اُس سے رخصت ہو کر، سرا میں آیا۔ مبارک نے کہا "آپ کو شہزادے! مبارک ہو، خدا نے اسباب تو درست کیا ہے، بارے یہ محنت اکارت نہ گئی۔" میں نے کہا "آج کتنی خوشامد کی، پر وہ اندھا بے ایمان، راضی نہیں ہوتا۔ خدا جانے دیوے گا یا نہیں۔" پر میرے دل کی یہ حالت تھی کہ رات کاٹنی مشکل ہوئی کہ کب صبح ہو، تو پھر جا کر حاضر ہوں۔ کبھو یہ خیال آتا تھا، اگر وہ مہربان ہو اور قبول کرے تو مبارک؛

ملک صادق کی خاطر لے جائے گا۔ پھر کہتا، بھلا ہاتھ تو آوے، مبارک کو مناوتا کر، میں عیش کروں گا پھر جی میں یہ خطرہ آتا کہ اگر مبارک بھی قبول کرے تو جنوں کے ہاتھ سے وہی نوبت میری ہوگی جو بادشاہ زادے کی ہوئی اور اس شہر کا بادشاہ کب چاہے گا کہ اس کا بیٹا مارا جائے اور دوسرا خوشی منائے؟

تمام رات نیند اُچاٹ ہوگئی اور اسی منصوبے کے الجھیڑے میں کٹی۔ جب روزِ روشن ہوا میں چلا چوک میں سے، اچھے اچھے تھان، پوشاکی اور گوٹا کناری اور میوہ خشک و تر خرید کر کے، اُس بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ نہایت خوش ہو کر بولا کہ "سب کو اپنی جان سے زیادہ کچھ عزیز نہیں، پر اگر میری جان بھی تیرے کام آوے تو دریغ نہ کروں اور اپنی بیٹی ابھی تیرے حوالے کروں۔ لیکن یہی خوف آتا ہے کہ اس حرکت سے، تیری جان کو خطرہ نہ ہو کہ یہ داغ لعنت کا، میرے اُوپر تا قیامت رہے۔" میں نے کہا "اب اس بستی میں سکیں واقع ہوں اور تم، میرے دین و دنیا کے باپ ہو۔ میں اس آرزو میں، مدت سے، کیا کیا تباہی اور پریشانی کھینچتا ہوا، اور کیسے کیسے صدمے اٹھاتا ہوا، یہاں تک آیا اور مطلب کا بھی سراغ پایا۔ خدا نے تمہیں بھی مہربان کیا، جو بیاہ دینے پر رضامند ہوئے، لیکن میرے واسطے آگا پیچھا کرتے ہو۔ ذرا منصف ہو کر غور فرماؤ تو عشق کی تلوار سے، سر بچانا اور اپنی جان کو چھپانا، کس مذہب میں درست ہے؟ ہر چہ باد ا باد، میں نے سب طرح اپنے تئیں برباد دیا ہے معشوق کے وصال کو میں زندگی سمجھتا ہوں۔ اپنے مرنے جینے کی، مجھے کچھ پروا نہیں۔ بلکہ اگر نا اُمید ہوں گا، تو بن اجل مر جاؤں گا اور تمہارا، قیامت میں دامن گیر ہوں گا۔"

غرض اس گفت و شنید اور ہاں ناں میں، قریب ایک مہینے کے، خوف و رجا میں، گزرا۔ ہر روز اُس بزرگ کی خدمت میں دوڑا جاتا اور خوشامد برآمد کیا کرتا۔ اتفاقاً وہ بوڑھا کاہلی ہوا میں اُس کی بیمارداری میں حاضر رہا۔ ہمیشہ، قارورہ حکیم پاس لے جاتا۔ جو نسخہ لکھ دیتا، اُسی ترکیب سے بنا کر پلاتا اور شولا اور غذا، اپنے ہاتھ سے پکا کر، کوئی نوالا کھلاتا۔ ایک دن مہربان ہو کر کہنے لگا۔ "اے جوان! تو بڑا ضدی ہے، میں نے ہر چند ساری قباحتیں کہہ سنائیں اور منع کرتا ہوں کہ اس کام سے باز آ۔ جی ہے تو جہان ہے، پر خواہ مخواہ، کنویں گرا چاہتا ہے۔ اچھا آج اپنی لڑکی سے تیرا مذکور کروں گا، دیکھوں وہ کیا کہتی ہے۔"

یا فقیر اللہ! یہ خوش خبری سن کر، میں ایسا پھولا کہ کپڑوں میں نہ سمایا۔ آداب بجا لایا اور کہا کہ "اب آپ نے میرے جینے کی فکر کی۔" رخصت ہو کر مکان پر آیا اور تمام شب مبارک سے یہی ذکر مذکور رہا

کہاں کی نیند اور کہاں کی بھوک؟ صبح کو، نور کے ترکے، پھر جا کر موجود ہوا۔ سلام کیا۔ فرمانے لگا کہ "دو اپنی بیٹی ہم نے تم کو دی۔ خدا مبارک کرے۔ تم دونوں کو خدا کی حفظ و امان میں سونپا۔ جب تلک میرے دم میں دم ہے، میری آنکھوں کے سامنے رہو۔ جب میری آنکھ مند جائے گی، جو تمہارے جی میں آوے گا سو کیجیو۔ مختار ہو۔"

کتنے دن پیچھے، وہ مرد بزرگ، جاں بحق تسلیم ہوا۔ رو پیٹ کر تجہیز و تکفین کیا۔ بعد تیجے کے، اُس نازنین کو مبارک، ڈولے کر کر، کاروان سرا میں لے آیا اور مجھ سے کہا کہ "یہ امانت ملک صادق کی ہے۔ خبردار، خیانت نہ کیجو اور یہ محنت مشقت برباد نہ دیجو۔" میں نے کہا "اے کاکا! ملک صادق یہاں کہاں ہے؟ دل نہیں مانتا۔ میں کیونکر صبر کروں؟ جو کچھ ہو سو ہو، جیوں یا مروں، اب تو عیش کر لوں۔" مبارک نے خفا ہو کر ڈانٹا کہ "لڑکپن نہ کرو۔ ابھی ایک دم میں، کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ ملک صادق کو دور جانتے ہو، جو اُس کا فرمانا نہیں مانتے ہو؟ اُس نے چلتے وقت، پہلے ہی، اُونچ نیچ سب سمجھا دی ہے۔ اگر اُس کے کہنے پر رہو گے اور صحیح سلامت اُس کو وہاں تک لے چلو گے تو وہ بھی بادشاہ ہے، شاید تمہاری محنت پر توجہ کر کے، تمہوں کو بخش دے تو کیا اچھی بات ہووے۔ پیت کی پیت رہے، اور میت کا میت ہاتھ لگے۔"

بارے، اُس کے ڈرانے اور سمجھانے سے، میں حیران ہو کر چپکا ہو رہا۔ دو سانڈنیاں خریدیں اور کجاووں پر سوار ہو کر، ملک صادق کے ملک کی راہ لی۔ چلتے چلتے، ایک میدان میں، آواز غل شور کی آنے لگی۔ مبارک نے کہا "شکر خدا کا، ہماری محنت نیک لگی۔ یہ لشکر جنوں کا، آ پہنچا۔" بارے مبارک نے، اُن سے مل جل کر پوچھا کہ "کہاں کا ارادہ کیا ہے؟" وہ بولے کہ "بادشاہ نے تمہارے استقبال کے واسطے، ہمیں تعینات کیا ہے۔ اب تمہارے فرماں بردار ہیں۔ اگر کہو تو ایک دم میں روبرو لے چلیں۔" مبارک نے کہا "دیکھو، کس کس محنتوں سے، خدا نے بادشاہ کے حضور میں سرخرو ہمیں کیا۔ اب جلدی کیا ضرور ہے؟ اگر خدانخواستہ، کچھ خلل ہو جاوے تو ہماری محنت اکارت ہو اور جہاں پناہ کی عتاب میں پڑیں۔" سبھوں نے کہا کہ "اس کے تم مختار ہو، جس طرح جی چاہے چلو۔" اگرچہ سب طرح کا آرام تھا۔ پر رات دن چلنے سے کام تھا۔

جب نزدیک جا پہنچا، میں مبارک کو سوتا دیکھ کر اُس نازنین کے قدموں پر سر رکھ کر، اپنے دل کی بے قراری، اور ملک صادق کے سبب سے لاچاری، نہایت منت و زاری سے کہنے لگا کہ "جس روز سے تمہاری تصویر دیکھی ہے، خواب و خورش اور آرام، میں نے، اپنے اوپر حرام کیا ہے۔ اب جو

خدا نے یہ دن دکھایا، تو محض بیگانہ ہو رہا ہوں۔" فرمانے لگی کہ "میرا بھی دل، تمہاری طرف مائل ہے کہ تم نے میری خاطر، کیا کیا ہرج مرج اٹھایا اور کس کس مشقتوں سے لے آتے ہو۔ خدا کو یاد کرو اور مجھے بھول نہ جایو۔ دیکھو تو پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے!" یہ کہہ کر، ایسی بے اختیار، ڈاڑھ مار کر روئی کہ ہچکی لگ گئی۔ ادھر میرا یہ حال، اُدھر اُس کا وہ احوال۔ اس میں مبارک کی نیند ٹوٹ گئی۔ وہ، ہم دونوں مشتاقوں کا رونا دیکھ کر رونے لگا اور بولا "خاطر جمع رکھو، ایک روغن میرے پاس ہے اُس گلبدن کے بدن میں، مَل دوں گا، اُس کی بُو، سے ملک صادق کا جی ہٹ جائے گا۔ غالب ہے کہ تمہیں کو بخش دے"

مبارک سے یہ تدبیر سن کر، دل کو ڈھارس ہو گئی۔ اُس کے گلے سے لگ کر لاڈ کیا اور کہا "اے دادا! اب تو میرے باپ کی جگہ ہے۔ تیرے باعث میری جان بچی۔ اب بھی ایسا کام کر جس میں میری زندگانی ہو، نہیں تو، اس غم میں مر جاؤں گا۔" اُس نے ڈھیر سی تسلی دی۔ جب روز روشن ہوا، آوازِ جنوں کی معلوم ہونے لگی۔ دیکھا تو، کئی خواص ملک صادق کے، آتے ہیں اور دوسری پاؤ بھاری، ہمارے لئے لائے ہیں اور ایک چوڈول، موتیوں کی توڑ پڑی ہوئی، اُن کے ساتھ ہے۔ مبارک نے، اس نازنین کو وہ تیل مل دیا اور پوشاک پہنا، بناؤ کروا کر، ملک صادق کے پاس لے چلا۔ بادشاہ نے دیکھ کر مجھے بہت سرفراز کیا اور عزت و حرمت سے بٹھایا اور فرمانے لگا کہ "تجھ سے میں ایسا سلوک کروں گا کہ کسو نے آج تک کسو سے نہ کیا ہوگا۔ بادشاہت تو تیرے باپ کی موجود ہے۔ علاوہ، اب تو میرے بیٹے کی جگہ ہوا۔" یہ توجہ کی باتیں کر رہا تھا، اتنے میں وہ نازنین بھی روبرو آئی۔ اُس روغن کی بو سے، یک بہ یک، دماغ پراگندہ ہوا اور حال بے حال ہو گیا۔ تاب اُس باس کی نہ لا سکا۔ اُٹھ کر باہر چلا گیا اور ہم دونوں کو بلوایا اور مبارک کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ "کیوں جی! خوب شرط بجا لاتے۔ میں نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر خیانت کرو گے تو خفگی میں پڑو گے۔ یہ لو کیسی ہے؟ اب دیکھو تمہارا کیا حال کرتا ہوں۔" بہت جزبز ہوا۔ مبارک نے، مارے ڈر کے، اپنا ازار بند کھول کر دکھا دیا کہ "پادشاہ سلامت! جب حضور کے حکم سے، اس کار کے ہم متعین ہوئے تھے، غلام نے پہلے ہی اپنی علامت کاٹ کر ڈبیا میں بند کر کے، سربمہر، سرکار کے خزانچی کے سپرد کر دی تھی اور مرہم سلیمانی لگا کر روانہ ہوا تھا۔"

مبارک سے یہ جواب سن کر تب میری طرف، آنکھیں نکال کر گھورا اور کہنے لگا "تو یہ تیرا کام ہے!" اور طیش میں آ کر، منہ سے بُرا بھلا بکنے لگا۔ اُس وقت، اُس کے بت کہاؤ سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ شاید جان سے مجھے مروا ڈالے گا۔ جب میں نے، اُس کے لشترے سے یہ دریافت کیا، اپنے جی سے ہاتھ دھو کر، اور جان کھو کر، سر غلاف، مبارک کی کمر سے کھینچ کر، ملک صادق کی توند میں ماری۔ چھری کے

لگتے ہی نہڑا اور جھوما۔ میں نے حیران ہو کر جانا کہ مقرر مرگیا۔ پھر اپنے دل میں خیال کیا کہ زخم تو ایسا کاری نہیں لگا، یہ کیا سبب ہوا؟ میں کھڑا دیکھتا تھا کہ وہ زمین پر لوٹ لاٹ، گیند کی صورت بن کر، آسمان کی طرف اڑ چلا۔ ایسا بلند ہوا، کہ آخر نظروں سے غائب ہو گیا۔ پھر ایک پل کے بعد، بجلی کی طرح کڑکتا اور غصّے میں کچھ بے معنی بکتا ہوا، نیچے آیا اور مجھے ایک لات ماری کہ میں تیورا کر، چاروں شانے چت، گر پڑا اور جی ڈوب گیا۔ خدا جانے کتنی دیر میں ہوش آیا، آنکھیں کھول کر جو دیکھا تو ایک ایسے جنگل میں پڑا ہوں کہ جہاں سوائے کیکڑ، اور ٹنٹی، اور جھڑبیری کے درختوں کے، کچھ اور نظر نہیں آتا۔ اب اس گھڑی، عقل کچھ کام نہیں کرتی کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں؟ نا اُمیدی سے ایک آہ بھر کر، ایک طرف کی راہ لی۔ اگر کہیں، کوئی آدمی کی صورت، نظر پڑتی تو ملک صادق کا نام پوچھتا۔ وہ دیوانہ جان کر جواب دیتا کہ "ہم نے تو، اُس کا نام بھی نہیں سنا!"

ایک روز پہاڑ پر جا کر، میں نے یہ ارادہ کیا کہ اپنے تئیں گرا کر ضائع کروں۔ جو مستعد گرنے کا ہوا، وہی سوار، صاحب ذوالفقار، برقع پوش آ پہنچا اور بولا کہ "کیوں تو اپنی جان کھوتا ہے؟ آدمی پر، دکھ درد، سب ہوتا ہے۔ اب تیرے بُرے دن گئے اور بھلے دن آئے۔ جلد روم کو جا، تین شخص ایسے ہی آگے گئے ہیں، اُن سے ملاقات کر اور وہاں کے سلطان سے مل۔ تم پانچوں کا مطلب، ایک ہی جگہ ملے گا۔"

اس فقیر کی سیر کا یہ ماجرا ہے جو عرض کیا۔ بارے بشارت سے، اپنے مولا مشکل کشا کی، مرشدوں کے حضور میں آ پہنچا ہوں اور بادشاہ ظل اللہ کی بھی، ملازمت حاصل ہوئی۔ چاہیے کہ اب سب کی خاطر جمع ہو۔"

قصّے کے اختتام میں

یہ باتیں، چار درویش اور بادشاہ آزاد بخت میں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں محلی، بادشاہ کے محل میں سے، دوڑا ہُوا آیا اور مبارک باد کی تسلیمیں، بادشاہ کے حضور بجالایا اور عرض کی کہ اس وقت شہزادہ پیدا ہوا کہ آفتاب و مہتاب، اس کے حسن کے روبرو شرمندہ ہیں۔ بادشاہ نے متعجب ہو کر پوچھا کہ "بظاہر میں تو کسو کو حمل نہ تھا۔ یہ آفتاب کس کے برج حمل سے نمود ہُوا؟" اس نے التماس کیا کہ "ماہرو خواص، جو بہت دنوں سے غضبِ بادشاہی میں پڑی تھی، بے کسوں کی مانند ایک کونے میں رہتی تھی اور مارے ڈر کے، اُس کے نزدیک کوئی نہ جاتا، نہ احوال پوچھتا تھا، اُس پر یہ فضل الٰہی ہوا کہ چاند سا بیٹا، اس کے پیٹ سے پیدا ہوا۔"

بادشاہ کو ایسی خوشی حاصل ہوئی کہ شاید شادی مرگ ہو جائے۔ چاروں فقیر نے بھی دعا دی کہ "بھلا بابا! تیرا گھر آباد رہے اور اُس کا قدم مبارک ہو۔ تیرے سائے کے تلے بوڑھا بڑا ہو۔" بادشاہ نے کہا "یہ تمہارے قدم کی برکت ہے، والا نہ اپنے تو سان گمان میں یہ بات نہ تھی۔ اجازت ہو تو جا کر دیکھوں۔" درویشوں نے کہا "بسم اللہ، سدھاریئے۔" بادشاہ محل میں تشریف لے گئے۔ شہزادے کو گود میں لیا، اور شکر پروردگار کی جناب میں کیا۔ کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ وہیں چھاتی سے لگائے ہوئے، لا کر، فقیروں کے قدموں پر ڈالا۔ درویشوں نے دعائیں پڑھ کر، جھاڑ پھونک دیا۔ بادشاہ نے جشن کی تیاری کی۔ دوہری نوبتیں جھڑنے لگیں۔ خزانے کا منہ کھول دیا۔ داد و دہش سے، ایک کوڑی کے محتاج کو لکھ پتی کر دیا۔ ارکان دولت جتنے تھے، سب کو دوچند جاگیر و منصب کے فرمان ہو گئے۔ جتنا لشکر تھا، انہیں پانچ برس کی طلب انعام ہوئی۔ مشائخ اور اکابر کو مدد، معاش اور التمغا عنایت ہوا۔ بے نواؤں کے میتے، اور ٹکر گداؤں کے چھلے، اشرفی اور روپوں سے بھر دیئے، اور تین برس کا خزانہ رعیت کو معاف کیا کہ جو کچھ بودیں، دونوں حصّے اپنے گھروں میں اُٹھا لے جائیں۔

تمام شہر میں، ہزاری بزاری کے گھروں میں، جہاں دیکھو وہاں، تھئی تھئی ناچ ہو رہے ہیں مارے خوشی کے، ہر ایک ادنیٰ و اعلیٰ، بادشاہِ وقت بن بیٹھا۔ عین شادی میں، ایک بارگی اندرون محل سے رونے پیٹنے کا غل اٹھا۔ خواصیں، اور ترکنیاں، اور اُردابیگنیاں، اور محلی خوجے، سر پیٹ

خاک ڈالتے ہوئے باہر نکل آئے اور بادشاہ سے کہا کہ "جس وقت شہزادے کو نہلا دھلا کر دائی کی گود میں دیا، ایک ابر کا ٹکڑا آیا اور دائی کو گھیر لیا۔ بعد ایک دم کے دیکھیں تو، ننگا بے ہوش پڑی ہے اور شہزادہ غائب ہو گیا۔ یہ کیا قیامت ٹوٹی!" بادشاہ یہ تعجبات سن کر حیران ہو رہا اور تمام ملک میں واویلا پڑی۔ دو دن تلک، کسو کے گھر ہانڈی نہ چڑھی۔ شہزادے کا غم کھاتے اور اپنا لہو پیتے تھے۔

غرض زندگانی سے لاچار تھے، جو اس طرح جیتے تھے۔ جب تیسرا دن ہوا، وہی بادل پھر آیا اور ایک پنگھولا، جڑاؤ موتیوں کی توڑ پڑی ہوئی، لایا۔ اُسے محل میں رکھ کر آپ ہوا ہُوا۔ لوگوں نے شہزادے کو اُس میں انگوٹھا چوستے ہوئے پایا۔ بادشاہ بیگم نے جلدی، بلائیں لے کر، ہاتھوں میں اٹھا کر، چھاتی سے لگا لیا۔ دیکھا تو کرتہ آبِ رواں کا، موتیوں کا دردامن لٹکا ہوا، گلے میں ہے اور اُس پر شلوکا تمامی کا پہنا ہے اور ہاتھ پاؤں میں کھڑوے، مرصع کے، اور گلے میں ہیکل، نورتن کی، پڑی ہے۔ اور جھنجھنا، چسنی، چٹے۔ بٹے جڑاؤ، دھرے ہیں۔ سب مارے خوشی کے، واری پھیری ہونے لگیں اور دعائیں دینے لگیں کہ "تیری ماں کا پیٹ ٹھنڈا رہے اور تو بوڑھا آڑھا ہو۔"

بادشاہ نے ایک محل نیا تعمیر کرا کر، اور فرش بچھوا، اُس میں درویشوں کو رکھا۔ جب سلطنت کے کام سے فراغت ہوتی، تب آ بیٹھتے اور سب طرح سے خدمت اور خبرگیری کرتے لیکن ہر چاند کی نوچندی جمعرات کو، وہی پارۂ ابر آتا اور شہزادے کو لے جاتا۔ بعد دو دن کے، تحفہ کھلونے اور سوغاتیں ہر ایک ملک کی، اور ہر ایک قسم کی، شہزادے کے ساتھ لے آتا جن کے دیکھنے سے، عقل انسان کی، حیران ہو جاتی۔ اسی قاعدے سے، بادشاہ زادے نے خیریت سے، ساتویں برس میں پاؤں دیا۔ عین سالگرہ کے روز، بادشاہ آزاد بخت نے فقیروں سے کہا کہ "سائیں اللہ! کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ شہزادے کو کون لے جاتا ہے اور پھر دے جاتا ہے؟ بڑا تعجب ہے۔ دیکھیے، انجام اس کا کیا ہوتا ہے؟" درویشوں نے کہا "ایک کام کرو۔ ایک شقۂ شوقیہ، اس مضمون کا لکھ کر، شہزادے کے گہوارے میں رکھ دو کہ تمہاری مہربانگی اور محبت دیکھ کر اپنا بھی دل، مشتاق ملاقات کا ہوا ہے۔ اگر دوستی کی راہ سے، اپنے احوال کی اطلاع دیجیے تو خاطر جمع ہو اور حیرانی بالکل دفع ہو۔" بادشاہ نے، موافق صلاح درویشوں کے، افشانی کاغذ پر، ایک رقعہ اسی عبارت کا، ترقیم کیا اور مہد زریں میں رکھ دیا۔

شہزادہ، بموجب قاعدہ قدیم کے، غائب ہوا۔ جب شام ہوئی، آزاد بخت درویشوں کے بستروں پر آکر بیٹھے اور کلمہ کلام ہونے لگا۔ ایک کاغذ، لپٹا ہوا بادشاہ کے پاس آپڑا۔ کھول کر پڑھا تو جواب اُسی

شقے کا تھا۔ یہی دو سطریں لکھی تھیں کہ "ہمیں بھی اپنا مشتاق جانیے۔ سواری کے لئے تخت جاتا ہے۔ اس وقت اگر تشریف لائیے تو بہتر ہے۔ باہم ملاقات ہو، سب اسباب عیش و طرب کا مہیا ہے۔ صاحب ہی کی جگہ خالی ہے۔" بادشاہ آزاد بخت، درویشوں کو ہمراہ لے کر، تخت پر بیٹھے۔ وہ تخت، حضرت سلیمان کے تخت کے مانند، ہوا پر چلا۔ رفتہ رفتہ ایسے مکان پر جا اترے کہ عمارت عالی شان اور تیاری کا سامان نظر آتا ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہاں کوئی ہے یا نہیں۔ اتنے میں کسو نے، ایک ایک سلائی سلیمانی سرمے کی، ان پانچوں کی آنکھوں میں پھیر دی۔ دو دو بوندیں آنسو کی ٹپک پڑیں۔ پریوں کا اکھاڑا دیکھا کہ استقبال کی خاطر، گلاب پاشیں لئے ہوئے، اور رنگ برنگ کے جوڑے پہنے ہوئے، کھڑا ہے۔

آزاد بخت آگے چلے تو دو رویہ، ہزاروں پری زاد، مؤدب کھڑے ہیں اور صدر میں، ایک تخت زمرد کا دھرا ہے۔ اُس پر ملک شہبال، شاہ رخ کا بیٹا، تکیے لگائے، بڑے تزک سے بیٹھا ہے اور ایک پری زاد لڑکی روبرو بیٹھی، شہزادہ نجتیاں کے ساتھ کھیل رہی ہے۔ اور دونوں بغل میں کرسیاں اور صندلیاں، قرینے سے بچھی ہیں۔ اُن پر عمدہ پری زاد بیٹھے ہیں۔ ملک شہبال، بادشاہ کو دیکھتے ہی سرو قد اُٹھا اور تخت سے اُتر کر، بغل گیر ہوا اور ہاتھ میں ہاتھ پکڑے، اپنے برابر، تخت پر لاکر، بٹھایا اور بڑے تپاک اور گرم جوشی سے، باہم گفتگو ہونے لگی۔ تمام روز ہنسی خوشی، کھانے، رمیوے اور خوشبوؤں کی ضیافت رہی، اور راگ رنگ سنا کئے۔ دوسرے دن، جب پھر دونوں بادشاہ جمع ہوئے، شہبال نے بادشاہ سے، درویشوں کے ساتھ لانے کی کیفیت پوچھی۔

بادشاہ نے چاروں بے نوائوں کا ماجرا جو سنا تھا، مفصل بیان کیا اور سفارش کی اور مدد چاہی کہ "انہوں نے اتنی محنت اور مصیبت کھینچی ہے، اب صاحب کی توجہ سے، اگر اپنے اپنے مقصد کو پہنچیں تو ثواب عظیم ہے اور یہ مخلص بھی تمام عمر شکر گزار رہے گا۔ آپ کی نظر توجہ سے، ان سب کا بیڑا پار ہوتا ہے۔" ملک شہبال نے سن کر کہا "بسر و چشم، میں تمہارے فرمانے سے قاصر نہیں۔" یہ کہہ کر نگاہ کرم سے دیووں اور پریوں کی طرف دیکھا اور بڑے بڑے جن، جو جہاں سردار تھے، اُن کو نامے لکھے کہ "اس فرمان کے دیکھتے ہی، اپنے تئیں حضور پُر نور میں، حاضر کرو۔ اگر کسی کے آنے میں تو قف ہوگا تو اپنی سزا پاوے گا اور پکڑا ہوا آوے گا۔ اور آدم زاد، خواہ عورت خواہ مرد، جس کے پاس ہو۔ اُسے اپنے ساتھ لئے آوے۔ اگر کوئی پوشیدہ کر رکھے گا، اور ثانی الحال ظاہر ہوگا، تو اُس کا زن و بچہ کولہو میں پیڑ جائے گا اور اسی کا نام و نشان باقی نہ رہے گا۔"

یہ حکم نامہ لے کر، دیو چاروں طرف متعین ہوئے۔ یہاں دونوں بادشاہوں میں صحبت گرم ہوئی اور باتیں اختلاط کی ہونے لگیں۔ اُس میں، ملک شہبال، درویشوں سے مخاطب ہو کر بولا کہ مجھے اپنے تئیں بھی بڑی آرزو لڑکے ہونے کی تھی اور دل میں یہ عہد کیا تھا کہ اگر خدا بیٹا دے یا بیٹی دے، تو اُس کی شادی بنی آدم کے بادشاہ کے یہاں، جو لڑکا پیدا ہوگا، اُس سے کروں گا۔ اس نیت کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ بادشاہ بیگم پیٹ سے ہیں۔ بارے دن اور گھڑیاں اور مہینے گنتے گنتے، پورے دن ہوئے اور یہ لڑکی پیدا ہوئی۔ موافق وعدے کے، تلاش کرنے کے واسطے، عالم جنیات کو میں نے حکم کیا، چاردانگ دنیا میں جستجو کرو، جس بادشاہ یا شہنشاہ کے یہاں فرزند پیدا ہوا ہو، اُس کو بہ جنس احتیاط سے، جلد اُٹھا کر لے آؤ، ورنہیں، بہ موجب فرمان کے، پری زاد چاروں سمت پراگندہ ہوئے، بعد دیر کے، اس شہزادے کو میرے پاس لے آئے۔

"میں نے شکر خدا کا کیا اور اپنی گود میں لے لیا۔ اپنی بیٹی سے زیادہ، اس کی محبت میرے دل میں پیدا ہوئی۔ جی نہیں چاہتا کہ ایک دم نظروں سے جدا کروں، لیکن اس خاطر بھیج دیتا ہوں کہ اگر اس کے ماں باپ نہ دیکھیں گے تو اُن کا کیا احوال ہوگا۔ لہٰذا ہر مہینے میں، ایک بار منگا لیتا ہوں کئی دن اپنے نزدیک رکھ کر پھر بھیج دیتا ہوں۔ انشاء اللہ تعالیٰ، اب ہمارے تمہارے ملاقات ہوئی، اُس کی کتخدائی کر دیتا ہوں۔ موت حیات سب کو لگی پڑی ہے، بھلا جیتے جی ان کا سہرا دیکھ لیں۔"

بادشاہ آزاد بخت، یہ باتیں ملک شہبال کی سن کر، اور اُس کی خوبیاں دیکھ کر، نہایت محظوظ ہوئے اور بولے "پہلے ہم کو شہزادے کے غائب ہو جانے، اور پھر آنے سے، عجب عجب طرح کے خطرے دل میں آتے تھے، لیکن اب صاحب کی گفتگو سے تسلی ہوئی۔ یہ بیٹا اب تمہارا ہے جس میں تمہاری خوشی ہو سو کیجیے۔" غرض دونوں بادشاہوں کی صحبت، مانند شکر شیر کے رہتی اور عیش کرتے۔ دس پانچ دن کے عرصے میں، بڑے بڑے بادشاہ، گلستان ارم کے، اور کوہستان کے اور جزیروں کے . . . جن کے طلب کی خاطر لوگ تعینات ہوئے تھے۔ سب آکر حضور میں حاضر ہوتے۔ پہلے ملک صادق سے فرمایا کہ تیرے پاس جو آدم زاد ہے حاضر کر۔ اُس نے نپٹ غم و غصہ کھا کر، لاچار، اُس گلعذار کو حاضر کیا۔ اور ولایت عمان کے بادشاہ سے، شہزادی جن کی، جس کے لیے شہزادہ ملک نیم روز کا، گاؤ سوار ہو کر سودائی بنا تھا، مانگی۔ اُس نے بھی، بہت سی عذر معذرت کر کے، حاضر کی۔ جب بادشاہ فرنگ کی بیٹی اور بہزاد خاں کو طلب کیا، سب منکر پاک ہوئے اور حضرت سلیمان کی قسم کھانے لگے۔

آخر، دریائے قلزم کے پادشاہ سے، جب پوچھنے کی نوبت آئی تو وہ سر نیچا کر کے چپ ہو رہا ملک شہپال نے اُس کی خاطر کی اور قسم دی اور امیدوار سرفرازی کا کیا اور کچھ دھونس دھڑکا بھی دیا۔ تب وہ بھی ہاتھ جوڑ کر عرض کرنے لگا کہ "پادشاہ سلامت! حقیقت یہ ہے کہ جب بادشاہ، اپنے بیٹے کے استقبال کی خاطر، دریا پر آیا اور شہزادے نے مارے جلدی کے گھوڑا دریا میں ڈالا، اتفاقاً میں اس روز، سیر و شکار کی خاطر نکلا تھا۔ اُس جگہ میرا گزر ہوا۔ سواری کھڑی کر کے، یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس میں شہزادی کو بھی گھوڑی دریا میں لے گئی۔ میری نگاہ جو اُس پر پڑی، دل بے اختیار ہوا۔ پری زادوں کو حکم کیا کہ شہزادی کو، بہ معہ گھوڑی لے آؤ۔ اس کے پیچھے بہزاد خاں نے گھوڑا اچھالا۔ جب وہ بھی غوطے کھانے لگا اُس کی دلاوری اور مردانگی پسند آئی، اُس کو بھی ہاتھوں ہاتھ پکڑ لیا۔ اُن دونوں کو لے کر، میں نے سواری پھیری سو، وے دونوں صحیح سلامت میرے پاس موجود ہیں۔"

یہ احوال کہہ کر دونوں کو روبرو بلایا۔ اور سلطان شام کی شہزادی کی تلاش، بہت کی اور سبھوں سے، بہ سختی و ملائمت، استفسار کیا لیکن کسو نے حامی نہ بھری اور نہ نام و نشان بتایا۔ تب ملک شہپال نے فرمایا کہ "کوئی بادشاہ یا سردار، غیر حاضر بھی ہے یا سب آ چکے؟" جنوں نے عرض کی کہ "جہاں پناہ! سب حضور میں آئے ہیں مگر ایک مسلسل جادو جس نے کوہ قاف کے پردے میں ایک قلعہ، جادو کے علم سے بنایا ہے، وہ اپنے غرور سے نہیں آیا ہے اور ہم غلاموں کو طاقت نہیں جو بہ زور اس کو پکڑ لاویں، وہ بڑا قلب مکان ہے اور وہ خود بھی بڑا شیطان ہے۔"

یہ سن کر ملک شہپال کو طیش آیا۔ اور لڑائی فوج، جنوں اور عفریتوں، اور پری زادوں، کی تعینات کی اور فرمایا "اگر راستی میں، اُس شہزادی کو ساتھ لے حاضر ہو فبہا، وگرنہ اس کو زیر و زبر کر کے مشکیں باندھ کر لے آؤ۔ اور اُس کے گڑھ اور ملک کو نیست و نابود کر کے، گدھے کا ہل پھروا دو۔" وہیں حکم ہوتے ہی، ایسی کتنی فوج روانہ ہوئی کہ ایک آدھ دن کے عرصے میں، ویسے جوش و خروش والے سرکش کو حلقہ بہ گوش کر کے پکڑ لائے اور حضور میں دست بستہ کھڑا کیا۔ ملک شہپال نے ہر چند سرزنش کر کے پوچھا لیکن اُس مغرور نے، سوائے ناں کے، ہاں نہ کی۔ نہایت کو، غصے ہو کر فرمایا کہ "اس مردود کے، بند بند جدا کرو اور کھال کھینچ کر بھس بھرو۔" اور پری زاد کے لشکر کو تعین کیا کہ کوہ قاف میں جا کر، ڈھونڈ ڈھانڈ کر، پیدا کرو۔ وہ لشکر متعینہ شہزادی کو بھی تلاش کر کے لے آیا۔ اور حضور میں پہنچایا۔ اُن سب اسیروں نے، اور حادثہ زدوں نے، ملک شہپال کا حکم اور انصاف دیکھ کر، دعائیں دیں اور شاد

ہوئے۔ پادشاہ آزاد بخت بھی بہت خوش ہوا۔ تب ملک شہبال نے فرمایا کہ "مردوں کو دیوانِ خاص میں، اور عورتوں کو پادشاہی محل میں، داخل کرو اور شہر میں آئینہ بندی کا حکم کرو اور شادی کی تیاری جلدی کرو۔" گویا حکم کی دیر تھی۔

ایک روز، نیک ساعت اور مبارک مہورت دیکھ کر، شہزادہ نجتیار کا عقد، اپنی بیٹی روشن اختر سے باندھا، اور خواجہ زادہ یمن کو دمشق کی شہزادی سے بیاہا، اور ملک فارس کے شہزادے کا نکاح بصرے کی شہزادی سے کر دیا اور عجم کے بادشاہ زادے کو فرنگ کی ملکہ سے منسوب کیا، اور نیم روز کے بادشاہ کی بیٹی کو بہزاد خاں کو دیا، اور شہزادہ نیم روز کو، جن کی شہزادی حوالے کی اور چین کے شہزادے کو، اُس پیر مرد عجمی کی بیٹی سے (جو ملک صادق کے قبضے میں تھی) کتخدا کیا۔ ہر ایک نامراد، بدولت ملک شہبال کی، اپنے اپنے مقصد اور مُراد کو پہنچا۔ بعد اُس کے چالیس دن تلک جشن فرمایا اور عیش و عشرت میں رات دن مشغول رہے۔

آخر ملک شہبال نے، ہر ایک بادشاہ زادے کو، تحفے اور سوغاتیں اور مال اسباب دے دے کر، اپنے اپنے وطن کو رخصت کیا۔ سب، بہ خوشی و خاطر جمعی، روانہ ہوئے اور بہ خیر و عافیت جا پہنچے اور بادشاہت کرنے لگے۔ مگر ایک بہزاد خاں اور خواجہ زادہ یمن، اپنی خوشی سے، بادشاہ آزاد بخت کی رفاقت میں رہے۔ آخر یمن کے خواجہ زادے کو خان سامان اور بہزاد خاں کو میر بخشی شہزادہ صاحب اقبال یعنی نجتیار کی فوج کا، کیا۔ جب تلک جیتے رہے، عیش کرتے رہے۔

الٰہی! جس طرح یہ چاروں درویش، اور پانچواں بادشاہ آزاد بخت، اپنی مراد کو پہنچے، اسی طرح ہر ایک نامراد کا مقصد دلی، اپنے کرم اور فضل سے برلا، بہ طفیل پنجتن پاک، و دوازدہ امام، چہاردہ معصوم (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کے۔ آمین، یا الٰہ العالمین۔

خاتمۂ کتاب میں

جب یہ کتاب، فضل الٰہی سے، اختتام کو پہنچی، جی میں آیا کہ اس کا نام بھی ایسا رکھوں کہ اُسی میں تاریخ نکلے۔ جب حساب کیا، تو بارہ سو پندرہ ہجری کے آخر سال میں کہنا شروع کیا تھا۔ باعث عدم فرصت کے، بارہ سو سترہ سن کی ابتدا میں انجام ہوئی۔ اس فکر میں تھا کہ دل نے کہا کہ "باغ و بہار" اچھا نام ہے کہ ہم نام و ہم تاریخ اس میں نکلتی ہے۔ تب میں نے یہی نام رکھا۔ جو کوئی اس کو پڑھے گا گویا باغ کی سیر کرے گا، بلکہ باغ کو آفت خزاں کی بھی ہے اور اس کو نہیں۔ یہ ہمیشہ سرسبز رہے گا:

مرتب ہوا جب یہ "باغ و بہار"
تھے سن بارہ سو سترہ در شمار
کرو سیر اب اس کی تم رات دن
کہ ہے نام و تاریخ "باغ و بہار"
خزاں کا نہیں اس میں آسیب کچھ
ہمیشہ ترو تازہ ہے یہ بہار
مرے خون دل سے یہ سیراب ہے
اور لختِ جگر کے ہیں سب برگ و بار
مجھے بھول جاویں گے سب بعد مرگ
رہے گا مگر یہ سخن یادگار
اسے جو پڑھے، یاد مجھ کو کرے
یہی قاریوں سے مرا ہے قرار

خطا گر کہیں ہو تو رکھیو معاف
کہ پھولوں میں پوشیدہ رہتا ہے خار
ہے انساں، مرکّب ز سہو و خطا،
یہ چوکے گا، ہر چند ہو ہوشیار
میں اس کے سوا چاہتا کچھ نہیں
یہی ہے دعا میری اے کردگار
تری یاد میں، میں رہوں دم بہ دم
کٹے اس طرح میرا لیل و نہار
نہ پرسش کی سختی ہو مجھ پر کبھو
نہ شب گور کی، اور نہ روز شمار
تو کونین میں لطف پر لطف رکھ
خدایا، بہ حقِ رسولِ کبار

کتابیات

۱۔ "باغ و بہار" کے مختلف ایڈیشن

(نوٹ: ہر مرتب نے مقدمہ یا دیباچہ بھی لکھا ہے۔)

(۱) مرتبہ: مولوی عبدالحق
انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی، ۱۹۴۳ء (طبع دوم)، ۲۲×۱۸/۸ ص: ۲۳۵ [فرہنگ: ۸ صفحات]

(۲) مرتبہ: ممتاز حسین
اُردو ٹرسٹ کراچی نومبر ۱۹۵۸ء، ۲۲×۱۸/۸، ص: ۳۶۷ [فرہنگ: ۳۹ صفحات]

(۳) مرتبہ: وقار عظیم
اُردو گھر لاہور، ۱۹۵۲ء ۳۰×۲۰/۱۶ ص: ۲۵۶ [فرہنگ: ۸ صفحات]

(۴) مرتبہ: ممتاز منگلوری
خیابان ادب لاہور، اکتوبر ۱۹۶۶ء، ۳۰×۲۰/۱۶، ص: ۳۴۷
[مولوی عبدالحق کا مقدمہ اور ڈاکٹر سید عبداللہ کا مقالہ "باغ و بہار کی زندہ نثر" بھی شاملِ کتاب ہے]

(۵) مرتبہ: ڈاکٹر ناظر حسن زیدی
معین الادب لاہور، نومبر ۱۹۶۶ء، ۳۰×۲۰/۱۶ ص: ۳۰۰ [فرہنگ: ۹ صفحات]

(۶) مرتبہ: ؟
نیا ادارہ لاہور، ۱۹۵۷ء ۳۰×۲۰/۱۶ ص ۳۰۳ [مقالہ "باغ و بہار کی زندہ نثر" تصاویر۔ حنیف رامے

(۷) مرتبہ: پروفیسر مرزا محمد سعید دہلوی
دار الاشاعت پنجاب لاہور ۱۹۴۳ء (طبع دوم) ۳۰×۲۰/۸ ص ۲۰۰

(۸) مرتبہ: ابوالخیر کشفی
اُردو اکیڈمی سندھ کراچی۔

(۹) مرتبہ: ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
طارق مشین پریس، گلباغ سنہ؟ ۳۰×۲۰/۹ ص: ۱۵۶ [مقدمہ یا دیباچہ نہیں ہے]

(۱۰) مرتبہ: پیام شاہجہانپوری

عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور سنہ ؟ $\frac{20 \times 30}{16}$ ص: ۲۰۰ [مختصر سا دیباچہ]

(۱۱) مرتبہ اقبال صلاح الدین

سنگِ میل پبلیشرز، لاہور، ۱۹۷۳ء $\frac{18 \times 22}{8}$ ص: ۴۸۴ [منظوم پنجابی ترجمہ از: قاضی امام بخش شیردی]

(ب) پنجاب یونیورسٹی لائبریری (لاہور) میں باغ و بہار کے بعض نادر نسخے

(۱) مرتبہ: ڈنکن فاربس

مطبوعہ: لندن، طبع چہارم ۱۸۴۳ء، $\frac{18 \times 22}{8}$ ص: ۲۸۲ [فرہنگ: ۱۲۲ صفحات]

(۲) مطبوعہ کلکتہ: ۱۸۳۹ء $\frac{20 \times 30}{8}$، ص: ۱۹۲

[میر امن کا نام یوں لکھا ہے: MEEK UMMUN]

(۳) مرتبہ: میجر ڈی۔ سی۔ فیلوٹ (MAJ D.C. PHILLOTT)

مطبوعہ کلکتہ، طبع چہارم ۱۹۰۵ء، $\frac{20 \times 30}{16}$ ص: ۳۰۹ [میر امن کا نام درج نہیں کیا گیا]

(۴) مطبوعہ کانپور، دسمبر ۱۸۵۴ء، $\frac{18 \times 22}{8}$، ص: ۱۹۷۔ خاتمہ پر یہ عبارت درج ہے:

یہ کتاب بعینہٖ مطابق اس نسخے کے کہ کالج میں داخل درس صاحبان ذی شان ہے اور معرفت قاضی محمد اسماعیل صاحب مدرس صاحبانِ ممدوح کے ہاتھ آیا۔ تاریخ بیسویں ربیع الاول ۱۲۷۱ ہجری مطابق ۲ از دسمبر ۱۸۵۴ء، باہتمام قل نبی لوزع الشان محمد عبد الرحمٰن مطبع مصطفائی واقع کانپور میں چھپی اور بعد تیاری کے ملاحظے سے قاضی صاحب موصوف کے گزر کر اُن کے دستخط سے مزین ہوئی۔"

(ج) میر امن اور باغ و بہار کے بارے میں مزید معلومات کے لئے مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا جا سکتا ہے:

(۱) اعجاز حسین، ڈاکٹر: "ادب اور ادیب"

(۲) سلیم اختر: اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ اور "باغ و بہار کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ"

(۳) سہیل بخاری، ڈاکٹر: "باغ و بہار پر ایک نظر"

(۴) سید محمد مولوی "اربابِ نثر اردو"

(۵) - عبداللہ، ڈاکٹر سید: "میر امن سے عبدالحق تک"

(۶) کلیم الدین احمد: "فنِ داستان گوئی"

(۷) گیان چند جین، ڈاکٹر: "اُردو کی نثری داستانیں"

(۸) محمد عتیق صدیقی: "گل کرسٹ اور اس کا عہد"

(۹) نادم سیتاپوری: "فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی"

(۱۰) وحید قریشی، ڈاکٹر: "باغ و بہار: ایک تجزیہ"

(۱۱) وقار عظیم: "ہماری داستانیں"

(۱۲) رام بابو سکسینہ، حامد حسن قادری اور ڈاکٹر اعجاز حسین وغیرہ کی لکھی ہوئی اُردو ادب کی تاریخیں ان کے علاوہ ہیں۔

فرہنگ

الفاظ	معنی
اُبھرن ۔	گہنا ۔ زیور
اُپرالا کرنا ۔	حمایت کرنا
اجھلنا ۔	انڈیلنا
اچھوانی ۔	ایک قسم کا شیرہ (اجوائن اور سونٹھ) جو زچہ کو دیا جاتا ہے ۔
احدی ۔	سپاہی
ادھار ۔	سہارا
ادقچہ ۔	بالا پوش ۔ پلنگ پوش وغیرہ
آنا کانی دینا ۔	چشم پوشی کرنا ، اغماض کرنا ۔
آواگون ۔	آنا جانا دستور ۔ تناسخ ارواح
اردا بیگنی ۔	شاہی محل میں پہرہ دینے والی ہتھیار بند عورت ۔
استادہ ۔	تھم ۔ ستون
اڑانا	بیڑی میں ڈالی پاؤں میں پہننا ۔
اُلش ۔	امیروں کا پس خوردہ
انوٹھی ۔	انوکھی ۔
اگت ۔	اپج ۔ جدت
آنند ۔	خوشی ۔ مسرت
بادلہ ۔	زری کا کپڑا جو ریشم اور چاندی کے تاروں سے بنا جاتا ہے ۔

الفاظ	معنی
باری دار ۔	ملازم جو باری لے کر کام کرتا ہے
باعث ہونا ۔	ترغیب دینا ۔ میلا کرنا ۔ دعوت دینا
باؤ بتاس ۔	آسیب ۔ سایہ ۔
بپتا ۔	مصیبت ۔
بت کہاؤ ۔	بات چیت ۔
بتیانا ۔	باتیں کرنا ۔
بجھرا ۔	کوزہ آب خورہ
بدرہ ۔	تھیلی ۔ کیسہ ۔
برداری ۔	بار برداری
بستر ۔	لباس
بلّیاں لوں ۔	بلائیں لوں ۔ صدقے جاؤں ۔
بندھلانا ۔	پھسلانا
بندی ۔	آرائش کی چیز کمر یا سر میں ۔
بندی وان ۔	قیدی ۔
بہلیا ۔	(بہلیاں) خدمت گار تیر کمان کے ساتھ شکاری خدمت گار ۔
بہنا ۔	(جھونکا) ہوا کا چلنا ۔
بیرن ۔	بھائی ۔
بہری ۔	چندہ
بھبھوت بھسم ۔	راکھ ۔ خاکستر ۔

الفاظ	معنی
بھچپا	ایک قسم کی آتش بازی۔
بھگتیا۔	ناچنے والا۔ نچنیا۔
بھگنا۔	بھائی۔
بھونڈ پیری۔	منحوس قدم۔ سبز قدم۔
بھوی۔	کہار۔ حمال۔
بھیدو۔	بھیدی، رازدار۔
بھینٹ ملاقات۔	مڈبھیڑ۔
بے نوا۔	آزاد فقیر یا درویش۔
پاکھر۔	گھوڑے وغیرہ کی آہنی پوشاک (زرہ جیسی جنگ کے لئے)
پال۔	چھوٹا خیمہ۔
پانی دیوا۔	پانی دینے والا۔ وارث۔ بیٹا
پٹیلی۔	ایک چپٹے پیندے کی چھوٹی کشتی۔
پرداز۔	تصویر کے اطراف۔ آرائشی کام چوکھٹا وغیرہ۔
پرتل۔	سوار کا سامان جو ایک گھوڑے یا بیل پر لاد کر لے جا سکیں۔
پرچھا۔	صاف ہو جانا جیسے آسمان یا فضا کا بعد بارش یا تاریکی کا رفع ہونا۔ بھیڑ یا ہجوم کا چھٹ جانا۔
پُرپیچ۔	چال بازی۔
پکھرونا۔	سنہری ورق جس میں پان لپیٹ کر دیا جاتا ہے
پلشت۔	بدذات بیسوا وغیرہ۔
پلوار۔	سامان لے جانے کی کشتی۔

الفاظ	معنی
پن بھتا۔	اُبالے ہوئے چاولوں یا کھانے کو پانی میں بھگو کر رکھنا اور اس کا پانی پینا۔
پنڈا نہ چھوڑا۔	پیچھا نہ چھوڑا۔ اصرار کئے گیا۔
پنڈت خانہ۔	محبس۔ قید خانہ۔
پنڈھلانا۔	پھسلانا۔
پنسوی۔	ایک چھوٹی کشتی۔
پنگھولا۔	پنگوڑا۔
پوکھر۔	جوہڑ۔ تالاب۔
پھول۔	مردہ کا سوم
پیٹی۔	صندوقچہ
پیکھنا۔	پتلیوں کا تماشہ۔ نقل (دل لگی)
پھانکڑا۔	لچا۔ لفنگا۔
پھڑ۔	جوئے کھیلنے کی جگہ۔
پُھساہندا۔	گھناؤنا۔ بدبودار۔ نفرت انگیز۔
پھٹینیری۔	پیڑی۔
پھینپھنا۔	مروڑ کر پانی نکالنا (بھیگے ہوئے کپڑے سے)
ترپولیا۔	مکان یا دروازہ جس کے سامنے تین محرابیں ہوں مکان جس کے تین دروازے ہوں۔
تریا۔	عورت۔
تلپھنا۔	تڑپنا
تکش۔	ترکش
تکینی۔	چھوٹا تکیہ۔
تنکی۔	ایک قسم کی بہت پتلی خستہ روٹی (آٹا پانی لیکر تھوڑی سی شکر ملا کر پکاتے ہیں)

الفاظ	معنی
تورا:	سینی بھری کھانے کی شتابیں جو نذر دی جاتی ہیں شادی کے موقع پر۔
تہ پوش۔	عورت کا پائجامہ (ساری کے نیچے کا)
تھلکنا۔	دھڑکنا۔
تیہا۔	غصہ۔ غضب۔
ٹنڈیاں کسنا یا باندھنا۔	مشکیں کسنا۔
ٹنگیانا۔	ایڑ لگانا۔
ٹھڈی۔	بھنے اناج کا دانہ جو پورا کھلا نہ ہو۔
ٹھیپ۔	آگ کا ٹھیکرا وہ ٹھیکرا جس پر فقیر آگ رکھتے ہیں۔
ٹینٹی۔	کریل کا پھل۔
ثابت خانی۔	سپاہی۔ خدمت گار۔
جاہی۔	ایک قسم کی آتش بازی۔
جز بز ہونا۔	تنگ ہونا۔ جھنجھنا۔ کبیدہ خاطر ہونا۔
جس۔	شہرت نام۔
جوگنی۔	درگا (کالی) کی خادمہ ایک جادوگرنی چڑیل وغیرہ (جوگنی کو پیٹھ دے کر وہاں سے کوچ کیا یعنی کوئی سعد روز مقرر کر کے روانہ ہوا۔
جوڑا ہوڑا۔	تہ خانہ۔ الگ مکان۔
جوہی۔	ایک قسم کی آتش بازی۔
جھلا بور جھکیلا۔	زرق زالبھڑک مرصع۔
جھیجھڑ۔	پانی سے بھرے ہوئے گھڑوں کا ایک اُوپر تلا ہونا۔
چار قب۔	ایک قسم کا لباس قب صدری کا سا ایک لباس ہوتا ہے۔

الفاظ	معنی
چار گردے کے گھوڑے۔	بڑے دم خم کے گھوڑے۔
چاؤ چوز۔	چاؤ چوچلا ناز نعمت۔
چٹاپٹا۔	بچوں کا ایک کھلونا۔
چٹلا۔	چٹیا۔
چماق۔	عہدے کا نشان، لوہے کا لکڑی کا عصا۔ ڈنڈا
چملا۔	بھیک کا برتن یا پیالہ۔
چوجگی۔	نہایت قدیم (چار جگ والی) ہندؤں کے عقیدے میں دنیا کی عمر چار جگوں کی ہے۔ ہر جگ کئی لاکھ سال کا ہوتا ہے۔
چوگوشہ۔	مستطیل، سینی یا کشتی۔
چوگھرا۔	پان دان یا عطر وغیرہ رکھنے کا ڈبہ جس میں چار خانے ہوتے ہیں۔
چوڈول۔	ہوادار، تام جھام
چہچہا۔	شوخ رنگ۔
چھوٹ۔	چمک دمک۔
حاضری۔	ماحضر
حرامی۔	چور لٹیرا۔
خاص بردار۔	مسلح ملازم (بندوق بردار)
خورد خام کرنا۔	ٹکڑے ٹکڑے کرنا۔ چورا چورا کرنا۔
خوزادہ۔	شریف نوجوان (خواجہ زادہ)
دادا۔	کھلاڑی (مرد)
داؤدی۔	ایک قسم کی آتش بازی جو گل داؤدی کے پیڑ سے مشابہ ہوتی ہے۔

الفاظ	معنی
دبدھا ۔	کشمکش و پیچ پس و پیش ۔
درخرچی ۔	فضول خرچی
درودامن ۔ ۔	مرصع آنچل یا گوٹ
درماہا ۔	مشاہرہ ۔ تنخواہ ۔ ماہانہ
دِساکرنا ۔	سفر کرنا ۔ سفر پر روانہ ہونا (دسا ۔ سمت)
دستکی ۔	پاکٹ بک ۔ چھوٹی سی جیبی کتاب جو یادداشت وغیرہ لکھنے کے کام آتی ہے ۔
دل بادل ۔	بہت بڑا خیمہ ۔
دل چلانا	جرأت کرنا ۔
دلدا بیش گیر ۔	مسہری کے سامنے کا پردہ ۔
دلیاں ۔	بڑا ۔
دوجی سے ہونا ۔	حاملہ ہونا ۔
دوسار ۔	آر پار
دیوار گیری ۔	دیوار پر لگانے کا کپڑا ۔
دھاپ ۔	اتنا فاصلہ جو آدمی سانس لئے بغیر دوڑ سکے ۔
دھرا ۔	مندر ۔
دھراہر ۔	گودام ۔ مکان کمرہ ۔
دھولس دھڑکا ۔	رعب ۔ دباؤ ۔ دھمکی ۔
ڈربانا ۔	ڈوری یا باگ لگانا (گھوڑے کی)
ڈنڈا ۔	ڈنڈے بردار ملازم
ڈھلیت ۔	ڈھال باندھے ملازم ۔ سپاہی خدمت گار ۔
رخصتی ۔	رخصت کے وقت جو جہیز دی جائے ۔
رنڈی ۔	عورت ۔
روغن جوش ۔	ایک قسم کا گوشت کا سالن

الفاظ	معنی
رومالی ۔	سر پر اوڑھنے کا رومال ۔
رَوتا ۔	ڈیوڑھی کا ملازم ، مکان میں عورتوں کا ملازم
روہٹ ۔	رونق ۔ سرخ رنگت چہرے کی
ریکھا ۔	لکیر ۔ تحریر ۔
زاربذار ۔	زار زار ۔
زیرانداز ۔	حقے کے نیچے بچھانے کا کپڑا یا قالین ۔
سادھ کر ۔	درست کر کے ۔ ٹھیک کر کے ۔
سار ۔	سا مانند (جیسے تجھ سا)
ساق عروس ۔	ایک قسم کی مٹھائی ۔
ستارہ ۔	ایک قسم کی آتش بازی ۔
ستھوارہ ۔	ستورا ، میٹھا جو زچہ کو دیا جاتا ہے ۔
سراوہ ۔	سردار
سراچہ ۔	خیمہ (قنات دار)
سری پاؤ ۔	سراپا خلعت
سکھ پال ۔	ایک قسم کی پالکی ۔
سندیسا ۔	پیغام ۔
سنسنانا ۔	سنسنی پیدا کرنا ۔
سموچا ۔	پورا ۔
سیلی ۔	کمر کا ٹیکا
شاطر ۔	قاصد ۔ ہرکارہ ۔
شتا ۔	چرتر ۔ بلبوا ۔
شلاق ۔	کوڑے مارنا ۔
شلک ۔	بندوق وغیرہ کا داغنا ۔
سنگھاسن ۔	تخت شاہی ۔

الفاظ	معنی
شلیتا ۔	تھیلا ۔
صبح خیزا ۔	چور اچکا جو صبح سویرے لوگوں [illegible] سے پہلے چوری چکاری کرتا ہے ۔
صافی نامہ ۔	صداقت نامہ ۔ تصدیق ۔ صفائی نامہ ۔
طلب ۔	تنخواہ ۔
عہدہ ۔	عہدے کا نشان جیسے عصا وغیرہ ۔
غٹ ۔	ہجوم ۔
غضبی ۔	غضب ۔ ظالم ۔
غیبانی ۔	بد ذات ۔ بے حیا عورت ۔
قربان ۔	کمان کا خانہ ۔
قلماقنی ۔	ہتھیار بند عورت اردا بیگنی
قورچی ۔	افسر توشہ خانہ یا سلاح خانہ ۔
کاوے دینا ۔	گھوڑے کو پھرانا ، شہسواری کے کرتب دکھانا
کاہلا ۔	بیمار ۔ علیل ۔
کائنات ۔	موجودات ۔ مال جتھا ۔
کرچھال ۔	چوکڑی ۔
کرسی نشین ہونا ۔	موافق ہونا ، ٹھیک بیٹھنا ۔ درست ہونا ۔
کریال ۔	پرندوں کا بے فکری سے پروں کو چونچ سے سنوارنا
کریال میں غلیلا لگا ۔	عیش میں خلل پڑنا ۔ مصیبت پڑنا
کلجھواں ۔	کلوں سا ۔ سانولا ۔
کُنڈلا ۔	خیمے کی ایک قسم ۔
کفنی ۔	درویشی لباس جو کفن سے مشابہ ہوتا ہے ۔
کوٹ باندھ کر بیٹھنا ۔	پوتھی مار کر بیٹھنا ۔ آرام سے بیٹھنا ۔

الفاظ	معنی
کوکو پلاؤ ۔	انڈے کا پلاؤ ۔ کوکو : ملا ہوا انڈا ۔
کیفی ۔	مست ۔ نشے میں ۔
کینچلی ڈالنا ۔	کینچلی بدلنا ۔
کھپرا ۔	تیر ۔
کھلوری ۔	گلوری ۔
گاڑھی چوکی ۔	سخت چوکی یا پہرا ۔
گج موتی ۔	بیش قیمت موتی ۔ کہتے ہیں یہ موتی ہاتھی کی مستک میں سے نکلتا ہے اسی لئے اسے گج کہتے ہیں ۔
گرگا ۔	ادنی خدمت گار ۔ ادنی کام کرنے والا ۔ ذلیل آدمی ۔
گرہست ۔	گھرباری ۔ گھربار والا ۔
گزری ۔	سرراہ کی دکان ، سڑک پر چیزیں لے کر بیچنے کے لئے بیٹھنا ۔
گمت ۔	سنگت ۔
گوش پیچ ۔	دستار کا طرہ یا دستار میں آرائش کی کوئی چیز
گھرسینا ۔	گھر میں گھسے رہنا ۔
گھموری ۔	سخت گیری ۔
لتا ۔	کپڑا ۔ چیتھڑا ۔
لترا ۔	چغلخور ۔
لچکا ۔	سیر و تفریح کی کشتی ۔
لنبوت ۔	لمبی کشتی ۔
لنگ ۔	طرف ۔ ضلع ۔
لنگری ۔	پرات آٹا گوندھنے کی ۔
مان مہت ۔	عزت و احترام ۔

الفاظ	معنی
مٹیا۔	حمال
مجرائی۔	مصاحب۔ مجرا کرنے والا۔
مزیدکرد۔	(دسترخوان) بڑھاؤ۔
مشتقاب۔	قاب
ملاگیر کا۔	صندل کے رنگ کا۔
محلّی۔	زنانے مکان کا ملازم۔ خواجہ سرا
مرجھانا۔	غش آنا
مرگ چھالا۔	ہرن کی کھال
مروارید۔	ایک قسم کی آتش بازی۔
مغرّق۔	سونے چاندی سے لپا ہوا۔ مرصع
مقرّر۔	ضرور
ملغوبہ۔	ایکقسم کا کھانا ماش وہی ملاکر بناتے ہیں
ملین۔	غمگین۔ ملول۔
منتری۔	وزیر
منت دار۔	احسان مند۔ ممنون۔
منگل کوٹی۔	ایکقسم کا قالین جو منگل کوٹ میں بنتا تھا
مورپنکھی۔	سیر و تفریح کی کشتی جس کے سامنے مور کی شکل بنی ہوتی ہے۔
مینا۔	پیالہ رکابی (خاص کر فقیروں کی)
میوڑا۔	ملازم (میو کی تصغیر)
نانِ نعمت۔	ایک قسم کی نفیس روٹی۔
نپٹ۔	نہایت۔ سراسر۔ بالکل
نجھانا۔	غور سے دیکھنا۔
نخرے تلے۔	ناز نخرے۔

الفاظ	معنی
ندان۔	آخرکار
نسقچی۔	فوجی افسر۔ ادنیٰ افسر۔
نعل بندی۔	خراج۔
نکٹ۔	نزدیک۔
نک سکھ سے درست۔	ناک نقشہ اچھا۔ اچھی صورت کی
نمگیرا۔	اوس سے بچنے کے لئے شامیانہ سائبان
ننگیانا۔	لوٹ کھسوٹ کر ننگا کر دینا زبردستی سب کچھ رکھوا لینا۔
نول۔	کرایہ۔
نہڑنا۔	جھکنا
نیڑے۔	نزدیک۔ زیرسایہ۔
نیگ لگنا۔	ٹھکانے لگنا۔ بار آور ہونا۔
ہتھ پھول۔	(دستی پھول) ایک قسم کی آتش بازی
ہرنا۔	زین کا اٹھا ہوا اگلا حصہ
ہڑبڑانا۔	گھبرانا پریشان ہونا۔
ہزاری بزاری۔	خاص و عام۔ ادنیٰ و اعلیٰ۔ وضیع شریف (لفظی معنی بجوئی بازاری)
ہل ہلانا۔	ہڑبڑانا۔
ہوا بہنا۔	ہوا چلنا۔
ہیاؤ۔	بیاؤ۔ ہمت جرأت۔
یتیم۔	غلام، نوکر چاکر۔
یساول۔	چوب دار

PREFACE TO THE FIRST EDITION, 1846

The *Bagh O Bahar* is universally allowed to be the best work that has been yet composed in the Hindustani Language. For nearly half a century it has maintained its pre-eminence as a text-book for the examination of the Company's junior servants respecting their knowledge of the most useful and essential of the dialects spoken in British India.

Of late years, the Honourable Court of Directors, well aware how inefficiently their various employees in India must perform their duties without a knowledge of the language of the people, sent positive instructions to the Local Governments in that country, to the effect that all their junior officers, military and medical, must hence forth pass an Examination in Hindustani. The following is the latest of the General Orders on this subject, in which we see the *Bagh O Bahar* (or "Garden and Spring") is, as Mir Amman would say, "still fresh and flourishing."

TEST IN HINDUSTANI EXAMINATIONS

Fort William,
May 31, 1844.

The following test having been fixed for the Hindustani examination of military officers prescribed in G. O. of 9th January 1837, the same is published in General Orders for the information of the army :

"Candidates shall be required to read and translate correctly the *Bagh O Bahar* and the *Baital Pachisi*, the former in the Persian and the latter in the Devanagari character; and further to make an intelligible and accurate written translation into Hindustani, of an English passage in an easy narative style ; this translation to be written in a legible hand in both the Persian and Devanagari characters.

"A colloquial knowledge of Hindustani being deemed an object of primary importance, the proficiency of a candidate will be tested on that point before the grant to him of a certificate of competency by the examiners."

With regard to Mir Amman, the author, or rather the Hindustani translator of the *Bagh O Bahar*, the reader will find his brief history, from his own pen, in the preface to the text, pp. 5 and 6. The nature of the work itself is concisely stated in the following notice, apparently by Dr. Gilchrist, prefixed to the first Calcutta edition, which I here subjoin, with a slight alteration in the spelling of the oriental words :

"This work has long been admired in the original Persian, under the name of the *Kissa i chahar darwesh*, or, "The Tale of the Four Dervises": it was composed in that beautiful tongue by *Amir Khusru**, for the purpose of entertaining his friend and religious instructor, *Nizam-ud din Auliya*, during a fit of sickness. '*Ata Husain Khan* originally translated it, under the name of *Nau tarzi Murassa*, but, as a specimen of this language. It was rendered objectionable by his retaining too much of the phraseology and idiom of the Persian and Arabic. **

"To obviate this, the present version, from the translation now mentioned, has been executed by *Mir Amman of Dilhi*, one of the learned Natives attached to the College; and the Hindustani Scholar will quickly perceive how happily he has succeeded in attaining a plain and perspicuous style, at the same time preserving the idiom of the *Rekhta* in such purity, as fully to evince his intimate acquaintance with the language.

"The tale itself contains a pleasing description of the manners and customs of Asia; and the classical purity in which it now appears, and which gives it in a great degree the air of an original composition, takes it a valuable addition to the works lately published in the popular language of India."

It remains for me to say a few words respecting the present edition. The text is taken from the edition of 1803, printed at Calcutta, collated at the same time with two manuscripts, one in my own possession, which belonged to the late Dr. Gilchrist, and in all probability the very copy of the work which Mir Amman himself wrote, and presented to the learned Doctor for approbation. The other was a copy belonging to Mr. Romer, of the Honourable Company's Civil Service, who was a pupil

---

*Amir Khusru, though a native of Hindustan, deservedly ranks among the very highest of the Persian poets. He seems to have taken the great Nizami for his model: and it would be difficult to decide between the merits of the master and follower. Husain Va'iz, in the twelfth book of the Anvari Suhaili, pays both poets an equal and elegant compliment, by an allusion to a work of each as masterpieces of eloquence Amir Khusru died at Dihli, A. D. 1325. Respecting the origin of the Kissa i Chahar Darwesh, the original of the Bagh O Bahar vide Mir Amman's Preface, pp. 4 and 5.

**The Editor has recently met with a copy of the 'Nau tarz i Murassa' beautifully lithographed, but without any date or name of place. All he can say of it is, that it came from India, and that the work is evidently intended for circulati on among the learned Natives. The style of it is really elegant—in fact, too much so to be deemed useful. It bears to the common Hindustani the same relation that the language of the *Humayun-Nama* does to the Turkish—the perusal of either work being a hopeless task to those who do not possess a thorough knowledge of Persian.

of Mir Amman, written partly by and partly under the superintendence of the author. I have, in several instances, followed the reading of the manuscripts in preference to the printed text.

I have throughout given the essential short vowels, convinced that without them even the most careful learner will be apt to commit mistakes in pronunciation. I have also inserted a rigid system of punctuation, the same as I should have done in the editing of Latin Classic. It is true, the Culcutta editions have a sort of punctuation, but utterly useless ; for very frequently we find a full stop in the middle of a sentence, and as often several sentences run together without any stop at all. In this department I have made the most sweeping alterations, which, I flatter myself, are for the better. There may be a few old-fashioned individuals who will ask,—What is the use of punctuation, when the Natives use none in their manuscripts ? I answer, The use is, simply to facilitate, for beginners, the acquisition of a knowledge of the language. When that is once attained, they will find no difficulty in reading native works, though utterly void, not only of punctuation, but of vowel points, and all other diacritical marks. The *Bagh O Bahar* will furnish an ample field for exercising the talents of the student, even when thus cleared of a very unnecessary and highly preposterous difficulty.

A Vocabulary of the words occuring in the work is appended to the present edition. It would be very presumptuous in me to say that a few words may not be still deficient ; but, from the labour which I have bestowed on it, I am led to hope that their number is very small.

It may be mentioned, in conclusion, that the Honourable East-India Company have liberally defrayed all the expenses attending the editing of this work. As the object of these enlightened Rulers is not pecuniary gain, the book is offered to the Public at cost price. This will prove an in valuable boon to the majority of those preparing themselves for holding military and medical situations in India, as the very heavy expense of books (some Ten or Twelve Pounds) has hitherto acted as a severe clog on the study of the language, in this country—*mais nous avons change tout cela*. It is now within the power and means of every one who expects an appointment to India, in any capacity, to qualify himself in time for the efficient discharge of his duties, by procuring and thoroughly studying the best and cheapest book in the hindustani language the book in which he must ultimately pass his examination—the *Bgah O Bahar*.

FOURTH EDITION. LONDON. 1860

In this Forth Edition I have carefully collated the text throughout with a very fair manuscript of the work belonging to the Royal Asiatic Society. The punctuation has been rigidly revised and examined ; and in that department a few improvements have been made. All the deficiencies that could be discovered in the Vocabulary have been supplied ; and it is to be hoped that the work, as it now stands, will be found to have as few defects as can be expected in a performance of the kind.

I may mention that in Mir Amman's original text, and in all former editions of this work, there occurred a few passages of an objectionable nature, such as we meet with in all Oriental compositions. These I have either omitted, or expressed in a different way, in the present edition, at the request of Captain W. N. Lees, Director of Public Instruction, and Principal of the Calcutta University, whose kind, and to me most gratifying letter, to that effect, I here subjoin :

"*College of Fort William*
August 8, 1859.

My Dear Sir,

"The *Bagh O Bahar* having been selected as one of the text books for the Entrance Examination of the Calcutta University, has consequently been introduced into all Government College and Schools in which Oordoo is read."

"As it is desirable that all books read in Government Schools should be free from objectionable passages, I am induced to ask you, if you would be prepared, in future edition of your very elegant impression of this book, to omit all such passages as are likely to shock the modesty of an Examiner, or injure the morals of the Student.

"I cannot conclude these few lines without expressing my sense of the obligations under which you continue to place all Oriental Students by your earnest and valuable labours to place within their reach carefully edited and correctly printed text books, and good Grammers and Dictionaries.

Yours very truly
Signed W. N. LEES,
Director of Public Instruction, Bengal.

"To Professor Forbes,
LL. D."

آبداری abdari. f. THE BRILLIANCY (OF GEMS) · TEMPER

سیرت النبیؐ

بعد از

وصال النبیؐ

مؤلف

محمد عبد المجید صدیقی

قیمت مجلد ایکسو پینتیس روپے

اعجاز پبلشنگ ہاؤس

۲۰۶۰ - ناہر خاں اسٹریٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲